جہانِ رضا
قدس سرہ العزیز
مرتب
مرید احمد چشتی
رکن پاکستان سنی رائٹرز گلڈ
مرکزی مجلس رضا (رجسٹرڈ) لاہور

سلسلہ مطبوعات مرکزی مجلس رضا (۳۸)

جہانِ رضا

محمد مُرید احمد چشتی

مرکزی مجلس رضا۔ لاہور

سلسلۂ مطبوعات مرکزی مجلس رضا (۳۸)

کتاب ـــــــ جہانِ رضا
مرتب ـــــــ محمد مرید احمد چشتی
کتابت ـــــــ محمد یوسف قادری خوشنویس
پروف ریڈنگ ـــــــ محمد مرید احمد چشتی
ناشر ـــــــ مرکزی مجلس رضا۔ لاہور
مطبع ـــــــ کمپاٹن پرنٹرز بلال گنج لاہور
بارِ اوّل ـــــــ شوال ۱۴۰۱ھ
تعداد ـــــــ دو ہزار
ہدیہ ـــــــ دعائے خیر بحق معاونین مرکزی مجلس رضا، لاہور

ملنے کا پتا

مرکزی مجلس رضا (رجسٹرڈ) نوری مسجد بالمقابل ریلوے اسٹیشن لاہور

نوٹ

بیرونجات کے احباب دو روپے کے ڈاک ٹکٹ
بھیج کر طلب کریں

مندرجات

الکلمۃ الاولیٰ

از:۔ مرتب

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اُن نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے، جن کے متعلق حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت پیدا ہوئے جب برِّصغیر سے مسلمانوں کا اقبال رخصت ہو چکا تھا اور آخری مسلمان حکمران خاندان اپنی بساط لپیٹ چکا تھا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا دَور دورہ تھا۔ مسلمان مذہبی، سیاسی اور اقتصادی بحران میں مبتلا تھے۔ اس پر طُرّہ یہ کہ ایک جدید فرقہ توحید کا روپ دھار کر سامنے آگیا جس نے ذرا ذرا سی باتوں پر عامۃ المسلمین کی تکفیر شروع کر دی۔ اعلیٰ حضرت نے جب ہوش سنبھالا تو یہ دونوں عوامل، ایک مسلمانوں کی سیاسی و اقتصادی بدحالی اور دوسرا بھولے بھالے مسلمانوں کی تکفیر پوری شدت سے کار فرما تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان دونوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زندگی وقف کر دی۔ ایک طرف انہوں نے مسلمانوں کو متحدہ قومیّت کے خطرات سے آگاہ کر کے مسلم قومیّت کے راستے پر گامزن کیا اور دوسری طرف ذرا ذرا سی باتوں پر مسلمانوں کی تکفیر کرنے والوں کی خبر لی اور اُن کی اصلیّت کی اس طرح قلعی کھولی کہ وہ پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آگئے۔ اور عوام ان نام نہاد توحید پرستوں کی شاطرانہ چالوں سے باخبر اور محفوظ ہو گئے۔

الکلمۃ الاولیٰ

از:- مرتب

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شمار اُن نابغۂ روزگار ہستیوں میں ہوتا ہے، جن کے متعلق حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت پیدا ہوئے جب برِّصغیر سے مسلمانوں کا اقبال رخصت ہو چکا تھا اور آخری مسلمان حکمران خاندان اپنی بساط لپیٹ چکا تھا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا دَور دورہ تھا۔ مسلمان مذہبی، سیاسی اور اقتصادی بحران میں مبتلا تھے۔ اس پر طُرّہ یہ کہ ایک جدید فرقہ توحید کا روپ دھار کر سامنے آ گیا جس نے ذرا ذرا سی باتوں پر عامۃ المسلمین کی تکفیر شروع کر دی۔ اعلیٰ حضرت نے جب ہوش سنبھالا تو یہ دونوں عوامل، ایک مسلمانوں کی سیاسی و اقتصادی بدحالی اور دوسرا بھولے بھالے مسلمانوں کی تکفیر پوری شدت سے کار فرما تھے۔ اعلیٰ حضرت نے ان دونوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زندگی وقف کر دی۔ ایک طرف انہوں نے مسلمانوں کو متحدہ قومیّت کے خطرات سے آگاہ کر کے مسلم قومیّت کے راستے پر گامزن کیا اور دوسری طرف ذرا ذرا سی باتوں پر مسلمانوں کی تکفیر کرنے والوں کی خبر لی اور اُن کی اصلیّت کی اس طرح قلعی کھولی کہ وہ پوری طرح بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے۔ اور عوام ان نام نہاد توحید پرستوں کی شاطرانہ چالوں سے باخبر اور محفوظ ہو گئے۔

اعلیٰ حضرت بے پناہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ فقہ، تفسیر، حدیث، تاریخ، ریاضی، فلسفہ اور شاعری غرضیکہ ہر فن پر انھیں پورا پورا عبور حاصل تھا۔ اگرچہ ان کے ان کمالات پر بازار میں درجنوں کتابیں اور رسائل موجود ہیں۔ لیکن ان کے بلند پایہ کمالات کو دیکھتے ہوئے یہ سرمایہ کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ اس رجلِ عظیم کے عظیم کارناموں کو اُجاگر کرنے کے لیے اس فقیر نے چند سال سے پاکستان اور ہندوستان کے علماء اور شعراء سے رابطہ قائم کیا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں ان مشاہیر کی بے شمار تحریریں میرے پاس جمع ہوگئی تھیں۔ جن میں سے مشاہیر کے تاثرات کو "خیابانِ رضا"، مقالات کو "جہانِ رضا"، اور منظوم تحریروں کو "مناقبِ رضا"، کے نام سے مرتب کرکے قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ میں اُن تمام ادباء، علماء اور شعراء کا شکر گذار ہوں جنہوں نے میری استدعا پر اس کارِ خیر میں حصہ لیا اور اپنے تاثرات، خیالات اور جذبات کو تحریری جامہ پہنایا۔

میں جناب حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری صاحب سرپرست پاکستان سُنی رائٹرز گلڈ و صدر مرکزی مجلس رضا لاہور، جناب سید نور محمد قادری صاحب رُکن پاکستان سنی رائٹرز گلڈ، اور جناب علاّمہ محمد عبدالحکیم صاحب شرف قادری کا ممنون ہوں کہ انہوں نے ہر موقع اور ہر مرحلہ پر میری اعانت فرمائی۔

میں پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب مدظلہٗ کا خاص طور پر شکر گذار ہوں کہ انہوں نے "خیابانِ رضا" اور "جہانِ رضا" کے لیے قیمتی اور مفصل دیباچے تحریر فرمائے۔ زیرِ نظر حصے کا نام "جہانِ رضا" ہے جس میں تقریباً تمام نمایاں لکھنے والوں کی نگارشات موجود ہیں۔ مثلاً میاں عبدالرشید (کالم نگار نورِ بصیرت، نوائے وقت) سید الطاف علی بریلوی بی۔ اے (علیگ) پروفیسر جلیل قدوائی بی۔ اے (علیگ)، نظیر لدھیانوی، پروفیسر سید علی عباس جلال پوری ایم۔ اے، ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایم۔ اے، محمد ایوب صاحب مصنف "نوائے فردا" سابق سکرٹری وزارتِ مالیات (پاکستان)، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان ایم۔ اے،

پی - ایچ - ڈی، ڈی لٹ اور جناب شفیق بریلوی وغیرہ وغیرہ۔
"خیابانِ رضا" عظیم پبلی کیشنز، لاہور اور "مناقبِ رضا" کراچی سے شائع ہو رہی ہیں۔

محمد مرید احمد چشتی
۱ - ۱۲ - ۱۹۸۰ء
گورنمنٹ ہائی سکول پنڈ دادنخان (جہلم)

انتساب

میں ان اوراق کو اپنے والد مکرم جناب میاں بہاول بخش قادری صاحب مدظلہٗ کے نام نامی سے منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ وہ ماشاءاللہ عشقِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حبِّ صحابہ و اہلِ بیت و اولیائے کرام سے سرشار ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔ آمین

محمد مُرید احمد چشتی

تقدیم

ڈاکٹر محمد مسعود احمد ایم اے، پی ایچ ڈی

(۱)

فاضل بریلوی حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی قدس سرہٗ کے متعلق گزشتہ چھ سات برسوں میں اتنا کچھ شائع ہو گیا ہے کہ نصف صدی میں بھی نہ ہوا ہوگا۔ یہ ایک عجیب حسن اتفاق ہے! ——— یہ چودھویں صدی ختم ہو رہی ہے، پندرھویں صدی کے آغاز میں قانون الٰہی کے مطابق "مجدد" آتا ہے لیکن وقت آگیا اور "مجدد" نظر نہیں آتا ——— ایسے نازک دور میں فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے یہ اچانک "ذکر و اذکار" اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ان کی یادیں باندازِ نو "مجدد" بن کر ہماری رہنمائی کر رہی ہیں ———

حضرت فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے اذکار پر مشتمل یہ مجموعہ بعض خصوصیات کا حامل ہے، اس کے قلم کاروں میں وہ جہاں دیدہ علماء، صحافی اور سیاست داں بھی شامل ہیں جنہوں نے نصف صدی قبل کے حالات خود مشاہدہ کئے ——— سیف الاسلام مولانا منور حسین صاحب، جنہوں نے نو عمری و جوانی کے کئی ماہ و سال حضرت فاضل بریلوی کے قریب رہ کر گذارے ——— مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری، جنہوں نے حضرت فاضل بریلوی کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی اور ان کا الوداعی خطاب خود سماعت فرمایا ——— مولانا وحید احمد مسعود، جو اگرچہ حضرت فاضل بریلوی سے نہ مل سکے لیکن ان کے عہد مبارک میں ایک ذی ہوش طالب علم تھے ——— اور یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ان حضرات میں کوئی بھی مخالفین کی اصطلاح میں "بریلوی" نہیں بلکہ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری کو تو حضرت فاضل بریلوی سے سخت اختلاف رہا مگر اس کے باوجود اظہارِ حق میں انہوں نے تنگ دلی سے کام نہ

لیا ـــــ آفریں باد بریں ہمت مردانہ!

اس مجموعے میں حضرت فاضل بریلوی کے چشم دید حالات کے علاوہ ان کے بعض خلفاء اور معاصرین کے بھی چشم دید واقعات مل جاتے ہیں، مثلاً یہ حضرات:

(۱) حضرت شاہ علی حسین اشرفی
(۲) حضرت مولانا عبد الباری فرنگی محلی
(۳) حضرت مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی
(۴) حضرت مولانا سید احمد اشرف کچھوچھوی
(۵) حضرت مولانا محمد نعیم الدین مراد آبادی
(۶) حضرت مولانا امجد علی اعظمی
(۷) حضرت مولانا محمد ظفر الدین بہاری
(۸) حضرت مولانا عبد العلیم میرٹھی
(۹) حضرت مولانا ابوالحسنات محمد احمد الوری
(۱۰) حضرت مولانا حشمت علی خاں لکھنوی

(۲)

حضرت سیف الاسلام نے اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر حضرت فاضل بریلوی کی نشست و برخاست، طعام و کلام اور اتباع سنت کی کیفیات بیان کی ہیں ـــــ فاضل بریلوی کے متعلق احترام سادات کے قصے مشہور ہیں جس کو مولوی حسین احمد مدنی ریاکاری سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن حضرت سیف الاسلام ہم کو خلوتوں کا حال بتاتے ہیں جہاں ریاکاری کا شائبہ تک نہیں ـــــ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ فاضل بریلوی اور ان کے گھرانے والے بڑے غریب پرور، مہمان نواز تھے، ـــــ غریبوں اور بیواؤں سے کرایہ نہیں لیا کرتے تھے ـــــ
افسوس مخالفین کو فاضل بریلوی کی شوکت سلیمانی تو نظر آئی مگر خُلق ابراہیمی اور خُلق محمدی پر نظر نہ کی گئی جس کو حضرت سیف الاسلام بیان فرمار ہے ہیں۔

مولانا وحید احمد مسعود بدایونی نے فاضل بریلوی کے ملفوظات سے ان کے بعض اخلاقی اور علمی کمالات کو اجاگر کیا ہے ـــــ سنی سنائی باتوں کے بیان کرنے سے بہتر ہے کہ شخصیت کے محاسن و معائب خود اس کی تصانیف اور ملفوظات میں تلاش کئے جائیں۔ اس خصوص میں مولانا وحید مسعود کی کوشش لائق تحسین ہے۔ یہ انداز تحقیق مؤثر بھی ہے اور معقول بھی۔

(۳)

مخالفین کی طرف سے فاضل بریلوی پر متعدد الزامات لگائے جاتے ہیں، مثلاً:

ا۔ انہوں نے ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھی۔

ب۔ انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر کی۔

ج۔ انہوں نے بدعات کو عام کیا۔

د۔ وہ انگریز کے خیر خواہ اور وظیفہ یاب تھے۔

ھ۔ تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہ لیا۔

ا۔ پنجاب کے مشہور صحافی میاں عبدالرشید صاحب پہلے الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ دل لگتی بات فرماتے ہیں کہ فاضل بریلوی نے نہیں بلکہ مخالفین نے نت نئے فرقوں کو ایجاد کیا ـــــ اس طرح ایک اور آزاد خیال اور جہاں دیدہ صحافی جناب شوکت صدیقی نے لکھا ہے کہ "بریلوی" کوئی فرقہ نہیں، "عشق رسول" پر اختلاف کی وجہ سے مخالفین خود بخود الگ ہوگئے، وجہ اختلاف صرف "عشق رسول" ہے ـــــ

ب۔ ڈاکٹر سید نظیر حسنین زیدی دوسرے الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ فاضل بریلوی تکفیر مسلم میں بے حد محتاط تھے ـــــ حقیقت میں مخالفین نے ایک ہی قسم کے فتووں کو زیادہ نمایاں کرکے فاضل بریلوی کو بدنام کیا ہے حالانکہ فتاویٰ رضویہ میں ہزاروں لاکھوں دوسرے فتوے بھی ہیں، اور نہایت ہی محققانہ ـــــ ان سے ہر مفتی استفادہ کرتا ہے مگر نام نہیں لیتا۔ یہ ایسی احسان فراموشی ہے جس کا ظہور مخالفین کی طرف سے زیادہ ہوتا ہے۔

ج۔ تیسرے الزام کے بارے میں جناب شوکت صدیقی نے لکھا ہے کہ فاضل بریلوی کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو خود بخود اس الزام کی تردید ہو جاتی ہے، حقیقت حال سے واقفیت کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ـــــ مگر افسوس عوام تو عوام بعض خواص بھی غلط فہمیوں پر قانع نظر آتے ہیں اور یہ تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ

فاضل بریلوی کی تصانیف کا خود مطالعہ کریں لیکن رفتہ رفتہ یہ شدت ختم ہو رہی ہے۔

د۔ چوتھے الزام کے بارے میں فاضل جلیل مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری نے لکھا ہے کہ فاضل بریلوی نے "ترک موالات" کی مخالفت کی اس لیے مخالفین نے ان کے متعلق یہ مشہور کر دیا کہ نعوذ باللہ وہ سرکار برطانیہ کے وظیفہ یاب ہیں مگر اس الزام کی حقیقت سیاسی پروپیگنڈہ سے زیادہ کچھ نہیں ——— یہ بات اس لیے بھی وقیع معلوم ہوتی ہے کہ مولانا ئے ممدوح خود "ترک موالات" کے حامی اور فاضل بریلوی کے سخت خلاف تھے۔ گھر کا بھید گھر والے سے زیادہ کون جانتا ہے؟ ——— جناب شوکت صدیقی نے بھی اس الزام کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فاضل بریلوی نے انگریز کی حمایت میں کوئی فتویٰ نہیں دیا

مخالفین کا یہ صرف الزام ہے جو تحقیق سے ثابت نہ ہو سکا ——— مولانا سیف الاسلام لکھتے ہیں کہ فاضل بریلوی انگریز کی روش پر چلنے سے منع کرتے تھے، ان کے گھر کا ماحول خالص اسلامی تھا، جب کہ انگریز کے خیر خواہوں کے گھر کے ماحول بدل چکے تھے ——— انہوں نے لکھا ہے کہ فاضل بریلوی اسلام دشمن طاقتوں انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف تھے ——— اس دور میں جب کہ مخالفین کے علماء تک ہندوؤں کے دمساز تھے۔ فاضل بریلوی کے صاحبزادے مولانا حامد رضا خاں صاحب نے جب یہ سنا کہ ایک ہندو نے مسلمان کو زدوکوب کیا ہے تو وہ بندوق اٹھا کر چلنے لگے ——— اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اور ان کے گھر والے اسلام دشمن طاقتوں کے مخالف تھے، اور انگریزوں کے مقابلے میں ہندوؤں سے دوستی اور وداد و اتحاد کو اسلامی غیرت و حمیت کے منافی سمجھتے تھے ——— بقول میاں عبدالرشید قوم پرست مسلمانوں نے فاضل بریلوی پر یہ الزام لگایا جو سراسر جھوٹ ہے۔

ھ۔ پانچویں الزام کا جواب دیتے ہوئے جناب شوکت صدیقی لکھتے ہیں کہ ۱۹۲۱ء میں فاضل بریلوی کا انتقال ہو چکا تھا جب کہ تحریک پاکستان شروع بھی نہ ہوئی تھی۔ اس لیے تاریخی حیثیت سے یہ الزام غلط ہے ——— میاں عبدالرشید نے لکھا

ہے کہ جن خطوط پر تحریک پاکستان چلی وہ فاضل بریلوی کے افکار کے مرہون منت ہیں ـــــ ہندو مسلم اتحاد کی فضاؤں میں سب سے پہلے فاضل بریلوی نے "دو قومی نظریہ" کا نعرہ بلند کیا جس کا سب نے مذاق اڑایا، لیکن علامہ اقبال اور پھر قائد اعظم نے اس پر اپنے فکر کی بنیاد رکھی اور تحریک پاکستان کا آغاز کیا، اس مرحلے پر فاضل بریلوی کے خلفاء و تلامذہ اور فرزندان گرامی پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی حمایت میں ایک ہمہ گیر تحریک چلائی، جب کہ مخالفین کی غالب اکثریت ہندوؤں کے ساتھ رہی، اور جو حضرات آخر میں اس طرف آئے ان کی شرکت بھی جذبۂ مسابقت کے تحت معلوم ہوتی ہے، تاریخی حقائق و واقعات کے مطالعہ سے اس اندیشے کی تکذیب یا تصدیق ہو سکتی ہے۔

(۴)

فاضل بریلوی کا جذبۂ عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسی جانی پہچانی حقیقت ہے کہ جب اس کا ذکر آتا ہے فاضل بریلوی سامنے آ جاتے ہیں ـــــ میاں عبدالرشید نے یہ دل لگتی بات فرمائی ہے کہ فاضل بریلوی کے مخالفین کی اکثریت ہندوؤں کے ساتھ تھی اس لیے عشق رسول سے بے بہرہ تھی ـــــ غیر کی صحبت عشق محبوب میں اضمحلال پیدا کر دیتی ہے، یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے اس لیے میاں صاحب کا یہ ارشاد غلط نہیں۔ اس کا بخوبی اندازہ فاضل بریلوی اور مخالفین کے نعتیہ کلام کے موازنہ سے ہو سکتا ہے ـــــ سکریٹری وزارت خزانہ جناب محمد ایوب صاحب نے بھی بڑے مؤثر انداز میں فاضل بریلوی کے عشق رسول پر اپنے جاندار تاثرات کا اظہار فرمایا ہے ـــــ صاحبزادہ سید محمد فاروق القادری نے یہ خوب لکھا ہے کہ فاضل بریلوی کو برصغیر میں "عاشق رسول" سمجھا جاتا ہے۔ یعنی یہ جمہور کا فیصلہ ہے ـــــ دعویٰ تو اوروں کو بھی ہے مگر ان کو "عاشق" نہیں سمجھا جاتا ـــــ سید صاحب موصوف کے خیال میں فاضل بریلوی کا اصل کمال

یہ ہے کہ انہوں نے مایوس کن حالات میں عشق رسول کی بنیادیں استوار کیں جب کہ ہندی سیاست نے فکر و شعور کے پردہ دل سے محبت رسول کے نقوش مٹا دیے تھے ـــــ یہ بڑا نازک وقت تھا ـــــ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی فاضل بریلوی کے عشق کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبتِ اہل بیت سیکھنی ہو تو ان سے سیکھے ـــــ مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری اور ملک کے مشہور شاعر سید شان الحق حقی نے بھی فاضل بریلوی کے عشق رسول کا اعتراف کیا ہے ـــــ اور جناب مظفر عزیز صاحب نے اس عشق کی اثر انگیزی دکھلاتے ہوئے لکھا ہے کہ جب انہوں نے فاضل بریلوی کا یہ شعر پڑھا ؎

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

تو اچانک جذبات امنڈنے لگے اور ان کے پردۂ تخیل پر ۲۸ اشعار پر مشتمل ایک "سلام" کا نزول ہوا ـــــ یہ کلام رضا کی عشق انگیزیوں کا عالم ہے ـــــ ! سچ ہے چراغ سے چراغ جلتے ہیں ۔

(۵)

اسی عشق رسول نے فاضل بریلوی کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے ـــــ انہوں نے "تنگ نائے غزل" کو وہ وسعت دی کہ مجاز کو حقیقت سے جا ملایا ـــــ جناب نظیر لدھیانوی نے فاضل بریلوی کے کمالات شاعری کو بڑے موثر انداز سے قلم بند کیا ہے ، اس سے قبل اس موضوع پر ایسا موثر مقالہ نظر سے نہیں گزرا ـــــ پختہ کار شاعر کو سمجھنے کے لیے ایسے ہی کہنہ مشق اور پختہ کار شاعر کی ضرورت تھی ـــــ

جناب نظیر لدھیانوی نے فاضل بریلوی کے کلام کے بہت سے محاسن کا ذکر کیا ہے ۔ مثلاً ندرت تشبیہات و استعارات ، حسن انتخاب ، حسن اظہار ، مشکل پسندی ، سادگی و پُرکاری ، جوش و موسیقیت ، رعنائی خیال ، بلندئ فکر ، شریعت و شاعری

کا حسین امتزاج، جذبے کی پختگی، فکر کی صناعی، ایجاز و اختصار، ندرت فکر و خیال، روزمرہ و محاورات، لطافت زبان و بیان، بلاغت مضامین وغیرہ وغیرہ۔

کلام رضا پر جناب سید شان الحق حقی کے یہ ریمارکس قابل توجہ ہیں :۔

ا۔ بہترین ادبی تخلیقات وہی ہیں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے روحانی سرور اور اخلاقی بصیرت کا ذریعہ ہوں۔

ب۔ (کلام رضا) کی مقبولیت و دل پذیری ہی اس کا سب سے بڑا ادبی کمال اور مولانا کی شاعرانہ مرتبے پر دال ہے ؎

حسن تاثیر کو صورت سے نہ معنی سے غرض
شعر وہ ہے کہ لگے جھوم کے گانے کوئی شخص

مگر کلام رضا میں حسن صورت بھی ہے، حسن معنی بھی ہے اور حسن تاثیر بھی ——— ان تینوں کا یک جا ہو جانا شاعر کے جمال قلب و نظر کا اعجاز ہے۔

(۶)

المختصر پیش نظر مجموعے میں مشمولہ تاثرات و مقالات سے فاضل بریلوی کے ذاتی حالات، سیاسی خیالات، عاشقانہ جذبات اور شاعرانہ کمالات کے بارے میں بہت سی مستند اور اہم باتیں مل جاتی ہیں ——— اور ایک اہم بات وہ ہے جس کے عینی گواہ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواری ہیں ——— بریلی کی مسجد میں فاضل بریلوی اپنی زندگی کا غالباً آخری جمعہ ادا فرما رہے ہیں، نماز کے بعد لوگوں کو بیعت کر رہے ہیں اور بیعت کے بعد مجلس سے مخاطب ہو کر یہ درد بھرے کلمات ارشاد فرما رہے ہیں :۔

"میری طرف سے تمام اہلسنت مسلمانوں کو سلام پہنچا دو، اور میں نے کسی کا کوئی قصور کیا ہو تو میں اس سے بڑی عاجزی سے اس کی معافی مانگتا ہوں ——— مجھے خدا کے لیے معاف کر دو یا مجھ سے کوئی بدلہ لے لو!"

اللہ اللہ جس پیکر قدسی میں اس درجہ عاجزی و انکساری اور خشیت الٰہی ہو وہ اپنے

نفس کی خاطر کبھی کسی کی مخالفت کر ہی نہیں سکتا ــــــــ جس کسی سے اس کی مخالفت تھی محض اللہ اور رسول کے لیے ــــــــ مخالفین کو اس دردمندانہ خطاب کی روشنی میں فاضل بریلوی کی اخلاص مندانہ تنقیدات اور بے داغ کردار کا جائزہ لینا چاہیے ــــــــ اُمید ہے کہ بزرگ و محترم قلمکاروں کی یہ نگارشات قارئین کرام کے دل دماغ سے بعض دیرینہ غلط فہمیوں کو دور کر کے مصفّیٰ و مجلّیٰ کر دیں گی ؎

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو
وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

مولیٰ تعالیٰ فاضل جواں مولانا محمد مرید احمد چشتی سیالوی زید مجدہٗ کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے نہ معلوم کتنی کوشش و جانفشانی کے بعد یہ مستند اور دل پذیر علمی، تاریخی، ادبی اور سوانحی ذخیرہ ہمارے لیے مہیا فرمایا۔ یہ ایک ایسا احسان ہے جس کی جزا مولیٰ تعالیٰ ہی ان کو عطا فرما سکتا ہے۔ خدا کرے ان کی کوششیں بار آور ہوں، وہ دین و دنیا میں پھلیں پھولیں اور دوسرے جوان بھی ان کے نقش قدم پر چل کر اپنے اسلاف کا نام روشن کریں۔ آمین ثم آمین!

حسّان الہند مولانا احمد رضا خان

کے نعتیہ کلام کا مطالعہ

از اصغر حسین خان نظیرؔ لودھیانوی

پڑھا ہم نے کلام احمد رضا کا — یہ آئینہ ہے شانِ مصطفےٰ کا
کیا آیاتِ قرآنی سے واضح — جو رُتبہ ہے حبیبِ کبریا کا
اضافہ بے بہا ہے یہ ادب میں — حسیں مجموعہ ہے نعت و ثنا کا
بیاں رنگیں، زباں پُرکیف و شیریں — نشیمن ہے بہارِ جاں فزا کا
نہیں مجموعۂ نعت و غزل یہ — چمن ہے نکہت و رنگ و ضیا کا
کوئی مصرع نہیں صنعت سے خالی — سخن کس کا ہے اس حسن ادا کا

وہ ہیں بحر العلوم دین و دُنیا
نہیں ثانی نظیرؔ احمد رضا کا

بلبلِ بستانِ حجاز حسان الہند، طوطیٔ شکرستانِ نعت سرمستِ عشقِ رسول حضرت احمد رضا خان بریلوی قدس سرہٗ برصغیر کے بہت بڑے عالم دین، محدّث، مفسّرِ قرآن، فقیہ، نکتہ دان، بلند پایہ خطیب، مفکر اور بحر العلوم ہونے کے علاوہ ایک شیریں نوا شاعر بھی تھے۔ میں فی الحال صرف ان کے نعتیہ کلام پر ہی اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں، جو اُن کے دیوان حدائقِ بخشش کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ان کی تصانیف کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ فتاویٰ رضویہ کی بارہ ۱۲ جلدیں ہیں۔ جن میں سے ۵ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ہر جلد ایک ایک ہزار صفحات کو محیط ہے۔ علامہ اقبال نے انہیں امام ابو حنیفہ

ثانی اور نابغۂ روزگار قرار دیا۔ نیاز فتح پوری نے ان کے تبحرِ علمی اور ان کے عربی قصائد اور اُردو نعتوں کو بے حد سراہا۔ رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی مرحوم نے ان سے اظہارِ عقیدت کیا۔ مولانا احمد رضا عاشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے۔ اسی لیے ان کی نعتیں محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چھلکتے جام ہیں۔ مولانا عالم باعمل تھے۔ ساری زندگی اسلام کی تبلیغ اور قرآن مجید کے حقائق و معارف بیان کرنے میں گذار دی۔ ان کا ترجمۂ قرآن مجید اُردو کے دیگر ترجموں میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے بریلی میں علم دین کی ایک درس گاہ منظر اسلام کے نام سے قائم کی جس میں برصغیر کے مختلف صوبوں کے طلبہ کے علاوہ افغانستان کے طلبہ بھی تعلیم پاتے تھے۔ دینی کتابوں کا حصول اور قیام و طعام کا انتظام درس گاہ کے ذمے ہے جس کی کوئی فیس نہیں لی جاتی۔ طلبہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ملک میں تبلیغِ اسلام کی خدمت ادا کرتے ہیں۔ مولانا سلسلۂ قادریہ سے منسلک تھے۔ لاکھوں مرید ہیں۔ مولانا نے ایک دارالافتا قائم کیا تھا روزانہ بیسیوں سائل بذریعہ خط و کتابت اس دارالافتا سے فتاویٰ حاصل کرتے تھے۔ مولانا کے ترجمۂ قرآن کا انگریزی ترجمہ بھی کیا جا رہا ہے۔

مولانا کی پیدائش

مولانا کے اسلاف عہدِ مغلیہ میں قندھار سے وارد ہند ہوئے تھے۔ مغل شہنشاہوں کے دربار میں مناصبِ جلیلہ پر ممتاز رہے اور جاگیریں حاصل کیں۔ لیکن ان کے دادا حضرت مولانا شاہ رضا علی خان رحمت اللہ علیہ کو جو اپنے وقت کے بے مثل عالم اور ولی کامل تھے، سرکاری عہدوں سے کوئی لگاؤ نہ رہا۔ انہوں نے خدمتِ دین اور عبادت و ریاضت کا شغل اختیار کیا۔ اعلیٰحضرت کے والد مولانا شاہ نقی علی خاں بھی اپنے دور کے بلند مرتبہ عالم اور صاحب کرامت تھے۔ انہیں جملہ علوم و فنون میں کمال حاصل تھا۔ مولانا احمد رضا خان ۱۴ رجون ۱۸۵۶ء کو بریلی میں عالم وجود میں آئے۔ پیدائشی نام محمد اور تاریخی نام المختار رہا۔ دادا نے احمد رضا خاں نام رکھا۔ مولانا نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید ناظرہ ختم کر لیا۔ ابتدائی تعلیم مرزا غلام قادر بیگ، مولانا ابوالحسین نوری مارہروی اور

مولانا عبدالعلی رامپوری اور اپنے والدِ محترم سے حاصل کر کے چودہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے اور والدِ مرحوم نے انہیں فتویٰ نویسی کی خدمت پر مامور کر دیا۔ بڑے ہوئے تو ایک ماہ کی قلیل مدت میں قرآنِ حکیم حفظ کر کے حیرت ناک قوتِ حافظہ کا ثبوت پیش کیا۔ دو مرتبہ حج کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ برصغیر میں ہر دور میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں ہوئیں۔ مسلمانوں کے عقائد اور اخلاق بگاڑنے اور دینی روایات اور اقدار کو ختم کرنے کی کوششیں ہوئیں۔ مولانا نے ہر زمانے میں دشمنانِ دین کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور ہر باطل فرقے کی بیخ کنی کے لیے میدانِ عمل میں کود پڑے۔
ماہ صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں وفات پائی۔

شاعری

مولانا احمد رضا خان قدس سرہٗ ایک متبحر عالمِ دین اور ہمہ گیر مصنف ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ وہ محض نعت گو ہی نہ تھے بلکہ انہیں شاعری میں بہت بلند مقام حاصل تھا۔ اُن کا سلام اور معراج سے متعلق نظم اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ وہ ہر قسم کے واقعات۔ مناظر۔ اور واردات شعر میں نہایت خوش اسلوبی سے بیان کر سکتے تھے۔ انہیں زبان اور بیان پر بلا کی قدرت حاصل تھی۔ لیکن سب خوبیوں کے باوجود انہیں اپنے شاعر ہونے کا اعتراف نہیں اور انہیں اپنی شاعری پر فخر نہیں۔ انہوں نے اس بارے میں ایک قطعہ کہا ہے جس میں فرمایا ہے ؎

رہا نہ شوق کبھی مجھ کو سیرِ دیواں سے — ہمیشہ صحبتِ اربابِ شعر سے ہوں نفور
نہ اپنے کاموں سے تضییعِ وقت کی فرصت — نہ اپنی وضع کے قابل کہ اس میں ہوں مشہور
ہوئی وبال سے اسکے مجھے سبک دوشی — کہ ویسے ہی ہے گراں سر پہ بارِ جرم و قصور
جبینِ طبع ہے ناسودہ داغِ شاگردی — غبارِ منتِ اصلاح سے ہے دامن دور

مگر جو ہاتفِ غیبی مجھے بتاتا ہے
زباں تک اسے لاتا ہوں میں بمدحِ حضور

مرزا غالب نے بھی مستِ پیالہ و سبو ہونے کے باوجود کہا تھا ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں — غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

لیکن مولانا کی "نوائے سروش" بمدح حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ فرماتے ہیں ؎

خدا تیرا خدا ہے تو خدا کا پاک بندہ ہے ۔۔۔ خدا تو تو نہیں نورِ خدا ظلِّ خدا تو ہے
تری تعریف میں جتنا بڑھیں سب تجھ کو شایاں ہے ۔۔۔ فقط اک نارو ایہ ہے کہ یوں کہئے خدا تو ہے

یعنی وہی بات "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر"۔
مولانا کو شاعری پر فخر نہیں حضور کی مدح سرائی پر فخر ہے۔ شاعری سے مقصد محض حضور سے اظہارِ عقیدت ومحبت ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ گلشن مری خوشبوئے دہن سے مہکے ۔۔۔ باغِ عالم میں ہیں بلبل ہوں ثنا خواں کس کا
رضائے خستہ کیا کہنا عجب جادو بیانی ہے ۔۔۔ نمک ہر نغمۂ شیریں میں ہے شورِ عنادل کا

شعر میں لطف یہ ہے کہ نغمۂ شیریں بھی ہے اور اس میں نمک بھی ہے اور وہ عنادل کے شور کا۔ شور نمک کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے شعر میں صنعتِ ایہام بھی ہے اور صنعتِ مراعات النظیر بھی۔ مولانا کے اکثر اشعار میں دو دو تین تین صنعتیں ہیں۔ پھر فرماتے ہیں ؎

گونج گونج اٹھے ہیں نغماتِ رضا سے بوستاں ۔۔۔ کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وا منقار ہے

یہی کہتی ہے بلبلِ باغِ جناں کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں ۔۔۔ نہیں ہند میں واصفِ شاہِ ہدیٰ مجھے شوخیٔ طبع رضا کی قسم

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مسلم ۔۔۔ جس سمت آ گئے ہو سکے بٹھا دیئے ہیں

ہے بلبلِ رنگیں رضا یا طوطیٔ نغمہ سرا ۔۔۔ حق یہ کہ واصف ہے ترا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

کلکِ رضا ہے خنجرِ خونخوار برق بار ۔۔۔ اعدا سے کہہ دو خیر منائیں نہ شر کریں

کروں مدحِ اہلِ دول رضا پڑے اس بلا میں مری بلا ۔۔۔ میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

نان پارہ ہندوستان میں ایک ریاست تھی۔ کسی شخص نے حضرت سے کہا کہ
یس نان پارہ کی مدح میں قصیدہ کہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت نے نعت کہی۔
س کا یہ مقطع ہے۔ شعر میں ریاست کے نام کو کس شاعرانہ خوبی سے لائے ہیں۔

ھر فرمایا ؎

تجھ سے کب ممکن ہے پھر مدحت رسول اللہ کی
ے رضا خود صاحبِ قرآں ہے مدّاحِ حضور

نعت گوئی

اشعار بالا سے یہ ثابت ہوگیا کہ مولانا کی شاعری کا مقصد صرف نعت گوئی ہے۔ اب ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ نعت گوئی میں مولانا کا مرتبہ کیا ہے اور انکی حت کا معیار کیا ہے۔ انہوں نے ایک رباعی میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ایک مجاہد مولانا کفایت علی کافی کو نعت گوئی میں سلطان (بادشاہ) اور خود کو وزیر اعظم کہا ہے۔ وہ رباعی یہ ہے ؎

مہکا ہے مری بوئے دہن سے عالم
یاں نغمۂ شیریں نہیں تلخی سے بہم
کافی سلطانِ نعت گویاں ہے رضا
ان شاء اللہ میں وزیر اعظم

مولانا کا یہ قول ہے ؎

جبینِ طبع ہے ناسودہ داغِ شاگردی
غبارِ منّتِ اصلاح سے ہے دامن دور

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے شعر میں کبھی کسی سے اصلاح نہیں لی۔ کافی بزرگ نعت گو تھے۔ اس لیے آپ نے خود کو ان سے کمتر درجے پہ رکھا ہے۔ کافی کا نمونۂ کلام یہ ہے ؎

دیکھتے جلوۂ دیدار کو آتے جاتے
گلِ نظارہ کو آنکھوں سے لگاتے جاتے
پائے اقدس سے اٹھاتے نہ کبھی آنکھوں کو
رد کرنے والے اگر لاکھ ہٹاتے جاتے
دستِ صیاد سے چھٹتے تو ہزاروں کی طرح
یہ چمن کوچۂ دلدار سجاتے جاتے
دشتِ طیبہ میں ترے ناقے کے پیچھے پیچھے
دھجیاں جیب و گریباں کی اڑاتے جاتے
قدمِ پاک کی گر خاک ہی ہاتھ آ جاتی
بختِ خوابیدہ کو ٹھوکر سے جگاتے جاتے
کافیؔ کشتۂ دیدار کو زندہ کرتے
لبِ اعجاز اگر آپ ہلاتے جاتے

کافی کا نعت گوئی کا انداز سادہ ہے۔ نہ تخیل کی رفعت ہے نہ بیان میں ندرت ہے۔ اور مولانا رضاؔ کے کلام میں زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ تخیل بہت بلند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نعت گوئی میں مولانا کا کوئی استاد نہیں ہے۔ انھوں نے کافی کی تعریف اپنا پیش رو ہونے کی وجہ سے کئی جگہ کی ہے۔ مولانا نے نعت گوئی قرآن مجید سے سیکھی ہے۔ جیسا کہ ایک رباعی میں کہا ہے ؎

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ — بے جا سے ہے المنت للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی — یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

پھر ایک فارسی رباعی میں کہا ؎

نہ مرا نوش زتحسیں نہ مرا نیش زطعن — نہ مرا گوش بہ مدحے نہ مرا ہوش ذمے
منم و کنج خمولے کہ نگنجد در وے — جز من و چند کتابے و دوات و قلمے

لیکن اس کے باوجود ایک اور رباعی میں کہا ؎

محصور جہاں، دانی و عالی میں ہے — کیا شبہ رضاؔ کی بے مثالی میں ہے
ہر شخص کو اک وصف میں ہوتا ہے کمال — بندے کو کمال بے کمالی میں ہے

مولانا حالیؔ نے بھی اپنے کمال کا اظہار یوں کیا تھا ؎

گرچہ حالیؔ اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے — کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

اور میلارام وفاؔ نے کہا ؎

اس قدر نایاب ہیں اہل کمال اب اے وفاؔ — اب تو اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

بہرحال مولانا احمد رضاؔ کے باکمال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اگرچہ وہ خود تسلیم نہیں کرتے۔ ایک اور رباعی میں کہتے ہیں ؎

کس منہ سے کہوں رشکِ عنادل ہوں میں — شاعر ہوں، فصیح بے مماثل ہوں میں
حقا کوئی صنعت نہیں آتی مجھ کو — ہاں یہ ہے کہ نقص میں کامل ہوں میں

انھوں نے اپنی نعت کا ایک معیار تو یہ بتایا کہ "قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی"۔ دوسری بات یہ بتائی کہ ؎

توشہ میں غم و اشک کا ساماں بس ہے ۔ افغانِ دلِ زار حدی خواں بس ہے
رہبر کی رہِ نعت میں گر حاجت ہو ۔ نقشِ قدمِ حضرت حسّاں بس ہے

شعر و ادب میں نعت گوئی ایک مشکل صنف ہے ۔ شعر گوئی میں غزل کا میدان تو بہت وسیع ہے فنی اصول کی پابندی کے سوا شاعر پر اور کوئی پابندی نہیں ۔ شاعر آزاد ہے ۔ جس طرح چاہے اظہار خیال کرے ۔ لیکن نعت گوئی میں یہ آزادی نہیں ۔ نعت میں فنی پابندی کے علاوہ پاسِ ادب اور پاسِ شرع بھی ہے ۔ ذرا سی بھی لغزش ہو جائے تو شاعر روسیاہی کے سوا کچھ نہ پائے گا ۔ نعت گوئی کے لیے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بے پناہ عشق کی ضرورت ہے ۔ شعر کا حسن و اثر اسی عشق سے پیدا ہوتا ہے ۔ مولانا کے کلام میں حضور کے عشق کا سمندر متلاطم ہے ۔ اور وہ نہایت کامیابی کے ساتھ حضرتِ حسان رضی اللہ عنہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں ۔ اس کے علاوہ انہیں زبان و بیان ۔ الفاظ و محاورہ ۔ صنائع و بدائع پر بلا کی قدرت حاصل ہے ۔ اس لیے ان کے اشعار کا حسن اور اثر سہ چند ہو گیا ہے ۔ اکثر اشعار میں زبان و بیان کی خوبی اور محاورہ اور روزمرہ کے حسن نے کئی کئی صنعتیں پیدا کر دی ہیں ۔

زبان و بیان

مولانا کو شیریں زبانی کے اعتبار سے اہلِ زبان پر سبقت حاصل ہے ۔ اور بیان میں ندرت ہے ۔ اس دور میں داغ ۔ امیر ۔ حالی اکبر اور داغ و امیر کے تلامذہ کی زبان سلاست، سادگی اور محاورہ کے اعتبار سے مسلّم تھی ۔ مولانا کی زبان شگفتگی اور روانی میں ان اساتذہ کی زبان سے کسی طرح بھی کم نہیں ۔ ایک نعت میں فرماتے ہیں ؎

نصیبِ دوستاں گر ان کے در پر موت آنی ہے ۔ خدا یوں ہی کرے پھر تو ہمیشہ زندگانی ہے
ہر اک دیوار و در پر مہر نے کی ہے جبیں سائی ۔ نگارِ مسجدِ اقدس میں کب سونے کا پانی ہے
جہاں کی خاک روبی نے جہاں آرا کیا تجھ کو ۔ صبا ہم نے بھی ان گلیوں کی کچھ دن خاک چھانی ہے

آہ وہ آنکھ کہ ناکامِ تمنّا ہی رہی ۔ ہائے وہ دل جو ترے در سے پُر ارمان گیا

دل ہے وہ دل جو تری یاد سے معمور رہا
سر ہے وہ سر جو ترے قدموں پہ قربان گیا
انہیں جانا انہیں مانا نہ رکھا غیر سے کام
لِلّٰہ الحمد میں دُنیا سے مسلمان گیا

مولانا کے سارے کلام میں زبان کی شگفتگی کا یہی عالم ہے۔
اب حُسنِ زبان کے ساتھ محاورہ بندی کی بہار بھی دیکھئے ؎

پندِ ناصح لگے کڑوی نہ ترش ہوا ے نفس
زہرِ عصیاں میں ستم گر تجھے میٹھا کیا ہے
زاہد اُن کا میں گنہگار وہ میرے شافع
اتنی نسبت مجھے کیا کم ہے تو سمجھا کیا ہے

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی جان ہے تو جہان ہے
بارِ جلال اُٹھا لیا گرچہ کلیجہ شق ہوا
یوں تو یہ ماہِ سبز رنگ نظروں میں دھان پان ہے

اے دل یہ سلگنا کیا، جلنا ہے تو جل بھی اُٹھ
دم گھٹنے لگا ظالم کیا دھونی رمائی ہے

وہ تو نہایت سستا سودا بیچ رہے ہیں جنت کا
ہم مفلس کیا مول چکائیں اپنا ہاتھ ہی خالی ہے

کون دیتا ہے دینے کو منہ چاہیے
دینے والا ہے سچّا ہمارا نبی

گدا بھی منتظر ہے خلد میں نیکوں کی دعوت کا
خدا دن خیر سے لائے سخی کے گھر ضیافت کا
بڑھا یہ سلسلہ رحمت کا دورِ زلفِ والا میں
تسلسل کالے کوسوں رہ گیا عصیاں کی ظلمت کا

دل عبث خوف سے پتّا سا اُڑا جاتا ہے
پلّہ ہلکا سہی بھاری ہے بھروسہ تیرا
نیرے ٹکڑے پہ پلے غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال
جھڑکیاں کھائیں کہاں چھوڑ کے صدقہ تیرا
تو جو چاہے تو ابھی میل مرے دل کے دُھلیں
کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

میں ترے ہاتھوں کے صدقے کیسی کنکریاں تھیں وہ　　جس سے اتنے کافروں کا دفعتہً منہ پھر گیا
کیوں جناب بوہریرہ کیسا تھا وہ جام شیر　　جس سے ستر صاحبوں کا دودھ سے منہ پھر گیا
مومن اس کا کیا ہوا اللہ اس کا ہو گیا　　کافران سے کیا پھرا اللہ اس سے پھر گیا

اوس مہر حشر پر پڑ جائے پیاسو تو سہی　　اس گل خنداں کا رونا گریۂ شبنم نہیں

سوکھے دھانوں پہ ہمارے بھی کرم ہو جائے　　چھائے رحمت کی گھٹا بن کے تمہارے گیسو

کیا اسکو گرائے دہر جس پر تو نظر رکھے　　خاک اسکو اٹھائے حشر جو تیرے گرے دل سے

اب زبان کی صفائی اور محاورہ بندی کے ساتھ حسن بیان بھی دیکھیے

شر خیر، شور سور، شرر دور، نار نور　　بشریٰ کہ بارگاہ یہ خیر البشر کی ہے

جنت کو حرم سمجھا آتے تو یہاں آیا　　اب تک کے ہر ایک کا منہ کہتا ہوں کہاں آیا
طیبہ سے ہم آتے ہیں کہیئے تو جناں والو　　کیا دیکھ کے جیتا ہے جو واں سے یہاں آیا
سر اور وہ سنگ در، آنکھ اور وہ بزم نور　　ظالم کو وطن کا دھیان آیا تو کہاں آیا

یہ رائے کیا تھی وہاں سے پلٹنے کی اے نفس　　ستمگر الٹی چھری سے ہمیں حلال کیا
یہ کب کی مجھ سے عداوت تھی تجھ کو اے ظالم　　چھڑا کے سنگ در پاک سر وبال کیا

اجابت کا سہرا عنایت کا جوڑا　　دولہن بن کے نکلی دعائے محمد

ادھر سے پیہم تقاضے آنا ادھر تھا مشکل قدم بڑھانا　　جلال و ہیبت کا سامنا تھا جمال و رحمت ابھارتے تھے
بڑھے تو لیکن جھجکتے ڈرتے حیا سے جھکتے ادب سے رکتے　　جو قرب انہیں کی روش پہ رکھتے تو لاکھوں منزل کے فاصلے تھے

اب زبان کی شیرینی و روانی، محاورہ آرائی اور حسنِ بیان کے ساتھ زورِ کلام کا تلاطم دیکھئے ؎

لحد میں عشقِ رخِ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

جناں بنے گی محبانِ چار یار کی قبر
جو اپنے سینے میں یہ چار باغ لے کے چلے

تمہارے وصفِ جمال و کمال میں جبریل
محال ہے کہ مجال و مساغ لے کے چلے

رضا کسی سگِ طیبہ کے پاؤں بھی چومے
تم اور آہ کہ اتنا دماغ لے کے چلے

ہے کلامِ الٰہی میں شمس و ضحیٰ ترے چہرۂ نور فزا کی قسم
قسمِ شبِ تار میں راز یہ تھا کہ حبیب کی زلفِ دوتا کی قسم

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا، نہ کسی کو ملے نہ کسی کو ملا
کہ کلامِ مجید نے کھائی شہا ترے شہر و کلام و بقا کی قسم

ترا مسندِ ناز ہے عرشِ بریں، ترا محرمِ راز ہے روحِ امیں
تو ہی سرورِ ہر دو جہاں ہے شہا، ترا مثل نہیں ہے خدا کی قسم

مرے گرچہ گناہ ہیں حد سے سوا مگر اُن سے اُمید ہے تجھ سے رجا
تو رحیم ہے ان کا کرم ہے گواہ وہ کریم ہیں تیری عطا کی قسم

یہی کہتی ہے بلبلِ باغِ جناں، کہ رضا کی طرح کوئی سحر بیاں
نہیں ہند میں واصفِ شاہِ ہدیٰ مجھے شوخیٔ طبعِ رضا کی قسم

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں
مانگتے تاجدار پھرتے ہیں

جان ہے جان کیا نظر آئے
کیوں عدو گردِ غار پھرتے ہیں

لاکھوں قدسی ہیں کارِ خدمت میں
لاکھوں گردِ مزار پھرتے ہیں

پھول کیا دیکھوں میری آنکھوں میں
دشتِ طیبہ کے خار پھرتے ہیں

زمین و زماں تمہارے لیے مکین و مکاں تمہارے لیے
چنین و چناں تمہارے لیے بنے دو جہاں تمہارے لیے

فرشتے خدم، رسولِ حشم، تمامِ اُمم، غلامِ کرم
وجود و عدم، حدوث و قدم، جہاں میں عیاں تمہارے لیے

کلیم و نجی، مسیح و صفی، خلیل و رضی، رسول و نبی
عتیق و وصی، غنی و علی ثنا کی زباں تمہارے لیے

یہ شمس و قمر، یہ شام و سحر، یہ برگ و شجر، یہ باغ و ثمر
یہ تیغ و سپر، یہ تاج و کمر، یہ حکمِ رواں تمہارے لیے

جناں میں چمن، چمن میں سمن، سمن میں پھبن، پھبن میں دولہن
سزائے محن پہ ایسے منن، یہ امن و اماں تمہارے لیے

وہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

میں نثار تیرے کلام پر ملی یوں تو کس کو زباں نہیں
وہ سخن ہے جس میں سخن نہ ہو، وہ بیاں ہے جسکا بیاں نہیں

ترے آگے یوں ہیں دبے لچے، فصحاء عرب کے بڑے بڑے
کوئی جانے منہ میں زباں نہیں، نہیں بلکہ جسم میں جاں نہیں

یہ نہیں کہ خلد نہ ہو نکو، وہ نکوئی کی بھی ہے آبرو
مگر اے مدینے کی آرزو، جسے چاہے تو وہ سماں نہیں

وہی لامکاں کے مکیں ہوئے، سرِ عرش تخت نشیں ہوئے
وہ نبی ہیں جس کے ہیں یہ مکاں، وہ خدا ہے جسکا مکاں نہیں

سرِ عرش پر ہے تری گزر دلِ فرش پر ہے تری نظر
ملکوت و ملک میں کوئی شے نہیں وہ جو تجھ پہ عیاں نہیں

کروں تیرے نام پہ جاں فدا، نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا، کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

نہیں جس کے رنگ کا دوسرا، نہ تو ہو کوئی نہ کبھی ہوا
کہو اسکو گل کہے کوئی کیا، کہ گلوں کے ڈھیر کہاں نہیں

اُٹھا دو پردہ، دکھا دو جلوہ کہ نورِ باری حجاب میں ہے
زمانہ تاریک ہو رہا ہے کہ مہر کب سے نقاب میں ہے

انہیں کی بو مایۂ سمن ہے، انہیں کا جلوہ چمن چمن ہے
انہیں سے گلشن مہک رہے ہیں، انہیں کی رنگت گلاب میں ہے

وہ گُل ہیں لبہائے نازک اُنکے کہ جھڑتے رہتے ہیں پھول جن سے
گلاب گلشن میں دیکھے بلبل، یہ دیکھ گلشن گلاب میں ہے

کھڑے ہیں منکر نکیر سر پر، نہ کوئی ہمدم نہ کوئی یاور
بتا دو آکر مرے پیمبر، کہ سخت مشکل جواب میں ہے

کریم اپنے کرم کا صدقہ، لئیم بے قدر کو نہ شرما
تو اور رضا سے حساب لینا، رضا بھی کوئی حساب میں ہے

مضمون آفرینی و ندرت

غزل گو شاعر ہو یا نعت گو اس کا تخیل عموماً مضامین کے محدود دائرے میں گھومتا ہے۔ وہ بہ تبدیلیٔ الفاظ ایک ہی مضمون کو بار بار بیان کرتا ہے۔ نعت گو شعرا میں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ ان کے اشعار میں ندرت ہے۔ چونکہ انہوں نے نعت گوئی بقول خود قرآنِ مجید سے سیکھی ہے، اس لیے انہوں نے حضور

کی صفات کو قرآن کریم کی روشنی میں نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ عام طور سے مضمون آفرینی شعرا کو مشکل گو بنا دیتی ہے۔ کبھی وہ مضمون کی تلاش میں اتنا اونچا اُڑتے ہیں کہ نظروں ہی سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یعنی کلام مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر مولانا کے کلام میں یہ نقص کہیں نہیں پیدا ہوا۔ انھوں نے نہایت نازک مضامین عام فہم انداز میں بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

کس کی نگاہ کی حیا پھرتی ہے میری آنکھ میں — نرگسِ مست ناز نے مجھ سے نظر چرائی کیوں
پریشانی میں نام اُن کا دلِ صد چاک سے نکلا — اجابت تشانہ کرنے آئی گیسوئے توسّل کا
حُسن بے پردہ کے پردے نے مٹا رکھا ہے — ڈھونڈنے جائیں کہاں جلوۂ ہرجائی دوست

تنگ ٹھہری ہے رضا جس کے لیے وسعتِ عرش — بس جگہ دل میں ہے اس جلوۂ ہرجائی کی

سکھایا ہے یہ کس گستاخ نے آئینے کو یارب — نظارہ روئے تاباں کا بہانہ کر کے حیرت کا

دل شدوں کا یہ ہوا دامن اطہر پہ ہجوم — بیدل آباد ہوا نام دیار دامن کا

وہ دل کہ خوں شدہ ارماں تھے جس میں مل ڈالا — فغاں کہ گورِ شہیداں کو پائمال کیا
حضور ان کے خیالِ وطن مٹانا تھا — ہم آپ مٹ گئے ایسا فراغ بال کیا

بڑھا یہ سلسلہ رحمت کا دورِ زلفِ والا میں — تسلسل کالے کوسوں رہ گیا عصیاں کی ظلمت کا
الٰہی منتظر ہوں وہ خرام ناز فرمائیں — بچھا رکھا ہے فرش آنکھوں نے کمخواب بصارت کا

پناہِ دامنِ دشتِ حرم میں چین آتا — نہ صبرِ دل کو غزالِ رمیدہ ہونا تھا
حضور ان کے خلافِ ادب تھی بے تابی — مری امید تجھے آرمیدہ ہونا تھا

عبرت فزا ہے شرمِ گنہ سے مرا سکوت — گویا لبِ خموشِ لحد کا جواب ہوں
مٹ جائے یہ خودی تو وہ جلوہ کہاں نہیں — دریا میں آپ اپنی نظر کا حجاب ہوں
صدقے ہوں اس پہ نار سے دیگا جو مخلصی — بلبل نہیں کہ آتشِ گل پر کباب ہوں

ہمت اے ضعف انکے در پر گر کے ہوں — بے تکلف سایۂ دیوار ہم
اسی در پر تڑپتے ہیں مچلتے ہیں بلکتے ہیں — اٹھا جاتا نہیں کیا خوب اپنی ناتوانی ہے

خمِ زلفِ نبی ساجد ہے محرابِ دو ابرو میں — کہ یارب تو ہی والی ہے سیہ کارانِ امت کا

شرم سے جھکتی ہے محراب کہ ساجد ہیں حضور — سجدہ کرواتی ہے کعبہ سے جبیں سائی دوست

محرم نہ ہو آج کچھ مراد کہہ ہوا حضور میں — ورنہ مری طرف خوشی دیکھ کے مسکرائی کیوں

طیرِ حرم ہیں یہ کہیں رشتہ بپا نہ ہوں — یوں دیکھئے کہ تارِ نظر کو خبر نہ ہو
کانٹا مرے جگر سے غمِ روزگار کا — یوں کھینچ لیجئے کہ جگر کو خبر نہ ہو
اے خارِ طیبہ دیکھ کہ دامن نہ بھیگ جائے — یوں دل میں آ کہ دیدۂ تر کو خبر نہ ہو
اے شوقِ دل یہ سجدہ گر ان کو روا نہیں — اچھا وہ سجدہ کیجے کہ سر کو خبر نہ ہو

اُٹھے جو قصرِ دنٰی کے پردے کوئی خبر دے تو کیا خبر دے — وہاں تو جا ہی نہیں دوئی کی نہ کہہ کہ وہ ہی نہ تھے ارے تھے

لب زلالِ چشمۂ کن میں گندھے وقتِ خمیر — مردے زندہ کرنا اے جاں تم کو کیا دشوار ہے

یہ مٹ کے انکی روش پر ہوا خود ان کی روش — کہ نقشِ پا ہے زمیں پر نہ صوتِ پائے فلک

نہ ہو آقا کو سجدہ آدم و یوسف کو سجدہ ہو
مگر سدِ ذرائع داب ہے اپنی شریعت کا

اس میں روضہ کا سجدہ ہو کہ طواف
ہوش میں جو نہ ہو وہ کیا نہ کرے

اور کوئی غیب کیا تم سے نہاں ہو بھلا
جب نہ خدا ہی چھپا تم پہ کروڑوں درود

فیض ہے یا شہِ تسنیم نرالا تیرا
آپ پیاسوں کے تجسس میں ہے دریا تیرا

تشبیہ و استعارہ

شعر میں ادق اور پیچیدہ مضامین کو ادا کرنے میں تشبیہ و استعارہ سے بہت مدد ملتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ کسی خیال یا مضمون کا تصور پیدا کرنے میں مصور کا فرض ادا کرتے ہیں۔ اور شعر میں رنگینی اور دل کشی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن تشبیہ و استعارہ عام چیزوں ہی سے ہونا چاہئیں جو سب کے علم میں ہوں۔ غیر معروف تشبیہیں اور نامانوس استعارے کلام کو بدمزہ کر دیتے ہیں۔ مولانا احمد رضا خان نے نازک خیالات کے اظہار میں اور خصوصاً معراج کے بیان میں نہایت برمحل، لطیف اور دلنشیں تشبیہات اور استعارات سے کام لیا ہے۔ گزشتہ صفحات میں ان کا جو کلام پیش کیا گیا ہے، اس میں بھی کئی اچھی تشبیہیں نظر آتی ہیں۔ ذیل کے اشعار میں بھی تشبیہات کی کارفرمائی دیکھئے ؎

رنگ مژہ سے کر کے خجل یادِ شاہ میں
کھینچا ہے ہم نے کانٹوں پہ عطرِ جمالِ گل

"رنگِ مژہ" سے اشکِ خوں کی طرف اشارہ ہے اور اسے عطرِ جمالِ گل سے اور مژہ کو کانٹوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور پھر کانٹے اور گل کی رعایت مزید لطف پیدا کر رہی ہے۔ پھر کہا ؎

نعتِ حضور میں مترنّم ہے عندلیب
شاخوں کے جھومنے سے عیاں وجد و حالِ گل

شاخوں کے جھومنے کو وجد و حال قرار دیا ہے۔ اس طرح شعر میں صنعتِ حسنِ

تعلیل بھی پیدا ہو گئی ہے۔ صنعتِ تعلیل وہ صنعت ہے کہ ہم تخیل کے زور سے کسی چیز کی وہ علت بیان کریں جو دراصل نہ ہو۔ جیسے اس شعر میں شاخوں کا جھومنا تو ہوا کی وجہ سے ہے۔ لیکن شاعر کہتا ہے کہ شاخیں بلبل کے نغموں پر سر دھن رہی ہیں۔

ایک اور شعر ہے ؎

دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخنِ پا کا　　　اتنا بھی مہِ نو پہ نہ اے چرخِ کہن پھول

اس شعر میں ناخنِ پا کو مہِ نو سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور نوٗ اور کہن کی رعایتِ لفظی نے مزید لطف پیدا کیا ہے۔ پھر کہا ہے ؎

قالب تہی کئے ہمہ آغوش ہے ہلال　　　اے شہسوارِ طیبہ میں تیری رکاب ہوں

ہلال کو پہلے ہمہ آغوش کہا پھر اسے رکاب سے تشبیہ دی۔ جو بہت پُر لطف تشبیہ ہے۔ تہی قالب اور رکاب کی رعایات مزید لطف کا باعث ہیں۔ ایک اور شعر ہے ؎

جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی　　　پھر دکھا دے وہ ادائے گلِ خنداں ہم کو

تبسم کو بجلی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر ادائے گلِ خنداں کی بہار مزید لطف کا باعث ہے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، ان کے بعض اشعار میں کئی کئی صنعتیں ہیں۔

ایک اور شعر سنیئے ؎

بزم ثنائے زلف میں میری عروسِ فکر کو　　　ساری بہارِ ہشت خلد چھوٹا سا عطر دان ہے

ساری بہارِ خلد کو ایک چھوٹا سا عطر دان قرار دینا حضرتِ رضا ہی کا حصہ ہے ؎

اگرچہ چھالے ستاروں سے پڑ گئے لاکھوں　　　مگر تمہاری طلب میں تھکے نہ پائے فلک

چھالوں سے ستاروں کی تشبیہ بہت خوب ہے۔ پھر کہا ؎

کعبۂ جاں کو پنھایا ہے غلافِ مشکیں　　　اُڑ کے آئے ہیں جو ابرو پہ تمہارے گیسو

گیسو کو غلافِ مشکیں سے اور ابرو کو کعبہ سے تشبیہ دی گئی ہے ؎

مژدہ ہو قبلے سے گھنگھور گھٹائیں اُمڈیں　　　ابروؤں پر وہ جھکے جھوم کے بارے گیسو

اس شعر میں بھی گیسو کو گھٹا سے اور ابرو کو کعبہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پھر کہتے ہیں ؎

محبوب ربِّ عرش ہے اس سبز قبہ میں　　پہلو میں جلوہ گاہ عتیق و عمر کی ہے

سعدین کا قران ہے پہلوئے ماہ میں　　جھرمٹ کیے ہیں تارے تجلی قمر کی ہے

اس قطعے میں حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کو سعدین (دو نیک تاروں) اور حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو قمر سے اور روضے کے گرد زائرین کو تاروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور سبز قبہ فلک سبز کے مشابہ ہے۔ یہ سب تشبیہات دل پسند ہیں۔ مولانا کے کلام میں تشبیہات کی طرح استعارے بھی اچھوتے ہیں۔ میں یہاں چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ مولانا کو استعارہ آرائی میں کمال حاصل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گیا جو کاسۂ مہ لے کے شب گدائے فلک　　مرے غنی نے جواہر سے بھر دیا دامن

اس شعر میں مولانا نے فلک کو گدا سے استعارہ کیا جو چاند کا کاسہ لے کر غنی کے در پر بھیک مانگنے کے لیے حاضر ہوا تو غنی نے اس کا دامن جواہر سے بھر دیا۔ جواہر سے ستارے مراد ہیں۔ ایسے استعارے کو استعارہ بالکنایہ کہتے ہیں۔ یعنی ستارے کا لفظ موجود نہیں جواہر سے اشارہ کر دیا ہے جو قریب الفہم ہے۔ کہتے ہیں ؎

رہا جو قانعِ یک نانِ سوختہ دن بھر　　ملی حضور سے کانِ گہر جزائے فلک

نانِ سوختہ سے مراد سورج ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ چونکہ فلک نے دن بھر نانِ سوختہ پر قناعت کی تو رات کو اس قناعت کی جزا موتیوں کی کان (ستاروں) کی صورت میں ملی۔ کہتے ہیں ؎

کیا بات رضاؔ اس چمنستانِ کرم کی　　زہرا ہے کلی جس میں، حسین اور حسن پھول

پھر کہتے ہیں ؎

مولیٰ گلبن رحمت زہرا سبطین اس کی کلیاں پھول

صدیق و فاروق و عثمان حیدر ہر ایک اس کی شاخ

پہلے شعر میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو چمنستانِ کرم کی کلی اور حسین و حسن کو پھول قرار دیا ہے۔ دوسرے شعر میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو گلشن رحمت۔

زہرا اور حسین و حسن کو کلیاں اور پھول اور خلفائے راشدین کو گلشنِ رحمت کی شاخیں قرار دیا ہے۔ ایک اور شعر ہے ؎

مشک سا زلف شہ و نور فشاں روئے حضور
اللہ اللہ حلب جیب و تتارِ دامن

حلب کا شیشہ اور تتار کا مشک مشہور ہے۔ حضور کی زلف مشکیں سے دامن تاتار اور جیب نور سے حلب بن گئی ہے۔ تتار اور حلب دونوں استعارے کے طور پر لائے گئے ہیں۔ پھر کہتے ہیں ؎

ابرِ نیساں مومنوں کو تیغِ عریاں کفر پر
جمع ہیں شانِ جلالی و جمالی ہاتھ میں

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی لکیروں کو ابرِ نیساں سے جو شانِ جمالی کا مظہر ہے اور تیغ عریاں سے جو شانِ جلالی کی مظہر ہے استعارہ کیا ہے۔ ذیل کے شعر میں انہیں لکیروں کو دریائے نورِ بے مثالی قرار دیا ہے ؎

ہر خطِ کف ہے یہاں اے دست بیضائے کلیم
موجزن دریائے نورِ بے مثالی ہاتھ میں

اسی طرح ان کے سارے کلام میں لطیف اور حسن آفریں تشبیہات اور استعارات پائے جاتے ہیں۔

رعایات لفظی غزل ہو یا نعت شعر دراصل الفاظ کی خوبی ترتیب ہی کا دوسرا نام ہے۔ شعر میں الفاظ موقع و محل کے مطابق ہوں اور ترتیب میں موزونیت ہو تو شعر پُر لطف ہو جاتا ہے۔ الفاظ کی خوبی اور حسنِ ترتیب فصاحت کی محتاج ہے اور حسب موقع اور حسب محل معانی آفرینی بلاغت کا نتیجہ ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں مناسب الفاظ اور الفاظ کے حسن ترتیب کا دخل ہے۔ اس لیے شاعر کے پاس الفاظ اور محاورات کا بہت بڑا ذخیرہ ہونا چاہیئے۔ جسے وہ موقع و محل کے مطابق خوش نما اور خوش آئند اسلوب سے استعمال کر سکے۔ اس طرح اشعار میں کئی دلچسپ اور دل پسند خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور شعر سامعین کے کان کے راستے دل میں اتر جاتا ہے۔ زبان چونکہ الفاظ ہی کا مجموعہ ہے۔ مولانا احمد رضا خان کو جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، زبان پر پوری طرح قابو حاصل ہے۔ اس لیے ان کے حافظے

میں الفاظ کا لامحدود خزانہ بھی محفوظ ہے۔ میں مولانا کے کلام میں الفاظ کی خوبیوں کی نشان دہی کرنے سے پہلے چند فنی صنعتوں کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جو الفاظ سے متعلق ہیں۔ الفاظ کے بارے میں صنعتیں بے شمار ہیں لیکن میں یہاں انہیں چند صنعتوں کا ذکر کروں گا جو مولانا کے کلام میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

(۱) صنعت مراۃ النظیر۔ اس کو تناسب اور توفیق اور ایتلاف اور تلفیق بھی کہتے ہیں ہیں۔ یعنی شعر میں ایسے الفاظ استعمال کرنا جن کے معانی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں۔ جیسے چمن کے ذکر کے ساتھ گل وبلبل، سرو وقمری، بادِ صبا، باغبان یا گلچیں وغیرہ کا ذکر کرنا یا کسی چیز کے ذکر میں اس کے مناسبات بیان کرنا جیسے ؎

چمن کے تخت پر جس دن شہِ گل کا تجمل تھا ہزاروں بلبلوں کی فوج تھی اور شور تھا غل تھا

چمن کے ساتھ گل، بلبلوں اور تخت کے ساتھ شہ اور فوج کا ذکر آیا یا جیسے اس شعر میں ؎

جبیں والفجر ہے واللیل گیسوئے معنبر ہے خطِ رخ سورۂ یوسف ہے انکے مصحفِ رخ میں

مصحف کی رعایت سے سورۂ والفجر اور واللیل اور یوسف کا ذکر آیا۔

(۲) صنعتِ تجنیس۔ وہ صنعت ہے کہ دو لفظ تلفظ میں مشابہ ہوں اور معنی میں مختلف۔ اگر ان دونوں میں ایک فعل اور دوسرا اسم ہو تو اسے صنعتِ تجنیس تام کہتے ہیں۔ اور دونوں اسم ہوں تو اُسے صنعتِ تجنیس تام مماثل کہتے ہیں۔ دونوں کی مثال یہ دو شعر ہیں ؎

کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ

آدمی کہتے ہیں جسکو ایک پتلا کل کا ہے پھر کہاں کل اسکو گر ہو کل فرما بگڑ گئی

دو لفظوں میں ایک ایک حرف یا دو دو حرف مختلف ہوں تو اسے تجنیس مضارع کہتے ہیں۔ جیسے اس شعر میں ؎

عقل میں شمس ہے تو علم میں کانِ گوہر   فضل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہِ رحمت

علم و حلم اور عقل و فضل میں تجنیس مضارع ہے۔

(۳) صنعتِ اشتقاق۔ وہ صنعت ہے کہ کلام میں ایک ماخذ اور ایک اصل کے چند الفاظ لائے جائیں اور وہ معانی میں بھی باہم دگر اتفاق رکھتے ہوں۔ جیسے اس شعر میں ؎

اے بخت تو جاگ اور جگا ہم کو کہ پھر ہم   جاگیں گے نہ تا حشر جگانے سے کسی کے

جاگ۔ جگا۔ جاگیں گے۔ جگانے چاروں الفاظ جاگنا سے مشتق ہیں۔

(۴) صنعت شبہ اشتقاق۔ وہ صنعت ہے کہ کلام میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو آپس میں ملتے جلتے ہوں۔ لیکن ایک ماخذ سے نہ ہوں۔ بظاہر ایک ماخذ سے معلوم ہوتے ہوں جیسے اس شعر میں ؎

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے   وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کعبتین اور کعبہ بظاہر ملتے جلتے الفاظ ہیں لیکن ایک ماخذ سے نہیں ہیں۔

(۵) صنعتِ مقلوب۔ وہ صنعت ہے کہ شعر میں ایسا لفظ یا الفاظ لائے جائیں کہ ان کی ترتیب الٹ دیں تو بامعنی لفظ بنے۔ جیسے اس شعر میں ؎

وصف اس صرصرِ شیم کا کوئی لکھے یا پڑھے   ذہن دوڑے صورتِ فرف پڑھے فرفر زباں

رفرف کو الٹیں تو فرفر بنتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی لفظ کو الٹیں تو وہ پھر بھی وہی رہتا ہے۔ جیسے اس شعر میں ؎

پھر کر ادھر اُدھر نہ ہمارا کیا قلق   لفظِ قلق کی طرح سے وہ ہی رہا قلق

ع میں ہوں لفظ درد جس پہلو سے الٹو درد ہے۔

(۶) صنعتِ ذوقافیتین وہ ہے کہ شعر میں دو دو قافیے لائے جائیں۔ جیسے ؎

اگر حق نے بخشی ہے عقلِ نجیب   تو سُن مجھ سے تو ایک نقلِ عجیب

(۷) صنعتِ سیاق الاعداد وہ ہے کہ کلام میں اعداد لائے جائیں خواہ ترتیب وار خواہ بے ترتیب جیسے اس شعر میں ؎

کشتے ہوں ایک ضرب میں دو ہوں کہ چار ہوں　　　شش در تھے سب کہ موت سے کیونکر دو چار ہوں

(۸) صنعتِ مسمّط وہ صنعت ہے کہ ہر شعر میں تین تین ٹکڑے ہم قافیہ ہوں۔ جیسے اس شعر میں ؎

قریب ہے یار روزِ محشر، چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر　　　جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

(۹) صنعتِ ترصیع وہ صنعت ہے کہ شعر میں دوسرے مصرع کے تمام الفاظ پہلے مصرع سے ہم قافیہ ہوں۔ جیسے اس شعر میں ؎

باصر ہیں یہ بصیر ہیں اہلِ وفا ہیں یہ　　　قادر ہیں یہ قدیر ہیں اہلِ سخا ہیں یہ

(۱۰) صنعتِ واصل الشفتین وہ صنعت ہے کہ شعر میں ایسے لفظ لائے جائیں کہ جب ہم پڑھیں تو ہر لفظ پر لب سے لب ملیں۔ جیسے اس شعر میں ؎

میرا ممدوح امیرابنِ امیرابنِ امیر　　　میں کمربستہ کمیں خادمِ مدحت ہوں ہما

(۱۱) صنعتِ واسع الشفتین وہ صنعت ہے کہ شعر میں ایسے لفظ لائے جائیں کہ جب ہم پڑھیں تو ہر لفظ پر لب سے لب جدا رہے۔ جیسے اس شعر میں ؎

اسطرح کا ہے سخن سنج کہ جس کا ثانی　　　آج تک اہلِ جہاں نے کہیں دیکھا نہ سنا

(۱۲) صنعتِ تلمیع۔ وہ صنعت ہے کہ کوئی شعر دو یا تین زبانوں میں کہا جائے اسے صنعتِ ذولسانین بھی کہا جاتا ہے۔ جیسے اس شعر میں ؎

بادِ صبا بکوچۂ جاناں چو بگذری　　　کہ دینا واں یہ ذکر ہمارا بھی سرسری

(۱۳) صنعتِ تنسیق الصفات وہ صنعت ہے کہ شعر میں کسی کا ذکر صفاتِ متواتر سے کریں۔ اسے صنعت تواتر بھی کہتے ہیں۔ جیسے اس شعر میں ؎

اسد ہیبت فلک پیکر قمر سُم　　　عنانیں دونوں جوزا، سفیلہ دُم

(۱۴) صنعتِ طباق اسے صنعتِ تضاد اور مطابقت بھی کہتے ہیں۔ یعنی شعر میں ایسے الفاظ لائے جائیں جو آپس میں ایک دوسرے کی ضد اور مقابل ہوں۔ جیسے اس شعر میں ؎

کچھ تیری بات کو ثبات نہیں　　　ایک ہاں ہے تو پانچ سات نہیں

ہاں اور نہیں صنعتِ طباق یا تضاد ہے۔ بات اور ثبات بھی صنعتِ تجنیس ہی کی ایک قسم ہے۔

(۱۵) صنعتِ تضاد۔ وہ صنعت ہے کہ شعر میں ایسے دو الفاظ لائے جائیں جن میں بظاہر تضاد نہ ہو مگر معنوی حیثیت میں تضاد ہو۔ جیسے اس شعر میں ؎

مجھے رونا نہ اپنے حال پر کس طرح سے آئے
تو آزش برق بھی ہنستی ہے میری بے قراری پر

بظاہر بجلی کے چمکنے اور آدمی کے رونے میں کوئی تضاد نہیں۔ لیکن جب بجلی کے چمکنے کو ہنسنے سے تعبیر کیا تو ہنسنے اور رونے میں تضاد ہو گیا۔

(۱۶) صنعتِ ایہام یا توریہ۔ ایہام کے معنی ہیں وہم میں ڈالنا۔ اصطلاح میں ایہام وہ صنعت ہے کہ شعر میں ایسا لفظ لایا جائے جس کے دو معنی ہوں ایک قریب کے دوسرے بعید کے۔ سامع کا خیال معنی قریب کی طرف جائے اور شعر میں مراد معنی بعید سے ہو۔ جیسے اس شعر میں ؎

میکش کو ہوس ایاغ کی ہے پروانے کو لو چراغ کی ہے

لو کے ایک معنی شوق و آرزو اور دوسرے معنی شعلہ۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔ لیکن چراغ کی لو کہنے سے شعلے کے معنی کی طرف دھیان جاتا ہے۔

(۱۷) صنعتِ تجاہلِ عارفانہ جسے سوق المعلوم بھی کہتے ہیں۔ یعنی کسی چیز سے واقفیت کے باوجود بے خبری ظاہر کی جائے۔ جیسے اس شعر میں ؎

موشگافی تو بہت کی نہ ہوا پر معلوم گیسوؤں میں ہے کمر یا ہیں کمر پر گیسو

(۱۸) صنعتِ لف و نشر وہ صنعت ہے کہ شعر کے پہلے مصرع میں چند چیزوں کا ذکر کیا جائے پھر دوسرے مصرع میں اُن کی مناسبت سے دوسری چند چیزوں کا ذکر ہو۔ جیسے اس شعر میں ؎

تیرے رخسار و قد و زلف کے ہیں عاشق زار گل جدا، سرو جدا، نرگسِ بیمار جدا

صنعتِ تقسیم بھی لف و نشر ہی سے ملتی جلتی صنعت ہے۔

(۱۹) صنعتِ حسنِ تعلیل۔ وہ صنعت ہے کہ شعر میں ایک چیز کو صنعت کے لیے کسی دوسری چیز کی علت ٹھہرانا اور دراصل وہ اس کی علت نہ ہو۔ جیسے اس شعر میں ؎

ساحل سے سر پٹکتی تھیں موجیں فرات کی
پیاسی جو تھی سپاہِ خدا تین رات کی

(۲۰) صنعت تلمیح جسے تملیح بھی کہتے ہیں۔ وہ صنعت ہے کہ شاعر شعر میں کسی مشہور مسئلہ یا قصے یا مثل یا کسی علمی اصطلاح کا یا قرآن مجید کی کسی آیت یا حدیث کا حوالہ دے۔ جیسے اس شعر میں ؎

علمِ موسیٰ بھی ہے تیرے سامنے حیرت فروش
کشتیٔ مسکین و جانِ پاک و دیوارِ یتیم

شعر کے پہلے مصرع میں ایسی تین چیزوں کا حوالہ ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں حضرت خضر اور حضرت موسیٰ علیہم السلام کے ہم سفر ہونے کے قصے میں ہے۔

اب میں اعلیٰحضرت احمد رضا خان قدس سرہٗ کے کلام میں صنائع لفظی اور صنائعِ معنوی کی نشان دہی کروں گا۔ ان کے کلام میں صنعتیں بے شمار ہیں۔ میں بخوفِ طوالت ہر صنعت کی چند ہی مثالیں پیش کروں گا۔ اہلِ ذوق حدائقِ بخشش کے مطالعہ سے لطف اندوز ہوں۔

صنعت مراۃ النظیر

اگر شعر میں لفظی رعائیتوں کا التزام نہ کیا جائے تو شعر پھیکا رہتا ہے۔ اس لیے صنعت مراۃ النظیر سے مولانا کا کوئی شعر بھی خالی نہیں ہے۔ میں یہاں مثال میں چند اشعار پیش کروں گا۔ مولانا شبِ معراج کے ذکر میں فرماتے ہیں ؎

مشکل میں ہیں براتی پُرخار بادیے ہیں
دولہا سے اتنا کہہ دو پیارے سواری روکو

شعر میں دولہا کے لفظ کی رعایت سے سواری اور براتی بھی آ گئے۔ پھر فرمایا ؎

تسلسل کالے کوسوں رہ گیا عصیاں کی ظلمت کا
بڑھا یہ سلسلہ رحمت کا دورِ زلف والا میں

زلف کا ذکر تھا تو سلسلہ، تسلسل کالے کوسوں، ظلمت کی رعائیتیں بھی آ گئیں۔ پھر ظلمتِ عصیاں کے ساتھ کالے کوسوں کا محاورہ مزید لطف دے رہا ہے۔ پھر

فرماتے ہیں ؂

آنے دو یا ڈبو دو اب تو تمہاری جانب　　کشتی تمہیں پہ چھوڑی لنگر اٹھا دیئے ہیں

کشتی کا ذکر آیا تو لنگر اٹھانے اور ڈبونے کی رعائتیں بھی آ گئیں۔ پھر فرماتے ہیں ؂

وہ تو نہایت سستا سودا بیچ رہے ہیں جنت کا　　ہم مفلس کیا مول چکائیں اپنا ہاتھ ہی خالی ہے

جنت کے سودے کا ذکر آیا تو بیچنے۔ مول۔ مفلس۔ "وہ ہاتھ خالی" کے الفاظ کی رعائتوں نے شعر کا حسن دوبالا کر دیا۔ پھر مول چکانا اور ہاتھ خالی کے محاورے کتنے برجستہ استعمال ہوئے ہیں۔ پھر فرمایا ؂

تیرے ٹکڑے پہ پلے غیر کی ٹھوکر پہ نہ ڈال　　جھڑکیاں کھائیں کہاں چھوڑ کے صدقہ تیرا

ٹکڑوں پہ پلے غیر کی ٹھوکر پہ ڈالنا، تیرا صدقہ کھانے والا غیر کی جھڑکیاں کیسے کھائے۔ سوالی کی حالت بیان کرنے میں کتنی رعائتوں کا محاورات کے ساتھ التزام کیا ہے۔ پھر فرماتے ہیں ؂

ہے گلِ باغِ قدس رخسارِ زیبائے حضور　　سروِ گلزارِ قدم قامت رسول اللہ کی

گلِ باغِ قدس، سروِ گلزارِ قدم، رخسارِ زیبا اور سرو و قامت لفظی رعایتوں کا انبار لگا دیا ہے۔

مولانا نے بعض اشعار میں الفاظ کی تکرار سے مضمون کو پر لطف بنایا ہے۔ مثلاً حسبِ ذیل اشعار میں ؂

دل مکانِ شہِ عرشیاں ہو گیا　　لامکاں، لامکاں، لامکاں ہو گیا

سر فدائے رہِ جانِ جاں ہو گیا　　امتحاں امتحاں امتحاں ہو گیا

تھا براقِ نبی یا کہ نورِ نظر　　یہ گیا وہ گیا وہ نہاں ہو گیا

حق شفاعت سے تیری گنہگاروں پہ　　مہرباں مہرباں مہرباں ہو گیا

گلشنِ طیبہ میں طائرِ سدرہ کا　　آشیاں آشیاں آشیاں ہو گیا

یا نبی تو خبر آتشِ غم سے میں　　تفتہ جاں تفتہ جاں تفتہ جاں ہو گیا

گزرے جس کوچے سے شاہِ گردوں جناب　　آسماں آسماں آسماں ہو گیا

تیرے بے دام کے بندے ہیں رئیسانِ عجم | تیرے بے دام کے بندی ہیں ہزارانِ عرب
تاج والوں کا یہاں خاک پہ ماتھا دیکھا | سارے داراؤں کی دارا ہوئی دارائی دوست
طور پر کوئی، کوئی چرخ پہ یہ عرش سے پار | سارے بالاؤں سے بالا رہی بالائی دوست

حمد برائے جناب الٰہی جناب الٰہی برائے محمد

بعض اشعار میں مولانا نے متضاد الفاظ سے حسن پیدا کیا ہے مثلاً ان اشعار میں ؎

مرنے والوں کو یہاں ملتی ہے عمرِ جاوید | زندہ چھوڑے گی کسی کو نہ مسیحائی دوست

اے عشق ترے صدقے جلنے سے چھٹے سستے | جو آگ بجھا دے گی وہ آگ لگائی ہے

دل عبث خوف سے پتا سا اڑا جاتا ہے | پلّہ ہلکا سہی، بھاری ہے بھروسہ تیرا

ہلکا ہے اگر پلّہ ہمارا | بھاری ہے ترا وقار آقا

بندھ چلی تیری ضیا، اندھیر عالم سے گھٹا | کھل گیا گیسو ترا رحمت کا بادل گھر گیا

رضائے خستہ کیا کتنا عجب جادو بیانی ہے | نمک ہر نغمۂ شیریں میں ہے شورِ عنادل کا

سُنّیت سے کھٹکے سب کی آنکھ میں | پھول ہو کر بن گئے ہیں خار ہم
وہ کہ اس در کا ہوا خلقِ خدا اس کی ہوئی | وہ کہ اس در سے پھرا اللہ اس سے پھر گیا

اشعارِ بالا میں تضادِ الفاظ کی صنعت کے علاوہ رنگا رنگ محاورات بھی ہیں۔
بعض اشعار میں الفاظ یا محاورے کی تکرار سے معانی میں تضاد پیدا کیا ہے۔ جیسے ان

اشعار میں ؎

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں — دو جہاں کی نعمتیں ہیں انکے خالی ہاتھ میں

مومن اسکا کیا ہوا، اللہ اس کا ہو گیا — کافر اُن سے کیا پھرا اللہ ہی سے پھر گیا

صنعتِ تجنیس مولانا کے کلام میں اس صنعت کے اشعار بکثرت ہیں۔ مثال میں چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

دھات — سنسان — خفتن

سونا پاس ہے سُونا بن ہے سونا زہر ہے اٹھ پیارے
تو کہتا ہے میٹھی نیند ہے تیری مت ہی نرالی ہے

صدقے میں ترے باغ تو کیا لائے ہیں بن پھول — اس غنچۂ دل کو بھی تو ایما ہو کہ بن پھول

انبیا کو بھی اجل آنی ہے — مگر ایسی کہ فقط آنی ہے

یہ کتابِ حق میں آیا طرفہ آیہ نور کا — غیر قائل کچھ نہ سمجھا کوئی معنی نُور کا

جو گدا دیکھو لئے جاتا ہے توڑا نور کا — نور کی سرکار ہے کیا اس میں توڑا نُور کا

قرنوں بدلی رسولوں کی ہوتی رہی — چاند بدلی کا نکلا ہمارا نبی

اک ترے رخ کی روشنی جان ہے دو جہان کی — انس کا اُنس اسی سے ہے جان کی وہ ہی جان ہے

جان اور جان میں تجنیس تام ہے اور اِنس اور اُنس میں تجنیس خطی ہے اور ایک اور دو میں صنعتِ اعداد بھی ہے۔ ذیل کے اشعار میں بھی تجنیس خطی ہے ؎

تیرے خُلق کو حق نے عظیم کہا، تری خلق کو حق نے جمیل کہا
کوئی تجھ سا ہوا ہے نہ ہوگا شہا، ترے خالقِ حُسن و ادا کی قسم

اس شعر کے مصرعِ اول میں چونکہ آیتِ قرآنی کا مفہوم بھی ہے اس لیے اس میں صنعتِ تلمیح بھی ہے ؎

یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھے گا
ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کیسی متوالی ہے

گزرے جس راہ سے وہ سیّدِ والا ہو کر   رہ گئی ساری زمیں عنبرِ سارا ہو کر

صنعتِ ایہام

مولانا نے صنعتِ ایہام کے استعمال سے اپنے اشعار کا لطف دو چند کر دیا ہے۔ جیسے ان اشعار میں ؎

ہوئے کم خوابیٔ ہجراں میں ساتوں پردے کم خوابی   تصوّر خوب باندھا آنکھوں نے استارِ تربت کا

نور کی سرکار سے پایا دو شالہ نور کا   ہو مبارک تم کو ذوالنورین جوڑا نور کا

ذوالنورین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خطاب ہے کیونکہ ان کے عقد میں حضور رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم کی دو بیٹیاں آئیں۔ جوڑا نور کا اور دو شالہ نور کا سے بھی بیبیاں مراد ہیں۔ پھر کہتے ہیں ؎

حُورِ جناں ستم کیا طیبہ نظر میں پھر گیا   چھیڑ کے پردۂ حجاز دیس کی چیز گائی کیوں

ذبح ہوتے ہیں وطن سے بچھڑے   دیس کیوں گاتے ہیں گانے والے

دیس کے معنی بھی وطن ہے۔ لیکن یہاں راگ سے مراد ہے۔ پھر فرمایا ؎

عرش کی عقل دنگ ہے چرخ میں آسمان ہے   جانِ مراد اب کدھر ہائے ترا مکان ہے

پھر پھر کر ہر جانب دیکھوں کوئی آس نہ پاس کہیں   ہاں اک ٹوٹی آس نے ہارے جی سے رفاقت پائی ہے

فصل گل، سبزہ، صبا، مستی، شباب   چھوڑیں کس دل سے درِ خمارِ ہم

دل غم تجھے گھیرے ہیں خدا تجھ کو وہ چمکائے   سورج ترے خرمن کو بنے تیری کرن پھول

فصل گل لاکھ نہ ہو وصل کی رکھ آس ہزار   پھولتے پھلتے ہیں بے فصل گلستانِ عرب

کچھ نعت کے طبقے کا عالم ہی نرالا ہے   سکتہ میں پڑی ہے عقل چکر میں گماں آیا

نعت کے لفظ سے وہم شعر کے سکتے کی طرف بھی جاتا ہے۔ پھر فرمایا ؎

شمع ساں ایک ایک پروانہ ہے اس بانور کا   نورِ حق سے لو لگائے دل میں رشتہ نور کا

صنعتِ لف ونشر

مولانا کے کلام میں اس صنعت میں بہت سے اشعار ہیں۔ اس صنعت سے کلام میں دلکشی اور زور پیدا ہوتا ہے۔ مثالیں حاضر ہیں ؎

دندان ولب و زلف و رخِ شہ کے فدائی   ہیں دُرِ عدن لعل یمن مشکِ ختن پھول

دو قمر دو پنجۂ خور دو ستارے دس ہلال   ان کے تلوے پنجے ناخن پائے اطہر ایڑیاں

مشک سا زلفِ شہ و نور فشاں روئے حضور   اللہ اللہ حلب جیب و تتار دامن

ظاہر و باطن اول و آخر زیبِ فروع و زینِ اصول   باغِ رسالت میں ہے تو ہی گل غنچہ جڑ پتی شاخ

یاد در رخ میں آہیں کر کے بن میں رو دیا آئی بہار   جھومیں نسیمیں، نیساں برسا، کلیاں چٹکیں مہکی شاخ

شاخِ قامت شہ میں، زلف و چشم و رخسار و لب　　　سنبل، نرگس، گل، پنکھڑیاں قدرت کی کیا پھولی شاخ

دلِ بستہ، بیقرار، جگر چاک، اشکبار　　　غنچہ ہوں، گل ہوں، برقِ تپاں ہوں، شرار ہوں

صنعتِ تنسیق الصفات

مولانا کے کلام میں اس صنعت میں بھی بکثرت اشعار ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

اصالتِ کل، امامتِ کل، سیادتِ کل، امارتِ کل　　　حکومتِ کل، ولایتِ کل، خدا کے یہاں تمہارے لئے

تمہاری چمک، تمہاری دمک، تمہاری جھلک، تمہاری مہک　　　زمین و فلک، سماک و سمک میں سکہ نشاں تمہارے لئے

یہ شمس و قمر، یہ شام و سحر، یہ برگ و شجر، یہ باغ و ثمر　　　یہ تیغ و سپر، یہ تاج و کمر، یہ حکم رواں تمہارے لئے

گنہ مغفور، دل روشن، خنک آنکھیں، جگر ٹھنڈا　　　تعالی اللہ ماہِ طیبہ عالم تیری طلعت کا

سیدالکونین، سلطانِ جہاں　　　ظلِ یزداں، شاہِ دیں، عرش آشیاں

کل سے اعلیٰ، کل سے اولیٰ، کل کی جاں　　　کل کے آقا، کل کے ہادی، کل کی شاں

ہر حکایت ہر کنایت ہر ادا　　　ہر اشارت دلنشین و دلستاں

آنکھ دے اور آنکھ کو دیدارِ نور　　　روح دے اور روح کو راحِ جناں

سرتا بقدم ہے تنِ سلطانِ زمن پھول　　　لب پھول، دہن پھول، ذقن پھول، بدن پھول

عنبر زمیں، عبیر ہوا، مشک تر غبار　　　ادنیٰ سی یہ شناخت تری رہ گزر کی ہے

صنعتِ ترصیع

صنعتِ ترصیع سے کلام مرصع ہو جاتا ہے۔ اس صنعت میں مولانا کے بہت سے اشعار ہیں۔ مثلاً فرماتے ہیں ؎

اغنیا پلتے ہیں در سے وہ ہے باڑا تیرا　　　اصفیا چلتے ہیں سر سے وہ ہے رستہ تیرا

عرش پر دھومیں مچیں وہ مومنِ صالح ملا ‏ ‏ ‏ فرش سے ماتم اٹھا وہ طیّب و طاہر گیا

کھبتی ہوئی نظر میں ادا کس سحر کی ہے ‏ ‏ ‏ چبھتی ہوئی جگر میں صدا کس گجر کی ہے

دھارے چلتے ہیں عطا کے وہ ہے قطرہ تیرا ‏ ‏ ‏ تارے کھلتے ہیں سخا کے وہ ہے ذرّہ تیرا

آئی بدعت چھائی ظلمت رنگ بدلا نور کا ‏ ‏ ‏ ماہِ سُنّت مہرِ طلعت لے لے بدلا نور کا

سویا کئے نابکار بندے ‏ ‏ ‏ رویا کئے زار زار آقا

تیری رحمت سے صفی اللہ کا بیڑا پار تھا ‏ ‏ ‏ تیرے صدقے سے نجی اللہ کا بجرا تر گیا

بڑھ گئی تیری ضیا، اندھیر عالم سے چھٹا ‏ ‏ ‏ کھل گیا گیسو ترا رحمت کا بادل گھر گیا

میٹھی باتیں تری دینِ عجم، ایمانِ عرب ‏ ‏ ‏ نمکیں حسن ترا جانِ عجم، شانِ عرب

صنعتِ تلمیع

اکثر شعرا نے اس صنعت میں دو دو زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ لیکن مولانا نے اس صنعت میں ایک نعت چار زبانوں یعنی اردو۔ ہندی۔ فارسی اور عربی میں کہی ہے۔ میں اس کے چند اشعار یہاں نقل کرتا ہوں۔ فرماتے ہیں ؎

لَمْ یَاتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا ‏ ‏ ‏ جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا

اَلْبَحْرُ عَلَا وَالْمَوْجُ طَغٰی من بیکس و طوفاں ہوش ربا ‏ ‏ ‏ منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا جانا

یَا شَمْسُ نَظَرْتِ اِلٰی لَیْلِیْ چو بطیبہ رسی عرضے بکنی ‏ ‏ ‏ توری جوت کی جھلجھل جگ میں رچی مری شب نے نہ دن ہونا جانا

اَنْقَلْبُ شَیْءٌ وَّالْھُمُوْمُ شَجُوْنٌ دل زار چناں جاں پر چوں   بت اپنی بیت میں کاسے کہوں مرا کون ہے تیرے سوا جانا

بس خامۂ خام نوائے رضا نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا

ارشاد احبا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

صنعتِ حسن تعلیل

اس صنعت میں بھی مولانا نے رنگا رنگ گل کھلائے ہیں۔
چند اشعار حاضر ہیں ؎

ہلال کیسے نہ بنتا کہ ماہِ کامل کو   سلام ابروئے شہ میں خمیدہ ہونا تھا

اس شعر میں ہلال کے خمیدہ ہونے کی جو وجہ بتائی ہے وہ تو حُسنِ تعلیل کے ذیل میں آتی ہے۔ پھر ہلال سے ابرو کی تشبیہ اور ماہِ کامل کا ہلال بننا شعر کے لطف کو دوچند کر رہے ہیں۔ پھر کہا ؎

سلسلہ پا کے شفاعت کا جھکے پڑتے ہیں   سجدۂ شکر کا کرتے ہیں اشارہ گیسو

گیسوؤں کے جھکنے کی جو وجہ بتائی ہے وہ تو حسنِ تعلیل کے قبیل سے ہے۔ گیسو کے ساتھ سلسلہ اور جھکنے کے ساتھ سجدہ کی رعائتیں مزید لطف پیدا کر رہی ہیں۔ پھر فرمایا ؎

یہ اکثر ساتھ اُن کے شانہ و مسواک کا رہنا   بتاتا ہے کہ دل ریشوں پہ زائد مہربانی ہے

شانہ و مسواک کے ساتھ رہنے کی وجہ تو حُسنِ تعلیل کا حصّہ ہے اور دل ریش کی شانہ و مسواک سے تشبیہ مزید داد چاہتی ہے۔ پھر فرمایا ؎

غفلتِ شیخ و شاب پر ہنستے ہیں طفلِ شیر خوار   کرنے کو گدگدی عبث آنے لگی بہائی کیوں۔

بچہ جب نیند میں مسکراتا ہے تو شیخ و شاب کہتے ہیں کہ بچے کو دودھ بہائی ہنساتی ہے۔ مولانا اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ بچہ شیخ و شاب کی غفلت پر ہنستا ہے۔ اور وہ اسے دودھ بہائی کا کرشمہ بتاتے ہیں۔ پھر فرمایا ؎

قالب تہی کئے ہمہ آغوش ہے ہلال   اے شہسوارِ طیبہ میں تیری رکاب ہوں

سبزۂ گردوں جھکا تھا بہرِ پابوسِ براق   پھر نہ سیدھا ہو سکا کھایا وہ کوڑا نور کا

جس کو قرصِ مہر سمجھا ہے جہاں اے منعمو
اُنکے خوانِ جُود سے ہے ایک نانِ سوختہ

مہرِ عالم تاب جھکتا ہے پئے تسلیم روز
پیشِ ذراتِ مزارِ بیدلانِ سوختہ

نہ جاگ اٹھیں کہیں اہلِ بقیع کچی نیند
چلا یہ نرم نہ نکلی صدائے پائے فلک

صنعتِ تلمیح

مولانا کے کلام میں علمی اور دینی اصطلاحیں۔ تاریخی واقعات۔ آیات و احادیث اور قصص قرآنی کی طرف اشارے عام پائے جاتے ہیں۔ معجزات کے حوالے بھی صنعت تلمیح ہی کی ذیل میں آتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں کچھ اشعار پیش کرتا ہوں۔ جن میں مختلف تلمیحات ہیں سے

مہر میزاں میں چھپا ہو تو حمل میں چمکے
ڈالے اک بوند شبِ دے میں جو بارانِ عرب

بارھویں کے چاند کا مجرا ہے سجدہ نور کا
بارہ برجوں سے جھکا اک اک ستارہ نور کا

نو نیازِ سبقِ شمسیہ ہے شمسِ منیر
نور آموز ہے یا رب یہ دلبستاں کس کا

کرمِ نعت کے نزدیک تو کچھ دور نہیں
کہ رضائے عجمی ہو سگِ حسانِ عرب

جس نے بیعت کی بہارِ حسن پر قرباں رہا
ہیں لکیریں نقشِ تسخیرِ جمالی ہاتھ میں

زبانِ فلسفی سے امن وخرق والتیام اسریٰ
پناہ دورِ رحمت ہائے یک ساعت تسلسل کو

جان ہیں جان کیا نظر آئے
کیوں عدو گردِ غار پھرتے ہیں

عرش سے مژدۂ بلقیسِ شفاعت لایا
طائرِ سدرہ نشیں مرغِ سلیمانِ عرب

کوچے کوچے میں مہکتی ہے یہاں بوئے قمیص　　　یوسفستان ہے ہر کوچۂ کنعانِ عرب

نور کی سرکار سے پایا دوشالہ نور کا　　　ہو مبارک تم کو ذوالنورین جوڑا نور کا

تیری رحمت سے صفی اللہ کا بیڑا پار تھا　　　تیرے صدقے سے نجی اللہ کا بیڑا اتر گیا

بڑھا اس درجہ عبِ حسنِ و الالیلۃ الاسرئے　　　سمٹ کر بن گیا چرخ ایک پایہ انکے محمل کا

ذیابٌ فی ثیابٍ، لب پہ کلمہ دل میں گستاخی　　　سلام اسلام ملحد کو کہ تسلیم زبانی ہے

عصائے کلیم اژدہائے غضب تھا　　　گروں کا سہارا عصائے محمد

چمکا کے برقِ جلوہ جلا دیجے طور ساں　　　اَرِنی اگر کہا تو یہی ہے سزائے دل

مہر مادر کا مزہ دیتی ہے آغوشِ حطیم　　　جن پہ ماں باپ فدا یاں کرم ان کا دیکھا

خوب مسعے ایں یہ امیدِ صفا دوڑ لیے　　　رہِ جاناں کی صفا کا بھی تماشہ دیکھو

پہلے مصرع اور دوسرے مصرع کے صفا میں صنعتِ تجنیس بھی ہے۔ سعی چونکہ کوہ صفا اور مروہ کے درمیان کی جاتی ہے اس لیے پہلے مصرع کے صفا میں صنعتِ ایہام بھی ہے۔ اور سعی کی طرف اشارہ صنعتِ تلمیح ہے۔ اسی طرح مندرجہ بالا کئی اشعار میں دو دو صنعتیں ہیں۔

آیات اور احادیث

یوں تو مولانا کے اکثر اشعار میں قرآنی آیات کا مفہوم ہے۔ لیکن بعض اشعار میں آیات یا

احادیث کا صاف صاف حوالہ دیا ہے - یہ اشعار صنعتِ تلمیح کی قبیل سے ہیں اس لیے ایسے چند اشعار یہاں درج کرتا ہوں ؎

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے ترا ذکر ہے اونچا تیرا

لَاَمۡلَئَنَّ جَهَنَّمَ تھا وعدہ ازلی
نہ منکروں کو عبث بد عقیدہ ہونا تھا

اَنۡتَ فِيۡهِمۡ نے عدو کو بھی لیا دامن میں
عیش جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست

ایسا اُمی کس لیے منت کشِ استاد ہو
کیا کفایت اسکو اِقۡرَاۡ وَرَبُّكَ الۡاَكۡرَمُ نہیں

نبی سرورِ ہر رسول و ولی ہے
نبیٔ راز دارِ مَعَ اللّٰهِ لِيۡ ہے

ک گیسو، ہ دہن، ی ابرو، آنکھیں ع ص
كٓهٰيٰعٓصٓ ان کا ہے چہرہ نور کا

آخری شعر میں حروفِ مقطعات کی تشبیہات کتنی دل کش ہیں - پھر کہتے ہیں ؎

نہ عرش ایمن نہ اِنِّیۡ ذَاهِبٌ میں میہمانی ہے
نہ حرفِ اُدۡنُ یا احمد نصیب لَنۡ تَرَانِيۡ ہے

ان پر کتاب اتری تِبۡيَانًا لِكُلِّ شَيۡءٍ
تفصیل جس میں مَا عَبَرَ وَمَا غَبَرَ کی ہے

یعنی جو ہوا دفترِ تنزیل تمام
آخر میں ہوئی مہر کہ اَكۡمَلۡتُ لَكُمۡ

مژگاں کی صفیں چار ہیں دو ابرو ہیں
وَالۡفَجۡرِ کے پہلو میں لَيَالٍ عَشۡرٍ

یا طلیق الوجہ فی یوم عبوس قمطریر
یا بہیج القلب فی یوم الاسیٰ امداد کن

کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ اے آنکہ خلق　　در تو مستھلک تو در ذاتِ خدا امداد کن
مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ آقا آنچہ بر روئے زمیں است　　در تو فانی در تو گم بر تو فدا امداد کن

ذیل کے اشعار میں احادیث کے حوالے ہیں سے

مَنْ زَارَ تُرْبَتِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ　　اُن پہ درود جن سے نوید ان بشر کی ہے

دیکھنے والوں نے کچھ دیکھا نہ بھالا نور کا　　مَنْ رَاٰنِیْ یہ آئینہ کیسا دکھایا نور کا

کھلے کیا رازِ محبوب و محب مستانِ غفلت پر　　شرابِ قَدْ رَاَی الْحَقَّ زیبِ جامِ مَنْ رَاٰنِیْ ہے

مَنْ رَاٰنِیْ قَدْ رَاَی الْحَقَّ جو کہے　　کیا بیاں اس کی حقیقت کیجئے

معجزات

معجزات کے حوالے بھی صنعتِ تلمیح ہی کی قبیل سے ہیں۔ بیشتر اس سے کہ میں مولانا کے ان اشعار کی نشان دہی کروں جن میں کسی معجزے کی طرف اشارہ ہے۔ میں قارئین کو ان اشعار کا مطلب بآسانی سمجھانے کے لیے چند معجزات کا ذکر پیشگی کر دینا چاہتا ہوں۔ حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشت کے اشارہ سے چاند کو دو پارہ کر دیا۔ یہی معجزہ شق القمر ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت سارا گھر روشنی سے بھر گیا اور ستارے قریب ہو گئے۔ ابن جریر اور ابن منذر کی روایت کے مطابق جنگِ حُنین میں حضور نے مخالفین کے لشکر کی طرف اپنی مٹھی سے چند کنکریاں پھینکیں۔ وہ اتنی بڑھیں کہ وہ کنکریاں جس جس کو لگیں وہ ہلاک ہو گیا۔ باقی دشمن خوف زدہ ہو کر بھاگ گئے۔ حضرت جابر سے روایت ہے کہ جنگ حدیبیہ میں پانی ختم ہو گیا۔ صرف ایک لوٹے میں تھوڑا سا پانی تھا۔ حضور نے اس لوٹے میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ حضور کی تمام انگلیوں سے پانی فواروں کی طرح نکلنا شروع ہوا۔ تمام لشکر نے سیر ہو کر پیا۔ بخاری کی روایت کے مطابق حضور نے تمام اصحاب صُفّہ کو دودھ کے ایک پیالے سے سیر کر دیا۔ ایک موقع پر حضور حضرت علی کے زانو پر سر رکھ کر استراحت

فرما رہے تھے۔ اس طرح عصر کی نماز کا وقت گزر گیا۔ حضرت علی پاس ادب کے سبب خاموش رہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت علی کی نماز عصر قضا ہو گئی۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی تو آفتاب لوٹ آیا اور حضرت علی نے نماز عصر ادا کی۔ بعض لوگ غلطی سے رجعتِ آفتاب کو حضرت علی کا معجزہ کہتے ہیں۔
حضرت علی سے روایت ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر پھر رہا تھا۔ جو پہاڑی یا درخت سامنے آیا۔ اس نے کہا السلام علیکم یا نبی اللہ۔

ایک موقع پر آپ کوہِ اُحد پر چڑھے۔ حضرت صدیق۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان ہمراہ تھے۔ پہاڑ کانپنے لگا۔ آپ نے پہاڑ پر اپنی ایڑی مار کر فرمایا ٹھہر جا۔ تجھ پر صرف ایک نبی ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ پہاڑ ٹھہر گیا۔

مسلم کی روایت ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایک پتھر حضور کو سلام کرتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق ایک درخت حضور کے بلانے پر حضور کے پاس آیا۔ اسطوانہ حنانہ (چوب نالاں) حضور کی جدائی میں نالاں ہوا۔ آپ کی مٹھی میں کنکریاں کلام کرنے لگیں۔

ان چند معجزات کے ذکر کے بعد میں مولانا قدس سرہٗ کے مختلف اشعار پیش کرتا ہوں جن میں مختلف معجزات کا حوالہ ہے ؎

برقِ انگشتِ نبی چمکی تھی اس پر ایکبار آج تک ہے سینۂ مہ میں نشانِ سوختہ

جس نے ٹکڑے کیے ہیں قمر کے وہ ہے نورِ وحدت کا ٹکڑا ہمارا نبی

چاند شق ہو، پیڑ بولیں، جانور سجدہ کریں بارک اللہ مرجعِ عالم یہی سرکار ہے

سورج اُلٹے پاؤں پلٹے چاند اشارے سے ہو چاک اندھے نجدی دیکھ لے قدرت رسول اللہ کی

تیری مرضی پا گیا سورج پھرا الٹے قدم
تیری انگلی اٹھ گئی مہ کا کلیجہ چر گیا

چاند اشارے کا ہلا حکم کا باندھا سورج
واہ کیا بات شہا تیری توانائی کی

میں ترے ہاتھوں کے صدقے کیسی کنکریاں تھیں وہ
جن سے اتنے کافروں کا دفعۃً منہ پھر گیا

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

سنگ کرتے ہیں ادب سے تسلیم
پیڑ سجدے میں گرا کرتے ہیں

اُن پر درود جن کو حجر تک کریں سلام
ان کو سلام جن کو تحیّت شجر کی ہے

کیوں جنابِ بوہریرہ کیسا تھا وہ جامِ شیر
جس سے ستّر صاحبوں کا دودھ سے منہ پھر گیا

پنجۂ مہرِ عرب ہے جس سے دریا بہہ گئے
چشمۂ خورشید میں تو نام کو بھی نم نہیں

انگلیاں پائیں وہ پیاری پیاری جن سے دریائے کرم ہے جاری
جوش پر آتی ہے جب غم خواری تشنہ سیراب ہوا کرتے ہیں

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر
ندیاں پنجابِ رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

کفِ دریائے کرم میں ہیں رضا
پانچ فوّارے چھلکنے والے

ایک ٹھوکر میں احد کا زلزلہ جاتا رہا — رکھتی ہیں کتنا وقار اللہ اکبر ایڑیاں

صنعتِ واسع الشفتین

ذیل کی ساری نعت پڑھ جائیے۔ کسی شعر کے کسی لفظ پر ہونٹ سے ہونٹ نہیں ملے گا۔ نعت کے بعض اشعار میں صنعتِ ترصیع بھی ہے۔

سیدِ کونین سلطانِ جہاں — ظلِّ یزداں، شاہِ دیں عرش آشیاں

کُل سے اعلیٰ کُل سے ادنیٰ کُل کی جاں — کُل کے آقا، کُل کے ہادی، کُل کی شاں

دلکشا، دلکش، دل آرا، دل ستاں — کانِ جان و جانِ جان و شانِ شاں

ہر حکایت ہر کنایت ہر ادا — ہر اشارت دلنشین و دل ستاں

دل دے دل کو جانِ جاں کو نور دے — اے جہانِ جان و اے جانِ جہاں

آنکھ دے اور آنکھ کو دیدارِ نور — روح دے اور روح کو راحِ جناں

اللہ اللہ یاس اور ایسی آس سے — اور یہ حضرت یہ در یہ آستاں

تو ہو داتا اور اور دل سے رجا — تو ہو آقا اور یادِ دیگراں

تو ثنا کو ہے ثنا تیرے لیے — ہے ثنا تیری ہی دیگر داستاں

التجا اس شرک و شر سے دور رکھ — ہو رضا تیرا ہی غیر از این و آں

جس طرح ہونٹ اس غزل سے دور ہیں
دل سے یوں ہی دور ہو ہر ظن و ظاں

صنعتِ تجاہلِ عارفانہ

شاعر حقیقت کو بخوبی سمجھتا ہے لیکن بھولے پن سے سوال کرتا ہے ؎

جنت کو حرم سمجھا آتے تو یہاں آیا — اب تک کے ہر اک کا منہ کتا ہوں کہاں آیا

طیبہ سے ہم آتے ہیں کہئے تو جناں والو — کیا دیکھ کے جیتا ہے جو واں سے یہاں آیا

چھوڑ کے اُس حرم کو آپ بن میں ٹھگوں کے آ بسو — پھر کہو سر پہ دھر کے ہاتھ لٹ گئی سب کمائی کیوں

کس کی نگاہ کی حیا، پھرتی ہے میری آنکھ میں نرگسِ مستِ نازنے مجھ سے نظر چرائی کیوں

اس میں روضے کا سجدہ ہو کہ طواف ہوش میں جو نہ ہو، وہ کیا نہ کرے
عذرِ امیدِ عفو اگر نہ سنیں روسیاہ اور کیا بہانہ کرے
یہ وہی ہیں کہ بخش دیتے ہیں کون ان جرموں پر سزا نہ کرے

کس کے جلوے کی جھلک ہے، یہ اُجالا کیا ہے ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے

بے لبسی ہو جو مجھے پرسشِ احوال کے وقت دوستو کیا کہوں اس وقت تمنّا کیا ہے

گونج گونج اُٹھے ہیں نغماتِ رضاؔ سے بوستاں کیوں نہ ہو کس پھول کی مدحت میں وامنقار ہے

صنعتِ مسمّط

یہ صنعت عموماً لمبی بحر کے اشعار میں ہوتی ہے۔ ہر شعر میں تین تین ٹکڑے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ مولانا کی بحرِ طویل کی سب نعتوں میں یہ صنعت موجود ہے۔ میں یہاں نمونتہً صرف ایک نعت کے چند اشعار درج کرتا ہوں سے

وصفِ رخ ان کا کیا کرتے ہیں شرحِ والشمس وضحیٰ کرتے ہیں
اُن کی ہم مدح و ثنا کرتے ہیں، جن کو محمود کہا کرتے ہیں
ماہ شق گشتہ کی صورت دیکھو، کانپ کر مہر کی رجعت دیکھو
مصطفےٰ پیارے کی قدرت دیکھو، کیسے اعجاز ہوا کرتے ہیں
اپنے مولیٰ کی ہے بس شان عظیم، جانور بھی کریں جن کی تعظیم
سنگ کرتے ہیں ادب سے تسلیم، پیڑ سجدے میں گرا کرتے ہیں
رفعتِ ذکر ہے تیرا حصّہ دونوں عالم میں ہے تیرا چرچا
مرغِ فردوس پس از حمدِ خدا تیری ہی مدح و ثنا کرتے ہیں

کیوں نہ زیبا ہو تجھے تاجوری، تیرے ہی دم کی ہے سب جلوہ گری
ملک و جن و بشر، حور و پری، جان سب تجھ پہ فدا کرتے ہیں
اپنے دل کا ہے انہیں سے آرام، سونپے ہیں اپنے انہیں کو سب کام
لو لگی ہے کہ اب اس در کے غلام، چارۂ دردِ رضا کرتے ہیں

مستزاد مستزاد میں عموماً ہر شعر کے دونوں مصرعوں کے ساتھ مزید آدھے آدھے مصرع کا اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن مولانا نے ہر شعر کے صرف مصرع ثانی کے ساتھ آدھے آدھے مصرع کا اضافہ کیا ہے۔ اس طرح مستزاد کی ایک نئی طرز نکالی ہے۔ پھر اسی میں ایک قطعہ کہا ہے۔ جس میں اپنے دل کے کھو جانے کی کہانی نہایت پُرکیف انداز میں بیان کر کے اپنی قادر الکلامی اور مہارت فن کا ثبوت دیا ہے۔ بعض اشعار میں آیات آجانے سے صنعتِ تلمیح اور شعر میں تین تین ٹکڑے ہم قافیہ آنے سے صنعت مسمّط بھی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

وہی رب ہے جس نے تجھ کو ہمہ تن کرم بنایا
ہمیں بھیک مانگنے کو ترا آستاں بتایا ——— تجھے حمد ہے خدایا
تمہیں حاکمِ برایا، تمہیں قاسمِ عطایا
تمہیں دافعِ بلایا تمہیں شافعِ خطایا ——— کوئی تم سا کون آیا
وہ کنواری پاک مریم وہ نَفَخْتُ فِیْہِ کا دم
ہے عجب نشانِ اعظم مگر آمنہ کا جایا ——— وہی سب سے افضل آیا
یہی بولے سدرہ والے، چمن جہاں کے تھالے
سبھی میں نے چھان ڈالے، ترے پایہ کا نہ پایا ——— تجھے یک نے یک بنایا
فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، یہ ملا ہے تجھ کو منصب
جو گدا بنا چکے اب، اٹھو وقت بخشش آیا ——— کرو قسمت عطایا

ق

ارے اے خدا کے بندو کوئی میرے دل کو ڈھونڈو
مرے پاس تھا ابھی تو ابھی کیا ہوا خدایا ——— نہ کوئی گیا نہ آیا
ہمیں اے رضا ترے دل، کا پتہ چلا بمشکل
درِ روضہ کے مقابل، وہ ہمیں نظر تو آیا ——— یہ نہ پوچھ کیسا پایا
کبھی خندہ زیرِ لب ہے، کبھی نالہ ساری شب ہے
کبھی غم کبھی طرب ہے نہ سبب سمجھ میں آیا ——— نہ اسی نے کچھ بتایا
کبھی وہ تپک کہ آتش کبھی وہ ٹپک کہ بارش
کبھی وہ ہجومِ نالش، کوئی جانے ابر چھایا ——— بڑی جوششوں سے آیا
کبھی وہ چہک کہ بلبل، کبھی وہ مہک کہ خود گل
کبھی وہ لہک کہ بالکل چمن جناں کھلایا ——— گُلِ قدس لہلہایا
کبھی گم کبھی عیاں ہے، کبھی سرد کہ تپاں ہے
کبھی زیرِ لب فغاں ہے کبھی چپ کہ دم نہ تھا یا ——— رُخِ کارِ جاں دکھایا
یہ تصوراتِ باطل، ترے آگے کیا ہیں مشکل
تری قدرتیں ہیں کامل، انہیں راست کر خدایا ——— میں انہیں شفیع لایا

مشکل زمینیں مولانا نے بعض مشکل ترین زمینوں میں بھی کامیاب نعتیں کہی ہیں۔ مرزا غالب کی ایک غزل ہے:

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں ——— بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

مرزا کے بعد اس زمین میں کامیابی کے ساتھ قلم اٹھانا آسان بات نہیں۔ پھر ہر شعر میں ردیف "کہ یوں" کو کامیابی سے نباہنا نہایت مشکل ہے۔ جن لوگوں نے اس زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ وہ غالب سے بہتر غزل نہیں کہہ سکے۔ مثلاً پنڈت دِتا تریا کیفی دہلوی

جو ایک قدیم وضع کے نہایت قادر الکلام شاعر اور ادیب تھے اس زمین میں کہتے ہیں ؎

تم ہوئے مبتلا کہ غیر، یوں ہوئی ابتدا کہ یوں — کچھ تو کہو زبان سے یوں ہے یہ ماجرا کہ یوں

اِس سنگلاخ زمین میں اعلیٰ اور ارفع درجے کی نعت کہنا مولانا ہی کا کام تھا۔

اس نعت کے چند شعر پیش کرتا ہوں ؎

پوچھتے کیا ہو عرش پر، یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں — کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

کہتے ہیں انبیا کہ یوں، کہتے ہیں اولیا کہ یوں — حق ثنائے شہ وہی، ہے جو کہے خدا کہ یوں

میں نے کہا کہ جلوۂ اصل میں کس طرح سے گمیں — صبح نے نورِ مہر میں مٹ کے دکھا دیا کہ یوں

ہائے رے ذوقِ بے خودی، دل جو سنبھلنے سا لگا — چھک کے مہک میں پھول کی گرنے لگی صبا کہ یوں

دل کو دے نورِ داغِ عشق، پھر میں فدا دونیم کر — مانا ہے سُن کے شقِ ماہ، آنکھوں سے اب دکھا کہ یوں

دل کو ہے فکر کس طرح مردے جلاتے ہیں حضور — اے میں فدا لگا کر اک، ٹھوکر اسے بتا کہ یوں

مرزا غالب نے مقطع میں کہا تھا ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی — گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اور مولانا نے مقطع میں بجا طور پر فرمایا ؎

جو کہے شعر و پاسِ شرع، دونوں کا حسن کیونکر آئے — لا اُسے پیشِ جلوۂ زمزمۂ رضاؔ کہ یوں

مرزا غالب کی ایک اور غزل ہے ؎

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں — روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

زمین سنگلاخ بھی ہے اور کئی اساتذہ کے تخیل کی پامال کردہ ہے۔ تپش خورجوی نے اس زمین میں کہا ؎

پردۂ سازِ زندگی دردِ اجل اُٹھائے کیوں — زمزمۂ شکستِ غم کوئی ہمیں سنائے کیوں

مولانا نے اس زمین میں نہایت شستہ اور شگفتہ نعت کہی ہے۔ مطلع ہے ؎

پھر کے گلی گلی تباہ ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں — دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں

ورنہ مرزا نے تو کہہ دیا تھا۔ ع

جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

مولانا کا مطلعِ ثانی ہے ؎

رخصتِ قافلہ کا شورِ غش سے ہمیں اٹھائے کیوں — سوتے ہیں اسکے سائے میں کوئی ہمیں جگائے کیوں

مرزا نے کہا تھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں — موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مولانا فرماتے ہیں ؎

یادِ حضور کی قسم، غفلتِ عیش ہے ستم — خوب ہیں قیدِ غم میں ہم کوئی ہمیں چھڑائے کیوں

اس نعت کے چند اشعار اور سُن لیجئے ؎

جان ہے عشقِ مصطفےٰ روز فزوں کرے خدا — جس کو ہو درد کا مزہ، نازِ دوا اُٹھائے کیوں

اب تو نہ روک اے غنی، عادتِ سگ بگڑ گئی — میرے کریم پہلے ہی لقمۂ تر کھلائے کیوں

ان کے جلال کا اثر دل سے لگائے ہے قمر — جو کہ ہو لوٹ زخم پہ داغِ جگر مٹائے کیوں

شیخ ناسخ لکھنوی کی ایک غزل ہے ؎

چاک کرنے کی نہیں پاتا ہوں طاقت ہاتھ میں — ہے گریباں دیر سے اے جوشِ وحشت ہاتھ میں

صبح اُٹھ کر کیوں نہ دیکھوں ہاتھ جائے آئینہ — یہ صفائی ہے نظر آتی ہے صورت ہاتھ میں

ہاتھ اسکے چوم لیتا ہوں تو کیا کہتا ہے وہ — ہیں لکیریں یا کوئی لکھی ہے آیت ہاتھ میں

ہاتھ اُن کا ہاتھ میں جو لے لیا اس جرم میں — ہتھکڑی پہنی ہے میں نے ایک مدت ہاتھ میں

ارمغاں لے جاؤں ناسخ سوئے گلزارِ وطن
چُن لئے ہیں خار ہائے دشتِ غربت ہاتھ میں

مولانا نے اس زمین میں قافیہ بدل کر نعت کہی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں — سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

مالکِ کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں — دو جہاں کی نعمتیں ہیں اُن کے خالی ہاتھ میں

ہر خطِ کف ہے یہاں اے دستِ بیضائے کلیم — موجزن دریائے نورِ بے مثالی ہاتھ میں

دستگیرِ ہر دو عالم کر دیا سبطین کو — اے میں قرباں، جانِ جاں، انگشت کیا لی ہاتھ میں

آہ وہ عالم کہ آنکھیں بند اور لب پر درود — وقفِ سنگِ در جبیں، روضے کی جالی ہاتھ میں

جس نے بیعت کی بہارِ حسن پر قربان رہا ہیں لکیریں نقشِ تسخیرِ جمالی ہاتھ میں ؎
کاش ہو جاؤں لبِ کوثر میں یوں وارفتہ ہوش لے کے اس جانِ کرم کا ذیلِ عالی ہاتھ میں

استاد ذوق کا ایک مدحیہ قصیدہ ہے ؎

کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں پائے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسماں

مولانا نے آسمان کے بجائے فلک ردیف قرار دی اور قافیہ بدل کر مرصع نعت کہی حالانکہ ایسی مشکل اور خشک زمین میں نعتیہ شعر نکالنا بہت مشکل ہے۔ مولانا نے فرمایا ؎

تمہارے ذرے کے پرتو ستارہائے فلک تمہارے نعل کی ناقص مثل ضیائے فلک
اگرچہ چھالے ستاروں سے پڑ گئے لاکھوں مگر تمہاری طلب میں تھکے نہ پائے فلک
تمہاری یاد میں گزری تھی جاگتے شب بھر چلی نسیم ہوئے بند دیدہ ہائے فلک
مرے غنی نے جواہر سے بھر دیا دامن گیا جو کاسۂ مہ لے کے شب گدائے فلک
تجلیِ شبِ اسریٰ ابھی سمٹ نہ چکا کہ جب سے ویسے ہی کوتل ہیں سبزہائے فلک
یہ اہلِ بیت کی چکی سے چال سیکھی ہے رواں ہے بے مددِ دستِ آسیائے فلک

رضا یہ نعتِ نبی نے بلندیاں بخشیں
لقب زمینِ فلک کا ہوا سمائے فلک

مرزا غالب کی ایک غزل ہے ؎

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

مولانا نے پاؤں کے بجائے "ایڑیاں" کو ردیف قرار دیا۔ اور ایک دل افروز نعت کہہ دی، فرماتے ہیں ؎

عارضِ شمس و قمر سے بھی ہیں انور ایڑیاں عرش کی آنکھوں کے تارے ہیں وہ خوشتر ایڑیاں
دب کے زیرِ پا نہ گنجائش سمانے کی رہی بن گیا جلوہ کفِ پا کا ابھر کر ایڑیاں
ان کا منگتا پاؤں سے ٹھکرا دے وہ دنیا کا تاج جس کی خاطر مر گئے منعم رگڑ کر ایڑیاں
دو قمر، دو پنجۂ خور، دو ستارے، دس ہلال انکے تلوے، پنجے، ناخن پائے انور ایڑیاں
ہائے اس پتھر سے اس سینے کی قسمت پھوڑیے بے تکلف جسکے دل میں یوں کریں گھر ایڑیاں

ایک ٹھوکر میں اُحد کا زلزلہ جاتا رہا　　رکھتی ہیں کتنا وقار اللہ اکبر ایڑیاں

اے رضاؔ طوفانِ محشر کے تلاطم سے نہ ڈر
شاد ہو، ہیں کشتیٔ اُمت کو لنگر ایڑیاں

مولانا کی کئی اور نعتیں بھی مشکل زمینوں میں ہیں۔ جن سے آپ کی طباعی، قادرالکلامی اور مہارتِ فن کا ثبوت ملتا ہے۔ ایسی نعتوں کے تین تین چار چار اشعار ذیل میں نقل کرتا ہوں ؎

تھک کے بیٹھے تو درِ دل پہ تمنائیٔ دوست　　کون سے گھر کا اُجالا نہیں زیبائیٔ دوست
مہرکس منہ سے جلوداریٔ جاناں کرتا　　سایۂ کے نام سے بیزار ہے یکتائیٔ دوست
کعبہ و عرش میں کہرام ہے ناکامی کا　　آہ کس بزم میں ہے جلوۂ یکتائیٔ دوست
حسن بے پردہ کے پردے نے مٹا رکھا ہے　　ڈھونڈنے جائیں کہاں جلوۂ ہرجائیٔ دوست
مرنے والوں کو یہاں ملتی ہے عمرِ جاوید　　زندہ چھوڑے گی کسی کو نہ مسیحائیٔ دوست

نارِ دوزخ کو چمن کر دے بہارِ عارض　　ظلمتِ حشر کو دن کر دے نہارِ عارض
جیسے قرآں ہے وِرد اس گلِ محبوبی کا　　یوں ہی قرآں کا وظیفہ ہے وقارِ عارض
مشکبو زلف سے رخ، چہرہ سے بالوں میں شعاع　　معجزہ ہے حلبِ زلف و تتارِ عارض
حق نے بخشا ہے کرم، نذرِ گدایاں ہو قبول　　پیارے اک دل ہے وہ کرتے ہیں نثارِ عارض

غمگیں ہے شوقِ غازۂ خاکِ مدینہ میں　　شبنم سے دُھل سکے گی نہ گردِ ملالِ گل
رنگِ مژہ سے کر کے خجل یادِ شاہ میں　　کھینچا ہے ہم نے کانٹوں پہ عطرِ جمالِ گل
دیکھا تھا خوابِ خارِ حرم عندلیب نے　　کھٹکا کیا ہے آنکھ میں شب بھر خیالِ گل

مشک سا زلفِ شہ و نور فشاں روئے حضور　　اللہ اللہ حَلَبِ جیب و تتارِ دامن
اشک کہتے ہیں یہ شیدائی کی آنکھیں دھو کر　　اے ادب گردِ نظر ہو نہ غبارِ دامن

دل شدۂ دل کا ہوا یہ دامنِ اطہر پہ ہجوم | بیدل آباد ہوا نامِ دیارِ دامن
اے رضاؔ آہ وہ بلبل کہ نظر میں جس کی | جلوۂ جیبِ گل آئے نہ بہارِ دامن

رونقِ بزمِ جہاں ہیں عاشقانِ سوختہ | کہہ رہی ہے شمع کی گویا زبانِ سوختہ
ماہِ من یہ نیرِ محشر کی گرمی تابکے | آتشِ عصیاں میں خود جلتی ہے جانِ سوختہ
برقِ انگشتِ نبی چمکی تھی اس پر ایک بار | آج تک ہے سینۂ مہ میں نشانِ سوختہ
بہرِ حق اے ابرِ رحمت اک نگاہِ لطف بار | تابکے بے آب تڑپیں ماہیانِ سوختہ

اے رضاؔ مضمون سوزِ دل کی رفعت نے کیا
اس زمینِ سوختہ کو آسمانِ سوختہ

مسلسل نعت

مولانا نے مسلسل غزل کی طرح مسلسل نعتیں بھی لکھی ہیں۔ اور کہیں کہیں نعت میں قطعہ بھی کہا۔ جیسا مستزاد میں نعتیہ اشعار کے علاوہ قطعہ بھی کہا ہے۔ وہ بھی مسلسل نعت ہی کا قائم مقام ہے۔ ایک نعت میں نفس سے خطاب کرتے ہوئے قطعہ کہا ہے ؎

ایماں پہ موت بہتر اے نفس | تیری ناپاک زندگی سے
گر مرے پیارے، پیالے اے دوست | گزرا میں تیری دوستی سے
تجھ سے جو اٹھائے میں نے صدمے | ایسے نہ ملے کبھی کسی سے
اف رے خود کام بے مروت | پڑتا ہے کام آدمی سے
تو نے ہی کیا خدا سے نادم | تو نے ہی کیا خجل نبی سے
آتی نہ تھی جب بدی بھی تجھ کو | ہم جانتے ہیں تجھے جبھی سے

پھر ایک نعت میں روضۂ اطہر کی شان میں قطعہ رقم فرمایا ہے ؎

یہ گھر یہ در ہے اس کا جو گھر در سے پاک ہے | مژدہ ہو بے گھرو کہ صلا اچھے گھر کی ہے
محبوبِ ربِّ عرش ہے اس سبز قبہ میں | پہلو میں جلوہ گاہ عتیق و عمر کی ہے

چھائے ملائکہ ہیں لگاتار ہے درود — بدلے ہیں پہرے، بدلی میں بارش دُرر کی ہے
سعدین کا قِران ہے پہلوئے ماہ میں — جھُرمٹ کئے ہیں تارے تجلّی قمر کی ہے
ستّر ہزار صبح ہیں ستّر ہزار شام — یوں بندگیٔ زلف و رُخ آٹھوں پہر کی ہے
جو ایک بار آئے دوبارہ نہ آئیں گے — رخصت ہی بارگاہ میں بس اس قدر کی ہے

نعت میں قطعہ بند اشعار کا ایک اور نمونہ دیکھئے ؎

ہائے رے نیند مسافر تیری — کوچ تیار ہے کیا ہونا ہے
دور جانا ہے رہا دن تھوڑا — راہ دشوار ہے کیا ہونا ہے
گھر بھی جانا ہے مسافر کہ نہیں — مَت پہ کیا مار ہے کیا ہونا ہے
پار جانا ہے نہیں ملتی ناؤ — زور پر دھار ہے کیا ہونا ہے
راہ تو تیغ پر اور تلووں کو — گلۂ خار ہے کیا ہونا ہے
بیچ میں آگ کا دریا حائل — قصد اس پار ہے کیا ہونا ہے
لے وہ حاکم کے سپاہی آئے — صبح اظہار ہے کیا ہونا ہے
واں نہیں بات بنانے کی مجال — چارہ اقرار ہے کیا ہونا ہے

ایک نعت میں ایک اور پُر درد قطعہ کہا ہے جس میں اپنی بخشش کی کہانی پوری تفصیل سے بیان کی ہے جو اعلیٰ حضرت کی قادر الکلامی اور زبان و بیان پر قابو کا پورا ثبوت ہے۔ فرماتے ہیں ؎

کاش فریاد مری سن کے یہ فرمائیں حضور — ہاں کوئی دیکھیے یہ کیا شور ہے غوغا کیا ہے
کون آفت زدہ ہے کس پہ بلا ٹوٹی ہے — کس مصیبت میں گرفتار ہے صدمہ کیا ہے
کس سے کہتا ہے کہ للہ خبر لیجیے مری — کیوں ہے بے تاب یہ بے چینی کا رونا کیا ہے
یوں ملائکہ کریں معروض کہ اک مجرم ہے — اس سے پرسش ہے بتا تو نے کیا کیا کیا ہے
سامنا قہر کا ہے دفترِ اعمال ہے پیش — ڈر رہا ہے کہ خدا حکم سناتا کیا ہے
آپ سے کرتا ہے فریاد کہ یا شاہِ رسل — بندہ بے کس ہے شہا رحم میں وقفہ کیا ہے

سُن کے یہ عرض مری بحرِ کرم جوش میں آئے
یوں ملائک کو ہو ارشاد ٹھہرنا کیا ہے
کس کو تم موردِ آفات کیا چاہتے ہو
ہم بھی تو آ کے ذرا دیکھیں تماشا کیا ہے
ان کی آواز پہ کر اٹھوں میں بے ساختہ شور
اور تڑپ کر یہ کہوں اب مجھے پروا کیا ہے
پھر مجھے دامنِ اقدس میں چھپالیں سرور
اور فرمائیں ہٹو! اس پہ تقاضا کیا ہے

چھوٹی زمینیں

چھوٹی زمینوں میں دل نشیں اشعار کہنا بہت مشّاق شاعر کا کام ہے۔ اس میں زبان بہت آسان اختیار کرنی پڑتی ہے۔ شعر ایسے ہوتے ہیں جیسے باتیں کرتے ہیں۔ مثلاً استاد ذوق چھوٹی زمین میں کہتے ہیں ؎

عہدِ پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
مہ جبیں یاد ہیں کہ بھول گئیں
وہ شبِ ماہتاب کی باتیں

میر تقی میرؔ ایک چھوٹی زمین میں کہتے ہیں ؎

جو اس شور سے میرؔ روتا رہیگا
تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں
مجھے ابر ہر سال روتا رہے گا
تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے
ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا

مرزا غالبؔ نے بھی جو ایک مشکل گو شاعر ہیں چھوٹی زمین میں کتنی سہل زبان اختیار کی ہے۔ کہتے ہیں ؎

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مولانا احمد رضا خاں نے چھوٹی زمینوں میں نہایت آسان زبان میں کامیاب نعتیں کہی ہیں۔ میں نمونے کے طور پر ان کی چند نعتیں جو چھوٹی زمینوں میں ہیں نقل کرتا ہوں ؎

(۱)

غم ہو گئے بے شمار آقا
بندہ تیرے نثار آقا

بگڑا جاتا ہے کھیل میرا
آقا آقا سنوار آقا

مجبور ہیں ہم تو فکر کیا ہے
تم کو تو ہے اختیار آقا

گرداب میں پڑ گئی ہے کشتی
ڈوبا ڈوبا اتار آقا

---

(۲)

عاصیو تھام لو دامن اُن کا
وہ نہیں ہاتھ جھٹکنے والے

ابر رحمت کے سلامی رہنا
پھلتے ہیں پودے لچکنے والے

دیکھ او زخم دل آپے کو سنبھال
پھوٹ بہتے ہیں ٹپکنے والے

ارے یہ جلوہ گہِ جاناں ہے
کچھ ادب بھی ہے پھڑکنے والے

---

(۳)

دل کو اُن سے خدا جدا نہ کرے
بے کسی لوٹ لے خدا نہ کرے

دل کہاں لے چلا حرم سے مجھے
ارے تیرا بُرا، خدا نہ کرے

سب طبیبوں نے دے دیا ہے جواب
آہ عیسیٰ اگر دوا نہ کرے

---

(۴)

لطف اُن کا عام ہو ہی جائے گا
شاد ہر ناکام ہو ہی جائیگا

بے نشانوں کا نشاں مٹتا نہیں
مٹتے مٹتے نام ہو ہی جائیگا

غم تو اُن کا بھول کر لپٹا ہے یوں
جیسے اپنا کام ہو ہی جائیگا

اے رضاؔ ہر کام کا اک وقت ہے
دل کو بھی آرام ہو ہی جائیگا

(۵)

زہے عزت و اعتلائے محمد — کہ ہے عرشِ حق زیرِ پائے محمد

عجب کیا اگر رحم فرمائے ہم پر — خدائے محمد برائے محمد

محمد برائے جنابِ الٰہی — جنابِ الٰہی برائے محمد

خدا اُنکو کس پیار سے دیکھتا ہے — جو آنکھیں ہیں محوِ لقائے محمد

جلو میں اجابت خواصی میں رحمت — بڑھی کس تزک سے دعائے محمد

---

(۶)

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے — مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

میں مجرم ہوں آقا مجھے ساتھ لے لو — کہ رستے میں ہیں جا بجا تھانے والے

حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا — ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

اب آئی شفاعت کی ساعت اب آئی — ذرا چین لے میرے گھبرانے والے

---

(۷)

آنکھیں رو رو کے سُجانے والے — جانے والے نہیں آنے والے

ذبح ہوتے ہیں وطن سے بچھڑے — دیس کیوں گاتے ہیں گانے والے

پھر نہ کروٹ لی مدینے کی طرف — ارے چل جھوٹے بہانے والے

حُسن تیرا سا نہ دیکھا نہ سُنا — کہتے ہیں سارے زمانے والے

کیوں رضا آج گلی سُونی ہے — اُٹھ مرے دھوم مچانے والے

---

(۸)

حرزِ جاں ذکرِ شفاعت کیجئے — نار سے بچنے کی صورت کیجئے

ان کے حسنِ بالماحت پر نثار — شیرۂ جاں کی حلاوت کیجئے
حیِّ باقی جس کی کرتا ہے ثنا — مرتے دم تک اسکی مدحت کیجئے
آنکھ تو اُٹھتی نہیں، دیں کیا جواب — ہم پہ بے پرسش ہی رحمت کیجئے
آپ ہم سے بڑھ کر ہم پر مہرباں — ہم کریں جرم آپ رحمت کیجئے

---

(۹)

مصطفٰے خیرالوریٰ ہو — سرورِ ہر دوسرا ہو
کس کے پھر ہو کر رہیں ہم — گر تمہیں ہم کو نہ چاہو
ہم وہی ننگِ جفا ہیں — تم وہی جانِ وفا ہو
تم کو غم سے کیا تعلق — بے کسوں کے غم زدا ہو
سب سے اول سب سے آخر — ابتدا ہو، انتہا ہو
وہ کلس روضے کا چمکا — سر جھکاؤ کج کلا ہو!

چھوٹی زمین میں بھی ایک مسلسل نعت کہی ہے۔ چند شعر حاضر ہیں ؎

انبیاء کو بھی اجل آنی ہے — مگر ایسی کہ فقط آنی ہے
پھر اُسی آن کے بعد ان کی حیات — مثلِ سابق وہی جسمانی ہے
روح تو سب کی ہے زندہ اُن کا — جسمِ پر نور بھی روحانی ہے
اوروں کی روح ہو کتنی ہی لطیف — ان کے اجسام کی کب ثانی ہے
پاؤں جس خاک پہ رکھ دیں وہ بھی — پاک ہے، روح ہے، نورانی ہے
اُن کے ازواج کو جائز ہے نکاح — اُس کا ترکہ بٹے جو فانی ہے

یہ ہیں حیِّ ابدی اُن کو رضا
صدقِ وعدہ کی قضا مانی ہے

شفاعت و رحمت

شاعر حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والاصفات سے بے پناہ عقیدت و محبت رکھنے کی وجہ سے نعت کہتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد کوئی مادی صلہ نہیں ہوتا۔ بلکہ نعت گوئی سے جو اسے روحانی حظ حاصل ہوتا ہے، وہ بھی صلہ ہے جو نقد حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ نعت کے صلے میں عفوِ معاصی اور حضور کی شفاعت و شفقت اور رحمت کی توقع رکھتا ہے۔ نعت گو شعرا نے شفاعت و رحمت کی صفت و ثنا میں بہت بلند خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب نے بھی شفاعت و رحمت اور شفقت و رافت کو بہت سراہا ہے۔ انہوں نے شفاعت کے موضوع پر ایک پوری نعت بھی لکھی ہے۔ جس کے بعض اشعار یوں ہیں ؎

پیشِ حق مژدہ شفاعت کا سناتے جائینگے — آپ روتے جائیں گے ہم کو ہنساتے جائینگے

کشتگانِ گرمیٔ محشر کو وہ جانِ مسیح — آج دامن کی ہوا دے کر جلاتے جائینگے

آج عیدِ عاشقاں ہے گر خدا چاہے کہ وہ — ابروِ پیوستہ کا عالم دکھاتے جائیں گے

کچھ خبر بھی ہے فقیرو آج وہ دن ہے کہ وہ — نعمتِ خلد اپنے صدقے میں لٹاتے جائینگے

لو وہ آئے مسکراتے ہم اسیروں کی طرف — خرمنِ عصیاں پہ اب بجلی گراتے جائینگے

پائے کوباں پل سے گزرینگے تیری آواز پر — رَبِّ سَلِّم کی صدا پر وجد لاتے جائینگے

خاک ہو جائیں عدو جل کر مگر ہم تو رضاؔ
دم میں جب تک دم ہے ذکر انکا سناتے جائینگے

مولانا نے مختلف نعتوں میں شفاعت کا مضمون مختلف انداز میں بیان کیا ہے ذیل میں چند ایسے اشعار نقل کرتا ہوں جن میں شفاعت کے مختلف پہلو بے نقاب کئے گئے ہیں ؎

گر لبِ پاک سے اقرارِ شفاعت ہو جائے — یوں نہ بے چین رکھے جوششِ عصیاں ہم کو

مَنْ زَارَ تُرْبَتِیْ وَجَبَتْ لَہٗ شَفَاعَتِیْ — ان پر درود جن سے نوید ان بشریٰ کی ہے

عرش سے مژدۂ بلقیسِ شفاعت لایا
طائرِ سدرہ نشیں مرغِ سلیمانِ عرب

حق شفاعت سے تیری گنہگاروں پر
مہرباں مہرباں مہرباں ہو گیا

آمد شہ کی خبر سُن کے یہ بولے عاصی
وہ ہیں آمادہ شفاعت کو تو عصیاں کس کا

اب تو لائی ہے شفاعت عفو پر
بڑھتے بڑھتے عام ہو ہی جائے گا

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گنہ پرہیز گاری واہ واہ
عرض بیگی ہے شفاعت عفو کی سرکار میں
چھنٹ رہی مجرموں کی فرد ساری واہ واہ

ادھر امت کی حسرت پر ادھر خالق کی رحمت پر
نرالا طور ہوگا گردشِ چشمِ شفاعت کا

یہ کیسے کھلتا کہ اُس کے سوا شفیع نہیں
عبث نہ اوروں کے آگے تپیدہ ہونا تھا

مرے کریم گنہ زہر ہے مگر آخر
کوئی تو شہدِ شفاعت چشیدہ ہونا تھا

دعوےٰ ہے سب سے تیری شفاعت پہ بیشتر
دفتر میں عاصیوں کے شہا انتخاب ہوں

رحمت کے باب میں شعرا نے بہت دلفریب اور پُر زور اشعار کہے ہیں اور طرح طرح کے مضمون نکالے ہیں۔ امیر مینائی کہتا ہے ؎

وہ کرشمے شانِ رحمت نے دکھائے روزِ حشر
چیخ اٹھا ہر بے گنہ میں بھی گنہگاروں میں ہوں
بے گناہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگاروں میں ہوں

میر انیس کہتے ہیں ؎

صحرا صحرا ہیں گرچہ عصیاں میرے دریا دریا مگر ہے رحمت تیری

برکت علی لائق نے کہا ہے ؎

نہیں حساب تری بے حساب رحمت کا گناہ اس لیے ہم بے شمار کرتے ہیں

فیاض ہریانوی کہتے ہیں ؎

زاہد نہ کہہ یہ رند سے بخشا نہ جائے گا رتبہ گھٹے گا رحمتِ پروردگار کا

گرامی جالندھری نے کہا ہے ؎

عصیانِ ما و رحمتِ پروردگارِ ما ایں را نہایتیست نہ آں را نہایتیست

مولانا احمد رضا خان صاحب نے رحمت کے جوشِ ترحم اور بخشش و کرم کی مدح و ستائش میں بہت سے گہرِ آبدار برسائے ہیں۔ اور عروسِ رحمت کے جلووں کو حسنِ ادا سے بے نقاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مجرموں کو ڈھونڈتی پھرتی ہے رحمت کی گھٹا طالع برگشتہ تیری سازگاری واہ واہ

صدقے رحمت کے کہاں پھول کہاں خار کا کام خود ہے دامن کشِ بلبل گلِ خندانِ عرب

رضائے خستہ جوشِ بحرِ عصیاں سے نہ گھبرانا کبھی تو ہاتھ آ جائیگا دامن اُنکی رحمت کا

ڈر تھا کہ عصیاں کی سزا اب ہوگی یا روزِ جزا دی انکی رحمت نے صدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

آنکھ تو اُٹھتی نہیں دیں کیا جواب ہم پہ بے پرسش ہی رحمت کیجئے

مچلا ہے کہ رحمت نے امید بندھائی ہے کیا بات تری مجرم کیا بات بنائی ہے

ترا نخلِ مبارک گلبنِ رحمت کی ڈالی ہے
اسے بو کر ترے رب نے بنا رحمت کی ڈالی ہے

گر یونہی رحمت کی تاویلیں رہیں
مدح ہر الزام ہو ہی جائے گا

جلو میں اجابت، خواصی میں رحمت
بڑھی کس تزک سے دعائے محمد

اپنی رحمت کی طرف دیکھیں حضور
جانتے ہیں جیسے ہیں بدکار ہم

سرکار ہم کمینوں کے اطوار پر نہ جائیں
آقا حضور اپنے کرم پر نظر کریں

جب آ گئی ہیں جوشِ رحمت پہ انکی آنکھیں
جلتے بجھا دئے ہیں، روتے ہنسا دئے ہیں

یارب اک ساعت میں دھل جائیں گنہگاروں کے جرم
جوش پر آ جائے اب رحمت رسول اللہ کی

ہے طوقِ الم سے اب آزاد ہو اے قمری
چٹھی لئے بخشش کی وہ سروِ رواں آیا

دفورِ شانِ رحمت کے سبب جرأت ہے اے پیارے
نہ رکھ بہرِ خدا شرمندہ عرضِ بے تامل کو

معراج

نعتیہ مضامین میں معراج بھی ایک موضوع ہے ۔ جس پر نعت گو شعراء نے نئے نئے اسلوب سے اظہارِ خیال کیا ہے ۔ اور خوب دادِ سخن دی ہے ۔ آغا حشر کاشمیری موجِ زمزم میں کہتا ہے ؎

کس قدر نظارہ پرور جلوۂ معراج تھا　　آج تک شوقِ نقابِ چشمِ انجم باز ہے
ہے دلِ جبریل شوقِ ہم عنانی کا شہید　　دامنِ زخمِ تمنا جادۂ پرواز ہے

مولانا نے معراج پر ایک طویل قصیدہ کہا ہے ۔ جس میں معراج کا پورا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے ۔ معراج نامے بہت سے شعرا نے لکھے ہیں اور معراج سے متعلق جستہ جستہ اشعار تو ہر نعت گو شاعر کے کلام میں پائے جاتے ہیں لیکن مولانا نے جسے وہ شادیٔ تہنیتِ اسریٰ سے موسوم کرتے ہیں معراج کی روداد نہایت دلکش شاعرانہ انداز میں بیان کی ہے ۔ کل ۶۷ اشعار ہیں ۔ اس کے علاوہ مولانا نے عام نعتوں میں بھی معراج کے موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے ۔ معراج کی کہانی وہی شاعر کامیابی سے بیان کر سکتا ہے جسے واقعات نگاری میں مہارت حاصل ہو ۔ چونکہ مولانا شعر پر پوری قدرت رکھتے ہیں ، اس لیے انہوں نے اپنے کلام میں معراج کی تمام جزئیات بہ حسن و خوبی بیان کی ہیں ۔ ایک نعت میں فرماتے ہیں ؎

وہ جنتی جلد سیرِ لامکاں کر کے ہوئے واپس　　کہ تھی زنجیر در جنبش میں اور گرمی تھی بستر میں

پھر فرماتے ہیں ؎

زبانِ فلسفی سے امنِ خرق و التیام اسریٰ　　پناہِ دورِ رحمت ہائے یک ساعت تسلسل کر

کہتی تھی یہ براق کو اس کی سبک روی — یوں جائیے کہ گردِ سفر کو خبر نہ ہو

عرش جس خوبیٔ رفتار کا پامال ہوا — دو قدم چل کے دکھا سروِ خراماں ہم کو

شبِ اسرا قمر حیرت زدہ پھرتا رہا شب بھر — بھلایا ڈھنگ ان کی چال نے سیرِ منازل کا

بڑھا اس درجہ رعبِ حسنِ والالیلۃ الاسریٰ — سمٹ کر بن گیا چرخ ایک پایہ انکے محمل کا

اسریٰ میں گذرے جس دم بیڑے یہ قدسیوں کے — ہونے لگی سلامی پرچم جھکا دئے ہیں

نہ حجاب چرخ و مسیح پر نہ کلیم و طور نہاں مگر — جو گیا ہے عرش سے بھی اُدھر وہ عرب کا ناقہ سوار ہے

مولانا کا قصیدۂ شادیٔ اسریٰ اُردو کے نعتیہ ادب میں لاجواب ہے۔ اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نوشہ اور قدسیوں کو براتی قرار دیا ہے۔ اس برات کے خیر مقدم کے لیے قدسیوں نے آسمان و زمین کو آراستہ کیا۔ آسمان کی آرائش و زیبائش کی عکاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

وہ سرورِ کشورِ رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے — نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کیلئے تھے

بہار کو شادیاں مبارک، چمن کو آبادیاں مبارک — ملک فلک اپنی اپنی لے میں، یہ گھر عنادل کا بولتے تھے

وہاں فلک پر یہاں زمیں پر، رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں — اُدھر سے انوار ہنستے آئے، ادھر سے نفحات اُٹھ رہے تھے

دولہا کی یہ کیفیت تھی ؎

یہ چھوٹ پڑتی تھی اُن کے رخ کی، کہ عرش تک چاندنی تھی چھٹکی
وہ رات کیا جگمگا رہی تھی، جگہ جگہ نصب آئنے تھے

زمین پر خانۂ کعبہ کو بھی دولہن کی طرح آراستہ کیا جا رہا تھا ؎

نئی دولہن کی پھبن میں کعبہ نکھر کے سنورا سنور کے نکھرا کہ

حجر کے صدقے، کمر کے اک تل میں رنگ لاکھوں بناؤ کے تھے

نظر میں دولہا کے پیارے جلوے حیا سے محراب سر جھکائے

سیاہ پردے کے منہ پہ آنچل، تجلیٔ ذاتِ بحت کے تھے

خوشی کے بادل اُمنڈ کے آئے، دلوں کے طاؤس رنگ لائے

وہ نغمۂ نعت کا سماں تھا حرم کو خود وجد آ رہے تھے

یہ جھوما میزابِ زر کا جھومر، کہ آ رہا کان پر ڈھلک کر

پھوہار برسی تو موتی جھڑ کر حطیم کی گود میں بھرے تھے

دُلھن کی خوشبو سے مست کپڑے نسیم گستاخ آنچلوں سے

غلافِ مشکیں جو اڑ رہا تھا، غزال نافے بسا رہے تھے

خانۂ کعبہ کے آس پاس جو پہاڑیاں (صفا و مروہ) ہیں شادیٔ اسرا کی خوشی

میں انہیں بھی آراستہ کیا جا رہا تھا ؎

پہاڑیوں کا وہ حُسنِ تزئیں، وہ اونچی چوٹی وہ ناز و تمکیں

صبا سے سبزے میں لہریں آئیں دوپٹے دھانی چنے ہوئے تھے

نہا کے نہروں نے وہ دمکتا لباس آبِ رواں کا پہنا

کہ موجیں چھڑیاں تھیں دھار لچکا، حبابِ تاباں کے تھل ٹکے تھے

پرانا پُر داغ، ملگجا تھا، اُٹھا دیا فرش چاندنی کا

ہجومِ تارِ نگہ سے کوسوں قدم قدم فرش بادلے تھے

غبار بن کر نثار جائیں، کہاں اب اس رہگزر کو پائیں

ہمارے دل، حوریوں کی آنکھیں، فرشتوں کے پر جہاں بچھے تھے

حضور کو دولہا بنایا جا رہا تھا۔ چاند، سورج اور ستارے صدقے میں

نور حاصل کر رہے تھے ؎

خدا ہی دے صبر جانِ پُر غم، دکھاؤں کیونکر تجھے وہ عالم

جب اُن کو جھرمٹ میں لے کے قدسی جناں کا دولہا بنا رہے تھے

اتار کر ان کے رخ کا صدقہ، یہ نور کا بٹ رہا تھا باڑا
کہ چاند سورج مچل مچل کر جبیں کی خیرات مانگتے تھے
وہی تو اب تک چمک رہا ہے، وہی تو جوبن ٹپک رہا ہے
نہانے میں جو گرا تھا پانی کٹورے تاروں نے بھر لئے تھے
بچا جو تلووں کا ان کے دھوون، بنا وہ جنت کا رنگ و روغن
جنہوں نے دولھا کی پائی اترن وہ پھول گلزارِ نور کے تھے
خبر یہ تحویلِ مہر کی تھی، کہ رُت سہانی گھڑی پھرے گی
وہاں کی پوشاک زیبِ تن کی یہاں کا جوڑا بڑھا رہے تھے
تجلّیِ حق کا سہرا سر پر، صلوٰۃ و تسلیم کی نچھاور
دو رویہ قدسی پرے جمائے کھڑے سلامی کے واسطے تھے
جو ہم بھی واں ہوتے خاکِ گلشن، لپٹ کے قدموں سے لیتے اُترن
مگر کریں کیا نصیب میں تو یہ نامرادی کے دن لکھے تھے
حضور صلی اللہ علیہ وسلم نوشہ بن کر براق پر سوار ہوتے ہیں۔ سلامی کی نرالی توپیں داغی جا رہی ہیں اور سواری جانب منزل رواں ہو رہی ہے ؎
ابھی نہ آئے تھے پشتِ زیں تک، کہ سر ہوئی مغفرت کی شلک
صدا شفاعت نے دی مبارک گناہ مستانہ جھومتے تھے
عجب نہ تھا رخش کا چمکنا، غزالِ رم خوردہ کا بھڑکنا
شعاعیں بکے اڑا رہی تھیں، تڑپتے آنکھوں پہ صاعقے تھے
ہجوم امید ہے گھٹاؤ، مرادیں دے کر انہیں ہٹاؤ
ادب کی باگیں لئے بڑھاؤ ملائکہ میں یہ غلغلے تھے
اثنائے راہ میں جو کیفیتیں تھیں، اُن کی عکاسی دلفریب شاعرانہ انداز میں کی ہے فرماتے ہیں ؎
اُٹھی جو گردِ رہِ منوّر، وہ نور برسا کہ راستے بھر
گھرے تھے بادل، بھرے تھے جل تھل امنڈ کے جنگل ابل رہے تھے

ستم کیا کیسی مت کٹی تھی، قمر وہ خاک ان کی رہ گزر کی
اٹھا نہ لایا کہ ملتے ملتے یہ داغ سب دیکھتا مٹے تھے

براق کے نقشِ سُم کے صدقے وہ گُل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن، مہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے

مسجدِ اقصیٰ میں حضور کی امامت میں انبیائے سلف نے نماز ادا کی ؎

نمازِ اقصیٰ میں تھا یہی سر، عیاں ہو معنئِ اول آخر
کہ دست بستہ ہیں پیچھے حاضر جو سلطنت آگے کر گئے تھے

حضور کے خیر مقدم میں ساکنانِ فلک کی کیفیت ؎

یہ اُن کی آمد کا دبدبہ تھا نکھار ہر شے کا ہو رہا تھا
نجوم و افلاک جام و مینا اجالتے تھے کھنگالتے تھے

نقاب اُلٹے وہ مہرِ انور، جلالِ رخسار گرمیوں پر
فلک کو ہیبت سے تپ چڑھی تھی تپکتے انجم کے آبلے تھے

یہ جوششِ نور کا اثر تھا کہ آبِ گوہر کمر کمر تھا
صفائے رہ سے پھسل پھسل کر ستارے قدموں میں لوٹتے تھے

بڑھا یہ لہرا کے بحرِ وحدت کہ دھل گیا نامِ ریگِ کثرت
فلک کے ٹیلوں کی کیا حقیقت یہ عرش و کرسی دو بلبلے تھے

وہ ظلِ رحمت وہ رُخ کے جلوے کہ تارے چھپتے نہ کھلنے پاتے
سنہری زربفت اودی اطلس یہ تھان سب دھوپ چھاؤں کے تھے

آنکھ جھپکنے میں برات آسمانوں سے گزر گئی۔ روح الامیں بھی تھک کر رہ گئے ؎

چلا وہ سروِ چماں خراماں نہ رک سکا سدرہ سے بھی داماں
پلک جھپکتی رہی وہ کب کے، سب این و آں سے گزر چکے تھے

جھلک سی اک قدسیوں پہ آئی، ہوا بھی دامن کی پھر نہ پائی
سواری دولھا کی دور پہنچی برات میں ہوش ہی گئے تھے

تھکے تھے روح الامیں کے بازو، چھٹا وہ دامن کہاں وہ پہلو
رکاب چھوٹی، اُمید ٹوٹی، نگاہ حسرت کے ولولے تھے

اس سفر کی کیفیت بیان کرنے میں عقل و خرد اور وہم و گمان عاجز ہیں ؎

روش کی گرمی کو جس نے سوچا دماغ میں اک بھبوکا پھوٹا
خرد کے جنگل میں پھول چمکا، دہر دہر پیڑ جل رہے تھے

جلو میں جو مرغِ عقل اڑے تھے، عجب برے حالوں گرتے پڑتے
وہ سدرہ ہی پر رہے تھے تھک کر چڑھا تھا دم تیور ا گئے تھے
قوی تھے مرغانِ وہم کے پَر، اڑے تو اڑنے کو اور دم بھر
اٹھائی سینے کی ایسی ٹھوکر کہ خونِ اندیشہ تھوکتے تھے

حضور عرش پر تشریف فرما ہوئے ؎
سنا یہ اتنے میں عرشِ حق نے کہ لے مبارک ہوں تاج والے
وہی قدم خیر سے پھر آئے جو پہلے تاجِ شرف ترے تھے
یہ سُن کے بے خود پکار اُٹھا، نثار جاؤں کہاں ہیں آقا
پھر ان کے تلووں کا پاؤں بوسہ یہ میری آنکھوں کے دن پھرے تھے

حضور کی آمد پہ عرشِ بریں کی حالت ؎
جھکا تھا مجرے کو عرشِ اعلیٰ، گرے تھے سجدے میں بزمِ بالا
یہ آنکھیں قدموں سے مل رہا تھا، وہ گرد قربان ہو رہے تھے
ضیائیں کچھ عرش پر یہ آئیں، کہ ساری قندیلیں جھلملائیں
حضورِ خورشید کیا چمکتے، چراغ منہ اپنا دیکھتے تھے
یہی سماں تھا کہ پیکِ رحمت خبر یہ لایا کہ چلئے حضرت
تمہاری خاطر کشادہ ہیں جو کلیم پر بند راستے تھے

ندا آئی یا محمد صلی اللہ علیک وسلم قریب تشریف لایئے ؎
بڑھ اے محمد، قریں ہو احمد، قریب آ سرورِ ممجّد
نثار جاؤں یہ کیا ندا تھی، یہ کیا سماں تھا یہ کیا مزے تھے
تبارک اللہ شان تیری تجھی کو زیبا ہے بے نیازی
کہیں تو وہ جوشِ لن ترانی کہیں تقاضے وصال کے تھے

اطراف و جوانب ناپید ہو گئے تھے، زمان و مکان گم تھے ؎
خرد سے کہہ دو کہ سر جھکا لے گماں سے گزرے گزرنے والے
پڑے ہیں یاں خود جہت کو لالے کسے بتائے کدھر گئے تھے

سراغِ این و متیٰ کہاں تھا، نشانِ کیف و الیٰ کہاں تھا
نہ کوئی راہی نہ کوئی ساتھی، نہ سنگِ منزل نہ مرحلے تھے

ادھر سے پیہم تقاضے آنا، ادھر تھا مشکل قدم بڑھانا
جلال و ہیبت کا سامنا تھا جمال و رحمت اُبھارتے تھے

بڑھے تو لیکن جھجکتے ڈرتے، حیا سے جھکتے، ادب سے رکتے
جو قرب انہیں کی روش پہ رکھتے، تو لاکھوں منزل کے فاصلے تھے

کچھ خبر نہیں کہ دنیٰ نے حضور کو آغوش میں لے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا ؎

پر ان کا بڑھنا تو نام کا تھا، حقیقۃً فعل تھا اُدھر کا
تنزلوں میں ترقی افزا، دنیٰ تدلّیٰ کے سلسلے تھے

ہوا آخر کہ ایک بجرا تموجِ بحرِ ھُو سے ابھرا
دنیٰ کی گودی میں ان کو لیکر فنا کے لنگر اٹھا دئیے تھے

کسے ملے گھاٹ کا کنارا، کدھر سے گزرا کہاں اتارا
بھرا جو مثلِ نظر طرارا وہ اپنی آنکھوں سے خود چھپے تھے

اُٹھے تو قصرِ دنیٰ کے پردے کوئی خبر دے تو کیا خبر دے
وہاں تو جا ہی نہیں دوئی کی، نہ کہہ کہ وہ ہی نہ تھے ارے تھے

قربِ الٰہی کے دلفریب سمے کو الفاظ میں بیان کرنے کی دل نشیں کوشش ؎

وہ باغ کچھ ایسا رنگ لایا کہ غنچہ و گل کا فرق اُٹھایا
گرہ میں کلیوں کے باغ پھولے، گلوں کے تکمے لگے ہوئے تھے

محیط و مرکز میں فرق مشکل، رہے نہ فاصل خطوطِ واصل
کمانیں حیرت میں سر جھکائے، عجیب چکر میں دائرے تھے

حجاب اُٹھنے میں لاکھوں پردے ہر ایک پردے میں لاکھوں جلوے
عجب گھڑی تھی کہ وصل و فرقت جنم کے بچھڑے گلے ملے تھے

زبانیں سوکھی دکھا کے موجیں تڑپ رہی تھیں کہ پانی پائیں
بھنور کو یہ ضعفِ تشنگی تھا کہ حلقے آنکھوں میں پڑ گئے تھے

وہی ہے اوّل وہی ہے آخر وہی ہے باطن وہی ہے ظاہر
اسی کے جلوے اسی سے ملنے، اسی سے اسکی طرف گئے تھے

کمانِ امکاں کے جھوٹے نقطو! تم اوّل آخر کے پھیر میں ہو
محیط کی چال سے تو پوچھو کدھر سے آئے کدھر گئے تھے

محب و محبوب میں کن تحائف کا تبادلہ ہوا ؎

اُدھر سے تھیں نذرِ شہ نمازیں، اِدھر سے انعامِ خسروی میں
سلام و رحمت کے ہار گندھ کر گلوئے پر نور میں پڑے تھے
زبان کو انتظارِ گفتن تو گوش کو حسرتِ شنیدن
یہاں جو کہنا تھا کہہ لیا تھا جو بات سننی تھی سُن چکے تھے

حضور والا بہشت کی سیر کے لیے تشریف لے گئے ؎

وہ برجِ بطحا کا ماہ پارہ بہشت کی سیر کو سدھارا
چمک پہ تھا خُلد کا ستارہ، کہ اس قمر کے قدم گئے تھے
سرورِ مقدم کی روشنی تھی، کہ تابشوں سے مہِ عرب کی
جناں کے گلشن تھے جھاڑ فرشی، جو پھول تھے سب کنول بنے تھے
طرب کی نازش کہ ہاں لچکیے، ادب وہ بندش کہ ہل نہ سکیے
یہ جوشِ ضدین تھا کہ پودے کشاکشِ ارّہ کے تلے تھے

عالمِ بالا کی طرف سے کرۂ ارضی کی طرف واپسی ؎

خدا کی قدرت کہ چاند حق کے کروڑوں منزل میں جلوہ کرکے
ابھی نہ تاروں کی چھاؤں بدلی کہ نور کے تڑکے آلئے تھے
نبیٔ رحمت شفیعِ امّت، رضاؔ پہ للّٰہ ہو عنایت
اسے بھی ان خلعتوں سے حصّہ، جو خاص رحمت کے واں بنے تھے
ثنائے سرکار ہے وظیفہ، قبولِ سرکار ہے تمنّا
نہ شاعری کی ہوس نہ پروا، روی تھی کیا کیسے قافیے تھے

روی اور قافیہ

مولانا نے آخری شعر میں فنِ شعر کی اصطلاحات روی اور قافیے کا حوالہ کچھ اس انداز میں دیا ہے کہ جیسے اس قصیدے کے قوافی دل پسند نہ تھے۔ مگر در اصل یہ بات نہیں۔ میں روی اور قافیہ کی فنی حیثیت بتانے سے پہلے یہ بھی بتا دوں کہ اس قصیدے کے اکثر اشعار میں فنی صنعتیں بھی ہیں جن

کا ذکر میں نے بخوفِ طوالت نہیں کیا۔ چونکہ میں بیشتر فنی صنائع کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ ان کی روشنی میں شائقین اشعار بالا کی صنعتیں خود دیکھ سکتے ہیں۔

حرفِ روی قافیئے کا وہ آخری حرف ہے جو بار بار آتا ہے۔ اسی پر قافیئے کی بنیاد ہوتی ہے۔ وہ قافیئے کا حرفِ اصلی ہوتا ہے اضافی نہیں ہوتا۔ جیسے چمن۔ یمن۔ سخن وغیرہ قوافی میں نون حرفِ روی ہے اور ان قوافی کا اصلی حرف ہے اضافی نہیں ہے۔ پڑے۔ مُرے۔ دھرے وغیرہ قوافی میں را حرفِ روی ہے۔ یائے مجہول اضافی ہے۔ اصلی حرف نہیں ہے۔ اسی طرح شرابی۔ کتابی۔ گلابی وغیرہ قوافی میں ب حرفِ روی ہے اور یائے معروف اضافی ہے۔ ان مثالوں سے یہ واضح ہو گیا کہ اگر اضافی حرف کو ہٹا دیں تو قوافی کا حرفِ روی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ حرفِ روی مختلف ہو جائیں تو وہ الفاظ ہم قافیہ نہ رہے۔ لہٰذا ایطا کا نقص پیدا ہو گیا۔ مولانا کے اس قصیدے میں اکثر قوافی کے آخر میں یائے مجہول اضافی ہے۔ اسے ہٹائیں تو حرفِ روی مختلف نظر آتے ہیں۔ لہٰذا قوافی میں ایطا کا نقص ہے۔ اسی لیے مولانا نے قصیدے کے آخری مصرع میں یہ اشارہ کر دیا ہے کہ "روی تھی کیا کیسے قافیے تھے"، لیکن اساتذہ نے اپنے حسنِ زبان اور زورِ بیان سے ایطا کے نقص کو بھی ایک خوبی اور صنعت بنا دیا ہے چنانچہ ملک الشعرا خاقانیٔ ہند استاد ذوق نے ۶۷ اشعار کی دو غزلیں کہی ہیں۔ جن میں دونوں غزلوں کے بعض اشعار کے قوافی میں ایطائے جلی ہے۔ لیکن استاد کی خوبیٔ زبان اور زورِ بیان نے ایطا کا عیب ڈھانپ دیا ہے۔ مثلاً انہوں نے پہلی غزل میں کہا ہے

دانا خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو — آئے ہے جز میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو — اور جوں خیمۂ لیلیٰ ہے سویدا ہم کو

بستگی دل کو ہے کیوں اُس گرہِ زلف کے ساتھ — کیا کہیں کچھ نہیں کھلتا یہ معمّا ہم کو

جابجا نام تو جوں نقشِ قدم چھوڑ گیا — خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈنے عنقا ہم کو

ان اشعار میں قوافی دریا۔ تماشا۔ صحرا۔ سویدا۔ معمّا۔ عنقا وغیرہ میں حرفِ روی الف ہے جو اصلی ہے اضافی نہیں۔ یہ الف ہٹایا نہیں جا سکتا قافیئے کی بنیاد اسی پر

ہے۔ اب اسی غزل کے یہ اشعار دیکھئے ؎

ہم گئے جس کی طرف جوں گلِ بازی ہم کو
پاس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو

شک نہیں اپنے نوشتے میں کہ اس نو خط نے
خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو

ہر قدم پاؤں پہ سر رکھتے ہیں خارِ سرِ دشت
اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو

دل میں تھے قطرۂ خوں چند سو مانندِ انار
تر رہے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو

ان قوافی (پھینکا۔ بھیجا۔ گھسیٹا۔ نچوڑا) میں الف اصلی نہیں اضافی ہے۔ اسے ہٹائیں تو پھینک، بھیج۔ گھسیٹ اور نچوڑ رہ جاتا ہے جن میں حرفِ روی مختلف ہیں۔ اس لیے قوافی میں ایطا کا نقص ہے۔ ہوتا رہے۔ زبان کیسی شگفتہ اور بیان کتنا پُر زور ہے۔ مضامین کتنے بلند ہیں۔ ان قوافی میں اضافی الف ہی حرفِ روی کا قائم مقام بن گیا ہے۔ استاد ذوقؔ نے اسی زمین کی دوسری غزل میں کہا ہے ؎

دیکھا آخر کو نہ پھوڑے کی طرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو

کون غلطیدہ تھا خاکِ سرِ کوئے پہ تیری
خوابِ شب بسترِ مخمل پہ نہ آیا ہم کو

ہے وہی جنبشِ لبہائے جراحت پسِ قتل
کس لبِ تیغ کے بوسے کا ہے لپکا ہم کو

دل میں نشترِ نگۂ یار کا آ ہی کھٹکا
دی بہشت آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

صیدِ ہی میں نہ فقط ذبح کا کچھ قصد رہا
صلح بھی ٹھہری تو بھڑکا ہی کے چھوڑا ہم کو

ذوقؔ بازی گہِ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

ان اشعار کے قوافی چھیڑا۔ آیا۔ لپکا۔ کھٹکا۔ چھوڑا وغیرہ میں الف اضافی ہے اسے ہٹائیں تو باقی لفظوں کے حرفِ آخر (یعنی حرفِ روی) ہم قافیہ نہیں۔ لہٰذا قوافی میں ایطا ہے بلا سے ہو۔ زائد الف حرفِ روی کا قائم مقام بن کر شعر کا حسن اور زور دوبالا کر رہا ہے۔ مولانا احمد رضا کے قصیدے کے قوافی میں یائے مجہول حرفِ روی کا کام دے رہی ہے اور ہر شعر اپنے حسنِ لفظی اور حسنِ معانی کے اعتبار سے بذاتِ خود ایک صنعت ہے۔ لیکن مولانا اس سے بے نیاز ہیں۔ انہوں نے صاف کہہ دیا

ہے کہ ہمیں نہ شاعری کی ہوس نہ پروا۔

استاد ذوؔق کا صرف یہی دو غزلہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں اضافی حرف کو حرفِ روی کا قائم مقام بنا لیا گیا ہے۔ بلکہ دیگر اساتذہ کے دواوین کے مطالعے سے ایسے صدہا اشعار مل جائیں گے جن میں قوافی کی بنیاد قائم مقام حرف روی پر ہے۔ معترضین کہتے رہیں کہ اُن میں ایطا کا نقص ہے۔ استاد نے تو شعر کہنا ہے خواہ فنی اصول میں ترمیم کر کے اُسے وسیع کرنا پڑے۔ مولانا کو روی، قافیہ اور ایطا کی حقیقت معلوم تھی۔ اسی لیے انہوں نے آخری مصرع میں اشارہ کر دیا ہے کہ ہمیں شاعری سے غرض نہیں۔ ہمیں تو شادیٔ اسریٰ کی کیفیت دل نشیں انداز اور مرصّع الفاظ میں بیان کرنی منظور ہے۔ سو انہوں نے یہ کیفیت بحسن و خوبی نہایت کامیابی کے ساتھ بیان کر دی اور ادب اُردو میں ایک لاجواب قصیدے کا اضافہ کر دیا۔

قصیدۂ نور

حضور صلّی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام نور بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انہیں سراج منیر (چراغ روشن) اور کوکب دُرّی (درخشندہ ستارہ) بھی کہا ہے۔ نورِ محمدی تخلیقِ کائنات سے بہت پہلے ازل میں سب سے پہلے پیدا کیا گیا۔ آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ ستودہ صفات باعثِ تکوینِ کائنات ہے۔ نور کا کام کفر و ضلالت کی ظلمت کو مٹانا اور رشد و ہدایت کی روشنی پھیلانا ہے۔ مولانا نے نور کی مدح میں ۵۹ اشعار کا قصیدہ کہا ہے۔ جس میں ۷ مطلع ہیں۔ میں ذیل میں اس قصیدے کے چیدہ چیدہ اشعار درج کرتا ہوں۔ بعض اشعار میں فنی صنعتیں بھی ہیں۔ حُسنِ زبان، زورِ بیان اور ندرتِ خیال تو پورے قصیدے کے ہر شعر میں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تیسرے ہی ماتھے رہا اے جان سہرا نور کا
بخت جاگا نور کا چمکا ستارا نور کا

تیرے ہی جانب ہے پانچوں وقت سجدہ نور کا
رخ ہے قبلہ نور کا، ابرو ہے کعبہ نور کا

پشت پر ڈھلکا سرِ انور سے شملہ نور کا
دیکھیں موسیٰ طور سے اترا صحیفہ نور کا

تاج والے دیکھ کر تیرا عمامہ نور کا
سر جھکاتے ہیں الٰہی بول بالا نور کا

آبِ زر بنتا ہے عارض پر پسینہ نور کا / مصحفِ اعجاز پر چڑھتا ہے سونا نور کا

پیچ کرتا ہے فدا ہونے کو لمعہ نور کا / گردِ سر پھرنے کو بنتا ہے عمامہ نور کا

میل سے کس درجہ ستھرا ہے وہ پتلا نور کا / ہے گلے میں آج تک کورا ہی کرتا نور کا

تو ہے سایہ نور کا ہر عضو ٹکڑا نور کا / سایے کا سایہ نہ ہوتا ہے نہ سایہ نور کا

دیکھ اُن کے ہوتے نازیبا ہے دعویٰ نور کا / مہر لکھ دے یاں کے ذرّے کو مچلکا نور کا

نور کی سرکار سے پایا دوشالہ نور کا / ہو مبارک تم کو ذوالنورین جوڑا نور کا

جو گدا دیکھو لیے جاتا ہے توڑا نور کا / نور کی سرکار ہے کیا اس میں توڑا نور کا

بارھویں کے چاند کا مجرا ہے سجدہ نور کا / بارہ برجوں سے جھکا اک اک ستارا نور کا

اُن کے قصرِ نور سے خُلد ایک کمرہ نور کا / سدرہ پائیں باغ میں ننھا سا پودا نور کا

عرش بھی فردوس بھی اس شاہ والا نور کا / یہ مثمّن برج وہ مشکوئے اعلیٰ نور کا

شمع دل، مشکوٰۃ تن، سینہ زجاجہ نور کا / تیری صورت کے لیے آیا ہے سورہ نور کا

تیری نسلِ پاک میں ہے بچہ بچہ نور کا / تو ہے عینِ نور تیرا سب گھرانہ نور کا

یہ جو مہر و مہ پہ ہے اطلاق آتا نور کا / بھیک تیرے نام کی ہے استعارہ نور کا

سبزۂ گردوں جھکا تھا بہرِ پابوسِ براق / پھر نہ سیدھا ہو سکا کھایا وہ کوڑا نور کا

تابِ سُم سے چوندھیا کر چاند انہیں قدموں پھرا / ہنس کے بجلی نے کہا دیکھا چھلاوا نور کا

دیدِ نقشِ سُم کو نکلی سات پردوں سے نگاہ / پتلیاں بولیں چلو آیا تماشا نور کا

عکسِ سُم نے چاند سورج کو لگائے چار چاند / پڑ گیا سیم و زرِ گردوں پہ سکّہ نور کا

چاند جھک جاتا جدھر انگلی اٹھاتے مہد میں / کیا ہی چلتا تھا اشاروں پر کھلونا نور کا

ایک سینے تک مشابہ، اک وہاں سے پاؤں تک / حسنِ سبطین ان کے جاموں میں ہے نیما نور کا

صاف شکلِ پاک ہے دونوں کے ملنے سے عیاں / خطِ توام سے لکھا ہے یہ دو ورقہ نور کا

کٰ گیسو ہٰ دہن یٰ ابرو آنکھیں عین صاد / کھیٰعص اُن کا ہے چہرہ نور کا

اے رضاؔ یہ احمدِ نوری کا فیضِ نور ہے
ہو گئی میری غزل بڑھ کر قصیدہ نور کا

اشعار بالا میں سے کئی شعر صنائع، محاورہ بندی اور حسن زبان سے متعلق مثالوں میں آ چکے ہیں۔

درود حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت میں درود شریف کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہر نعت گو شاعر نے جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور شیفتگی کا اظہار اشعار میں کیا ہے وہاں درود و سلام میں ضرور کچھ اشعار کہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ درود و سلام کے بغیر نعتیہ شاعری نامکمل رہتی ہے۔ مولانا احمد رضا خان نے بھی درود و سلام پر قلم اٹھایا ہے۔ مگر جیسا کہ ان کی نعتوں میں حقائق و معارف۔ حسن بیان۔ حلاوت زبان۔ جذبۂ عشق و محبت اور تسکین و تاثیر کی فراوانی ہے، اسی طرح ان کے درود و سلام میں بھی گوناگوں خصوصیات ہیں۔ ذیل میں میں ان کے ایک قصیدے کے چیدہ اشعار نقل کرتا ہوں۔ اصل قصیدہ ۵۹۔ اشعار پر مشتمل ہے۔ جن میں سات مطلع ہیں۔ ہر شعر کا پہلا مصرع ذو قافیتین اور ہر قافیے میں حروف ہجا کی ترتیب کا التزام ہے۔ کسی حرف ہجا کے دو شعر ہیں، کسی کے تین، کسی کے تین سے زیادہ بھی ہیں۔ نعتیہ ادب میں ان کا یہ قصیدہ بھی لاجواب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ا۔ کعبہ کے بدر الدجیٰ تم پہ کروڑوں درود ۔۔۔ طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

شافع روز جزا تم پہ کروڑوں درود ۔۔۔ دافع جملہ بلا تم پہ کروڑوں درود

ب۔ ذات ہوئی انتخاب وصف ہوئے لاجواب ۔۔۔ نام ہوا مصطفےٰ تم پہ کروڑوں درود

ت۔ تم سے جہاں کی حیات، تم سے جہاں کا ثبات ۔۔۔ اصل سے ہے ظل بندھا تم پہ کروڑوں درود

ث۔ کیا ہیں جو بے حد ہیں لوث، تم تو ہو غیث اور غوث ۔۔۔ چھینٹے میں ہوگا بھلا تم پہ کروڑوں درود

ج۔ وہ شب معراج راج، وہ صف محشر کا تاج ۔۔۔ کوئی بھی ایسا ہوا تم پہ کروڑوں درود

ح۔ جان و جہان مسیح، داد کہ دل ہے جریح ۔۔۔ نبضیں چھٹیں دل چلا تم پہ کروڑوں درود

خ۔ اُف وہ رہ سنگ لاخ، آہ یہ پا شاخ شاخ ۔۔۔ اے میرے مشکل کشا تم پہ کروڑوں درود

د۔ تم سے کھلا باب جود، تم سے ہے سب کا وجود ۔۔۔ تم سے ہے سب کی بقا تم پہ کروڑوں درود

ذ۔ خستہ ہوں اور تم معاذ بستہ ہوں اور تم ملاذ ۔۔۔ آگے جو شہ کی رضا تم پہ کروڑوں درود

ر - گرچہ ہیں بے حد قصور، تم ہو عفوّ و غفور　　بخش دو جرم و خطا تم پہ کروڑوں درود

ر - تم سے خدا کا ظہور، اس سے تمہارا ظہور　　لِم ہے یہ وہ اِن ہوا تم پہ کروڑوں درود

ز - بے ہنر و بے تمیز، کس کو ہوئے ہیں عزیز　　ایک تمہارے سوا تم پہ کروڑوں درود

س - آس ہے کوئی نہ پاس، ایک تمہاری ہے آس　　بس ہے یہی آسرا، تم پہ کروڑوں درود

ش - طارمِ اعلیٰ کا عرش، جس کفِ پا کا ہے فرش　　آنکھوں پہ رکھ دو ذرا تم پہ کروڑوں درود

ص - کہنے کو ہیں عام و خاص، ایک تمہیں ہو خلاص　　بند سے کر دو رہا، تم پہ کروڑوں درود

ض - تم ہو شفائے مرض، خلقِ خدا خود غرض　　خلق کی حاجت بھی کیا تم پہ کروڑوں درود

ط - آہ وہ راہِ صراط، بندوں کی کتنی بساط　　المدد اے رہ نما، تم پہ کروڑوں درود

ظ - بے ادب و بد لحاظ، کر نہ سکا کچھ حفاظ　　عفو پہ بھولا رہا، تم پہ کروڑوں درود

ع - لو تہِ دامن کہ شمع، جھونکوں میں ہے روز جمع　　آندھیوں سے حشر اٹھا، تم پہ کروڑوں درود

غ - سینہ کہ ہے داغ داغ، کہہ دو کرے باغ باغ　　طیبہ سے آ کر صبا، تم پہ کروڑوں درود

ف - گیسو و قد لام الف، کر دو بلا منصرف　　لا کے تہِ تیغِ لا، تم پہ کروڑوں درود

ق - تم نے برنگِ فلق، جیبِ جہاں کر کے شق　　نور کا تڑکا کیا، تم پہ کروڑوں درود

ک - نوبتِ در ہیں فلک، خادمِ در ہیں ملک　　تم ہو جہاں بادشہ، تم پہ کروڑوں درود

ل - خلق تمہاری جمیل، خُلق تمہارا جلیل　　خَلق تمہاری گدا، تم پہ کروڑوں درود

م - طیبہ کے ماہِ تمام، جملہ رُسل کے امام　　نوشہِ ملکِ خدا، تم پہ کروڑوں درود

م - خلق کے حاکم ہو تم، رزق کے قاسم ہو تم　　تم سے ملا جو ملا، تم پہ کروڑوں درود

ن - مظہرِ حق ہو تمہیں، مُظہرِ حق ہو تمہیں　　تم میں ہے ظاہر خدا تم پہ کروڑوں درود

ن - برسے کرم کی بھرن، پھولیں نعم کے چمن　　ایسی چلا دو ہوا، تم پہ کروڑوں درود

و - گرنے کو ہوں روک لو، غوطے لگے ہاتھ دو　　ایسوں پر ایسی عطا، تم پہ کروڑوں درود

ہ - کر دو عدو کو تباہ، حاسدوں کو رو براہ　　اہلِ وِلا کا بھلا، تم پہ کروڑوں درود

ی - ہم نے خطا میں نہ کی، تم نے عطا میں نہ کی　　کوئی کمی سرورا! تم پہ کروڑوں درود

ے - کام غضب کے کئے، اس پہ ہے سرکار سے　　بندوں کو چشمِ رضا، تم پہ کروڑوں درود

ٹھیک ہو نام رضاؔ، تم پہ کروڑوں درود
تم کو جو راضی کرے کام وہ لے لیجئے

سلام

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرما دیا ہے کہ وہ خود ذاتِ صمدیت اور ملائکہ آنحضور (صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی حضور پر درود و سلام بھیجو۔" بعض لوگ کہتے ہیں (مجھے ان کی سمجھ پر حیرت ہے) کہ حضور پر زندگی بھر میں کم از کم ایک بار درود بھیجنا ضروری ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو تاکید کرتے ہیں کہ تم بھی آں حضور پر درود بھیجو۔ اس کا مطلب ہے کہ زندگی بھر زیادہ سے زیادہ درود خوانی ہونی چاہئے نہ کہ صرف ایک بار۔ اس سے بھی زیادہ حیرت ناک بات ایک خاتون کے سفر نامے سے معلوم ہوئی جو روز نامہ امروز میں بالاقساط شائع ہوا ہے۔ اس خاتون نے لکھا تھا کہ ممالک عرب اور ترکی میں نوجوان آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہتے۔ اور صحابۂ کرام کے اسمائے مبارک کے ساتھ رضی اللہ عنہٗ نہیں کہتے۔ میرے خیال میں یہ اشتراکیت کے گمراہ کن فروغ اور لادین سیاست کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ پاکستان کے نوجوانوں کی اکثریت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام مبارک کی شیدائی ہے۔ اور نوجوانوں کو نعت خوانی کا شوق ہے۔ میلاد کی مجلسوں میں آخر میں سلام ضرور پڑھا جاتا ہے۔ ہر نعت گو شاعر جب تک ایک سلام نہ لکھ لے اپنے مجموعۂ نعت کو نامکمل سمجھتا ہے۔ معراج اور درود و سلام نعت کے ضروری مضامین ہیں۔ ان کے بغیر شاعری نامکمل رہتی ہے۔ مولانا احمد رضا خاں نے جو سلام لکھا ہے وہ اُردو اور فارسی کے نعتیہ ادب میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صرف سلام ہی نہیں۔ اس میں حضور کا سراپا بھی بیان کیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک عضو مبارک کی مدح و ستائش والہانہ انداز میں کی گئی ہے۔ اور اکثر اشعار میں زبان اور فن کی خوبیاں موتیوں کی طرح بکھری ہوئی ہیں۔ اگر مولانا قصیدۂ شادی اسریٰ اور اس سلام کے سوا نعت میں اور کچھ نہ کہتے تب بھی نعتیہ ادب میں ان کا پلہ بہت بھاری تھا۔ سلام ۱۶۷ اشعار پر مشتمل ہے۔ میں اس کے چیدہ اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں۔ شروع میں ۳۱-۳۲ اشعار میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام صفات، اعلیٰ مدارج، عز و وقار اور معجزات کا ذکر ہے۔ ایک سے ایک اونچا شعر ہے۔ کوئی انتخاب کیونکر کرے۔ فرماتے ہیں ؎

مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام — شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
مہرِ چرخِ نبوت پہ روشن درود — گُلِ باغِ رسالت پہ لاکھوں سلام
شہر یارِ ارم تاجدارِ حرم — نو بہارِ شفاعت پہ لاکھوں سلام
شبِ اسریٰ کے دولھا پہ دائم درود — نوشۂ بزمِ جنت پہ لاکھوں سلام
سروِ نازِ قدم، مغزِ رازِ حکم — یکّہ تازِ فضیلت پہ لاکھوں سلام
صاحبِ رجعتِ شمس و شقِ قمر — نائبِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
بے سہیم و قسیم و عدیل و مثیل — جوہرِ فردِ عزت پہ لاکھوں سلام
ماہِ لاہوتِ خلوت پہ لاکھوں درود — شاہِ ناسوتِ جلوت پہ لاکھوں سلام
خلق کے دادرس سب کے فریاد رس — کہفِ روزِ مصیبت پہ لاکھوں سلام
انتہائے دوئی، ابتدائے یکی — جمعِ تفریق و کثرت پہ لاکھوں سلام
ہم غریبوں کے آقا پہ بے حد درود — ہم فقیروں کی ثروت پہ لاکھوں سلام
سببِ ہر سبب منتہائے طلب — علتِ جملہ علت پہ لاکھوں سلام

ابتدائی ۳۱-اشعار کے سلام کے ساتھ ساتھ سراپا شروع ہوتا ہے۔ قامت، سر، گیسو اور مانگ کی ستائش میں یوں گوہر افشانی کی ہے ؎

طائرانِ قدس جس کی ہیں قمریاں — اس سہی سرو قامت پہ لاکھوں سلام
جس کے آگے سرِ سروراں خم رہیں — اس سرِ تاجِ عزت پہ لاکھوں سلام
وہ کرم کی گھٹا گیسوئے مشک سا — لکۂ ابرِ رافت پہ لاکھوں سلام
لیلۃ القدر میں مطلع الفجرِ حق — مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام
لخت لختِ دلِ ہر جگر چاک سے — شانہ کرنے کی حالت پہ لاکھوں سلام

پھر گوش مبارک۔ چشم رحمت۔ جبین سعادت۔ محراب ابرو اور مژگانِ اطہر کا تعارف یوں کرایا ہے ؎

دور و نزدیک کی سننے والے وہ کان — کانِ لعلِ کرامت پہ لاکھوں سلام
جس کے ماتھے شفاعت کا سہرا رہا — اس جبینِ سعادت پہ لاکھوں سلام
جن کے سجدے کو محرابِ کعبہ جھکی — اُن بھووں کی لطافت پہ لاکھوں سلام
اُن کی آنکھوں پہ وہ سایہ افگن مژہ — ظلّۂ قصرِ رحمت پہ لاکھوں سلام
معنیٔ قَدْ رَاٰی مقصدِ مَا طَغٰی — نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام
جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آگیا — اس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام

بینی مبارک ۔ رخسارِ منور ۔ خدِ اقدس ۔ اور صباحت و خطِ دل آرا کو سلام بھیجتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

نیچی آنکھوں کی شرم و حیا پر درود — اونچی بینی کی رفعت پہ لاکھوں سلام
جن کے آگے چراغِ قمر جھلملائے — اُن عذاروں کی طلعت پہ لاکھوں سلام
ان کے خد کی سہولت پہ بے حد درود — ان کے قد کی رشاقت پہ لاکھوں سلام
چاند سے منہ پہ تاباں درخشاں درود — نمک آگیں صباحت پہ لاکھوں سلام
خط کی گردِ دہن وہ دل آرا پھبن — سبزۂ نہرِ رحمت پہ لاکھوں سلام

پھر ریشِ اقدس ۔ لبِ مبارک ۔ دہنِ مطہّر ۔ زبانِ وحی ترجمان ۔ فصاحت و بلاغت ۔ دعاء اجابت کو کس والہانہ انداز سے سلام بھیجا ہے ؎

ریشِ خوش معتدل مرہمِ ریشِ دل — ہالۂ ماہِ ندرت پہ لاکھوں سلام
پتلی پتلی گلِ قدس کی پتیاں — اُن لبوں کی نزاکت پہ لاکھوں سلام
وہ دہن جس کی ہر بات وحیِ خدا — چشمۂ علم و حکمت پہ لاکھوں سلام
وہ زباں جس کو سب کُن کی کنجی کہیں — اس کی نافذ حکومت پہ لاکھوں سلام
اس کی پیاری فصاحت پہ بے حد درود — اس کی دل کش بلاغت پہ لاکھوں سلام
وہ دعا جس کا جوبن بہارِ قبول — اس نسیمِ اجابت پہ لاکھوں سلام
جس کی تسکیں سے روتے ہوئے ہنس پڑیں — اُس تبسم کی عادت پہ لاکھوں سلام

دوشِ دل افروز، شانۂ جاں نواز، مہرِ نبوت، پشتِ مبارک ۔ دستِ گہر فشاں ۔

بازوئے قوت آزما اور کفِ گلفروش کی ستائش میں یوں گل افشانی کی ہے ؎

دوش بر دوش ہے جن سے شانِ شرف — ایسے شانوں کی شوکت پہ لاکھوں سلام
حجر اسودِ کعبۂ جان و دل — یعنی مہرِ نبوّت پہ لاکھوں سلام
روئے آئینۂ علم پشتِ حضور — پشتیِ قصرِ ملّت پہ لاکھوں سلام
ہاتھ جس سمت اٹھا غنی کر دیا — موجِ بحرِ سماحت پہ لاکھوں سلام
جس کو بارِ دو عالم کی پروا نہیں — ایسے بازو کی قوت پہ لاکھوں سلام
جس کے ہر خط میں ہے موجِ نورِ کرم — اس کفِ بحرِ ہمت پہ لاکھوں سلام

انگشتہائے نگاریں، ناخنِ گرہ کشا، سینۂ بے کینہ، دلِ حق نما، بطنِ مبارک اور کمر جاں پرور کی ثنا میں یوں زمزمہ سرا ہیں ؎

نور کے چشمے لہرائیں دریا بہیں — انگلیوں کی کرامت پہ لاکھوں سلام
عیدِ مشکل کشائی کے چمکے ہلال — ناخنوں کی بشارت پہ لاکھوں سلام
رفعِ ذکرِ جلالت پہ ارفع درود — شرحِ صدرِ صدارت پہ لاکھوں سلام
دل سمجھ سے ورا ہے مگر یوں کہوں — غنچۂ رازِ وحدت پہ لاکھوں سلام
کُل جہاں مِلک اور جَو کی روٹی غذا — اس شکم کی قناعت پہ لاکھوں سلام
جو کہ عزمِ شفاعت پہ کھنچ کر بندھی — اس کمر کی حمایت پہ لاکھوں سلام

زانوئے قوی، ساقِ صندلی اور کفِ پائے مکرم کی صفت و ثنا پر سراپا ختم ہو رہا ہے ؎

انبیا تہ کریں زانو ان کے حضور — زانوؤں کی وجاہت پہ لاکھوں سلام
ساق اصلِ قدم، شاخِ نخلِ کرم — شمعِ راہِ اصابت پہ لاکھوں سلام
کھائی قرآں نے خاکِ گزر کی قسم — اُس کفِ پا کی حرمت پہ لاکھوں سلام

سراپا تو ختم ہوا۔ اب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بچپن اور عہدِ طفلی کے ایک ایک واقعہ کو سلام بھیج رہے ہیں۔ صرف چیدہ اشعار نقل کرتا ہوں ؎

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند — اس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام
زرعِ شاداب و ہر ضرعِ پُر شیر سے — برکاتِ رضاعت پہ لاکھوں سلام

بھائیوں کے لیے ترکِ پستاں کریں — دودھ پیتوں کی نصفت پہ لاکھوں سلام
اللہ اللہ وہ بچپنے کی پھبن — اس خدا بھاتی صورت پہ لاکھوں سلام
فضلِ پیدائشی پر ہمیشہ درود — کھیلنے سے کراہت پہ لاکھوں سلام
سیدھی سیدھی روش پر کروڑوں درود — سادی سادی طبیعت پہ لاکھوں سلام

پھر اعلانِ نبوّت کے بعد کے ایک ایک واقعے کی یاد دہانی کرا کے ہر واقعے کو درود و سلام بھیجتے ہیں۔ صرف چیدہ اشعار نقل کرونگا ؎

روزِ گرم و شبِ تیرہ و تار میں — کوہ و صحرا کی خلوت پہ لاکھوں سلام
جسکے گھیرے میں ہیں انبیاءُ و ملک — اس جہانگیر بعثت پہ لاکھوں سلام
اندھے شیشے جھلاجھل دمکنے لگے — جلوہ ریزیٔ دعوت پہ لاکھوں سلام
جس کے آگے کھنچی گردنیں جھک گئیں — اس خداداد شوکت پہ لاکھوں سلام
کس کو دیکھا یہ موسیٰ سے پوچھے کوئی — آنکھوں والوں کی ہمت پہ لاکھوں سلام
شورِ تکبیر سے تھرتھرائی زمیں — جنبشِ جیشِ نصرت پہ لاکھوں سلام
وہ چقاچاق خنجر سے آتی صدا — مصطفےٰ تیری صولت پہ لاکھوں سلام
اُن کے آگے وہ حمزہ کی جانبازیاں — شیرِ غرّانِ سطوت پہ لاکھوں سلام
الغرض ان کے ہر مُو پہ لاکھوں درود — انکی ہر خُو و خصلت پہ لاکھوں سلام
انکے ہر نام و نسبت پہ نامی درود — انکے ہر وقت و حالت پہ لاکھوں سلام

اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام، اہلِ بیتِ اطہار اور امہات المومنین کو یکے بعد دیگرے یاد کرکے انہیں نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اُن کے مولیٰ کے ان پر کروڑوں درود — اُنکے اصحاب و عترت پہ لاکھوں سلام
پارہائے صحف غنچہ ہائے قدس — اہلِ بیتِ نبوّت پہ لاکھوں سلام
اُس بتولِ جگر پارۂ مصطفےٰ — حجلہ آرائے عفت پہ لاکھوں سلام
سیدہ زاہرہ طیبہ طاہرہ — جانِ احمد کی راحت پہ لاکھوں سلام
وہ حسن مجتبیٰ سید الاسخیاء — راکبِ دوشِ عزت پہ لاکھوں سلام

اس شہیدِ بلا شاہِ گلگوں قبا — بیکسِ دشتِ غربت پہ لاکھوں سلام
اہلِ اسلام کی مادرانِ شفیق — بانوانِ طہارت پہ لاکھوں سلام
عرش سے جس پہ تسلیم نازل ہوئی — اس سرائے سلامت پہ لاکھوں سلام
بنتِ صدیق آرامِ جانِ نبی — اس حریمِ برأت پہ لاکھوں سلام
جس میں روح القدس بے اجازت نہ جائیں — اس سرادق کی عصمت پہ لاکھوں سلام

اب جاں نثاران رسولِ عربی صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور نثارعانِ دینِ متین کے فضائل بیان کرتے ہوئے انہیں سلام بھیجتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ سب حضورِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے محب اور فدائی ہیں ؎

جاں نثارانِ بدر و اُحد پہ درود — حق گزارانِ بیعت پہ لاکھوں سلام
وہ دسوں جن کو جنّت کا مژدہ ملا — اس مبارک جماعت پہ لاکھوں سلام
سایۂ مصطفےٰ، مایۂ اصطفےٰ — عزّ و نازِ خلافت پہ لاکھوں سلام
یعنی اس افضل الخلق بعد الرسل — ثانی اثنینِ ہجرت پہ لاکھوں سلام
وہ عمر جس کے اعدا پہ شیدا سقر — اس خدا دوست حضرت پہ لاکھوں سلام
فارقِ حق و باطل امام الہدیٰ — تیغِ مسلولِ شدّت پہ لاکھوں سلام
دُرِّ منثورِ قرآں کی سلک بھی — زوجِ دو نورِ عفّت پہ لاکھوں سلام
یعنی عثمان صاحبِ قمیصِ ہدیٰ — حلّہ پوشِ شہادت پہ لاکھوں سلام
مرتضیٰ شیرِ حق اشجع الاشجعین — ساقیٔ شیر و شربت پہ لاکھوں سلام
شیرِ شمشیر زن، شاہِ خیبر شکن — پرتوِ دستِ قدرت پہ لاکھوں سلام
ماحیٔ رفض و تفضیل و نصب و خروج — حامیٔ دین و سنّت پہ لاکھوں سلام
جس مسلماں نے دیکھا انہیں اک نظر — اس نظر کی بصارت پہ لاکھوں سلام
اور جتنے ہیں شہزادے اس شاہ کے — ان سب اہلِ مکانت پہ لاکھوں سلام
شافعی مالک، احمد امام حنیف — چار باغِ امامت پہ لاکھوں سلام
کاملانِ طریقت پہ کامل درود — حاملانِ شریعت پہ لاکھوں سلام

آخر میں، قطب و ابدال، پیشوایانِ طریقت اور حضرت پیرِ پیراں شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ پر سلام بھیجتے ہوئے فرمایا ؎

قطب و ابدال و ارشاد و رشد الرشاد — محیِ دین و ملت پہ لاکھوں سلام
حضرت حمزہ شیرِ خدا و رسول — زینتِ قادریت پہ لاکھوں سلام
بے عذاب و عتاب و حساب و کتاب — تا ابد اہلِ سنت پہ لاکھوں سلام

پھر اپنی ذات کے لیے فرمایا ؎

تیرے ان دوستوں کے طفیل اے خدا — بندۂ ننگ خلقت پہ لاکھوں سلام
میرے استاد، ماں باپ، بھائی بہن — اہلِ ولد و عشیرت پہ لاکھوں سلام
ایک میرا ہی رحمت پہ دعویٰ نہیں — شاہ کی ساری امت پہ لاکھوں سلام
کاش محشر میں جب ان کی آمد ہو اور — بھیجیں سب ان کی شوکت پہ لاکھوں سلام

مجھ سے خدمت کے قدسی کہیں ہاں رضاؔ
مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

بہت اختصار اور قلم روک روک کر چلنے کے باوجود اس لاثانی سلام کے ۹۹ منتخب اشعار درج ہوگئے۔ صرف ۶۸ اشعار انتخاب میں نہیں آئے۔

دیگر قصائد

حدائقِ بخشش حصۂ سوم میں مولانا کے اور بھی کئی اعلیٰ پائے کے طویل قصائد درج ہیں۔ اور بعض سخت مشکل زمینوں میں ہیں۔ شعرائے اُردو میں صرف مومن خان مومنؔ نے اہلِ دول کے بجائے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی مدح میں قصائد کہے ہیں۔ مومن کے بعد صرف حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب قدس سرہ کے مجموعۂ کلام میں ایسے بلند پایہ قصائد نظر آتے ہیں، جن میں خلفائے راشدین اور پیشوایانِ دین کے مناقب اور فضائل بیان کئے گئے ہیں۔ میرے سامنے حدائقِ بخشش حصہ سوم کا جو نسخہ ہے وہ حافظ افتخار ولی خان مالک کتب خانہ اہلِ سنت پیلی بھیت کے اہتمام میں محمد میاں مہتمم رضوی کتب خانہ بریلی

نے چھپوایا ہے۔ میں جناب محمد مرید احمد چشتی (چک جانی ضلع جہلم) کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے یہ بسیط مقالہ لکھنے کے لیے حدائقِ بخشش کے تینوں حصے بہم پہنچائے۔ حدائقِ بخشش حصہ سوم میں کئی نادر چیزیں ہیں۔ ان میں ۱۵۵۔ اشعار کا وہ نعتیہ قصیدہ بھی ہے جس میں علم ہیئت اور نجوم کی اصطلاحات کے حوالے ہیں۔ یہ قصیدہ اُردو ادب میں بے نظیر ہے۔ اس کا مفصل ذکر میں آخر میں کردوں گا۔
حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کی زمین نہایت مشکل اور قوافی کا میدان نہایت تنگ ہے پھر بھی اشعار کی تعداد دو سو سولہ ہے۔ اس قصیدے میں آپ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے جملہ فضائل کے علاوہ عام شعرا کی روش کے مطابق حضرت عمر کے اسپ صبا رفتار اور تیغ براں کی تعریف میں بھی متعدد اشعار کہے ہیں۔ یہ تمام قصائد اپنی ایک افادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حدائقِ بخشش کے تینوں حصّوں کو نئی ترتیب کے ساتھ از سرِ نو شائع کیا جائے۔ اور فارسی کلام الگ کیا جائے۔ حصّہ سوم میں فارسی قصائد اور فارسی رباعیات اور فارسی قطعاتِ تاریخ بھی ہیں جو اُردو کلام میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ بہرحال یہ اہلِ دل اور اہلِ ہمت کا حصّہ ہے کہ وہ مولانا کے سارے اُردو اور فارسی کلام کو الگ الگ از سرِ نو نئی اور مناسب ترتیب کے ساتھ شائع کریں۔ اس سے صرف قوم ہی کو نہیں بلکہ ادب کو بھی فائدہ پہنچے گا۔ نئی ترتیب کی تکمیل کے لیے راقم الحروف امکانی مدد اور تعاون کے لیے حاضر ہے۔ (انشاءُ اللہ تعالیٰ)

مدحِ صدیق

حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے وہ نا مکمل ہے۔ تاہم جتنے بھی اشعار درج ہیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اکثر مناقب اور فضائل بیان ہو گئے ہیں۔ مطلع فارسی میں ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ایا دلے کہ رسیدت غم و الم بسیار	بیا بہ حضرتِ صدیق شاہِ صدق شعار
یہی ہے اکرمکم اور یہی ہے اتقٰکم	یہی ہیں ثانیٔ اثنین اذ ھما فی الغار

وہ دو یہی ہیں کہ جن دو کا تیسرا ہے خدا ۔۔۔ یہ دو وہی ہیں کہ جن کا خدا ہے وصف شمار
نہیں ہے ان پہ کچھ احساں کسی کا دنیا میں ۔۔۔ کہ اسکے بدلے میں کرتے ہیں رحمتیں ایثار
غرض ہے صرف رضائے حق اس سخاوت سے ۔۔۔ خدا گواہ ہے شاہد ہیں احمدِ مختار
جو ان سے دل میں رکھے پیچ و تاب افعی سان ۔۔۔ خدا کی مار ہو اس پر شقی ہو وہ فی النّار
امیرِ خیلِ صحابہ قوامِ دینِ اللہ ۔۔۔ وزیرِ خسروِ عالم امامِ اہلِ وقار
نظامِ بزمِ خلافت، حسامِ رزمِ جہاد ۔۔۔ خدا کے لشکرِ جرّار کے سپہ سالار
نہیں ہے بعدِ رسُل ان کا مثل عالم میں ۔۔۔ یہی ہے میرا عقیدہ یہی ہے راہِ خیار
یہ اہلِ بیت کے واصف وہ انکے مدح طراز ۔۔۔ یہ اُن پہ جان سے قرباں وہ اُن پہ دل سے نثار
ریاضِ قدس میں جو گل نسیم قدس کھلائے ۔۔۔ وہ پہلے آکے بنے ان کا طرۂ دستار
انہیں کے واسطے شایاں ہے اَلَّذِیْنَ مَعَہٗ ۔۔۔ وہ جوشِ بحرِ معیّت رہا کہ حد نہ کنار
ملا ہے نشو و نما گلبنِ حجاز کے ساتھ ۔۔۔ رہی ہے تا دمِ آخر حضوریٔ دربار
نہ چھوڑا بعدِ فنا بھی نبی کے قدموں کو ۔۔۔ اُٹھیں گے دست بدستِ جنابِ روزِ شمار
الٰہی چاروں خلیفوں کا صدقہ اِغْفِرْلِیْ ۔۔۔ طفیل سیّدِ عالم قِنَا عَذَابَ النَّار

مدح فاروق

مولانا نے یہ قصیدہ "فضائل فاروق" کے عنوان سے جس سے ۱۳۰۸ ہجری تاریخ نکلتی ہے کہا تھا۔ زمین نہایت مشکل ہے اور قوافی تنگ۔ اگرچہ قصیدہ کے اولیں اشعار غائب ہیں پھر بھی اشعار کی کل تعداد ۲۱۶ ہے۔ میں یہاں صرف چیدہ اشعار درج کروں گا۔ فرماتے ہیں ؎

عمر قصرِ دینِ نبی کی عمارت ۔۔۔ عمر عمر بانیٔ دینِ اطائب
عمر راحتِ روحِ شرعِ الٰہی ۔۔۔ عمر آفتِ جانِ ادیانِ کاذب
وہ ملکِ خدا کا اولوا العزم ناظم ۔۔۔ وہ شرعِ رسالت کا ذوالقدر نائب
ترے نام کے بھیس میں گر نہ آتی ۔۔۔ نہ ہوتا کوئی عمرِ فانی کا راغب
فقط اک الف لفظِ عامر سے کم ہے ۔۔۔ کہ تھا شکلِ ناوک ہوایاں سے غائب
یہ معنی کہ اے آسمانِ خلافت ۔۔۔ ترے دور میں خود شیاطیں ہیں خائب

عمر وہ عمر جسکے اعدا پہ شیدا　　غضب کے مصائب سفر کے متاعب
قسم اسکی جس نے کیا مصطفےٰ کو　　امام الاطاہر سنام الاطائب
کہ دشمن علی کا عمر کا عدو ہے　　علی کا مخالف عمر کا محارب
خدا کی قسم مصطفےٰ کے صحابہ　　سب آپس میں یک جان و یکدل و وقالب
جو ان میں نفاق و عداوت بتائے　　وہ مردود جھوٹا وہ ملعون کاذِب
عمر تجھ پہ قربان جانِ فضائل　　عمر تجھ پہ صدقے علوِّ مراتب
ہمایوں تجھے دولتِ خواب نوشیں　　مبارک تجھے ہمرہیِ رکائب

وصفِ اشہبِ تیز گام

مچلنے میں بچپن کسی تند خو کا　　بکھرنے میں نازِ بتانِ کواعب
نقوشِ حوافر مطافِ اجِلّہ　　جوابِ اہِلّہ رکابِ اکارب
مگر مشی میں رنگِ اشرافیاں تھا　　وہ قانوں شناسِ اشاراتِ راکب

روافض و خوارج

علی سے محبت عمر سے عداوت　　کہیں بھی ہوئے جمع نور و غواہب
روافض پہ واللہ قہرِ علی ہے　　خوارج پہ فاروق اعظم معاتب
وہی تو محبّانِ حیدر جو رکھیں　　تقیّہ کی تہمت بسرِ شیرِ غالب
وہی تو جناب حسن کے فدائی　　جو صلحِ حسن کو کہیں زدرِ کاذب
وہی تاجدارِ رسالت کے بندے　　جو ہوں بانوئے خاصِ سلطاں پہ عائب
کوئی کیا لکھے ایسے ناپاک قصّے　　کہ انگشت زنہار ہے کلک کاتب
رضا کب تک اس طائفے کی مذمت　　نری ہجو گوئی نہیں ہے مناسب

دُعا

الٰہی پھلیں پھولیں اعدا مگر یوں　　کہ خارش میں جس طرح جسم اکالب

ملے ان کو برکت تو وہ جس کو سن کر — گدا در سے پھرتا ہے محروم و خائب
وہ دو دھول نہائیں مگر یوں کہ جیسے — سفیدیٔ دیدہ بہے تا عواقب

مدح علی مرتضیٰ

حضرت مولیٰ علی کی مدح میں چند اشعار حاضر ہیں ؎

تشنہ لب تر دامنو مژدہ کہ ہیں — ساقیٔ نہرِ لبن مولیٰ علی
باغبان اللہ، گلبن مصطفےٰ — عندلیبِ نغمہ زن مولیٰ علی

علیٔ مرتضیٰ تو ہے وصیٔ مصطفےٰ تو ہے — مرا حاجت روا تو ہے مرا مشکل کشا تو ہے

علی امام علی ملتجا علی مولیٰ — سقر میں جائے تو چھوڑے تمہارا دامن
عجب مذاق ہے شیعی پکڑنے دوڑتے ہیں — علی کو چھوڑ کے استاد و شیخ کا دامن

زباں پہ کانٹے ہیں شاہ کوثر ان آفتوں سے چھڑا دو ہم کو
حسین کی پیاس کا تصدق ذرا سا پانی پلا دو ہم کو

مدح صحابۂ کرام

صحابۂ کرام کی مدح میں چند اور پر زور اشعار پیش کرتا ہوں ؎

نظر مجھ پہ دینِ کرم میں ہے واجب — میں خادم تو آقا، میں بندہ تو صاحب
خدم تیرے مخدوم دونوں جہاں کے — کریم المناقب، عدیم المثالب
لآلیٔ درجِ جمالِ فضائل — دراریٔ برجِ جلالِ مناصب
رفیع المدارج، منیع المعارج — رَسیمُ المراتب، سَنیُّ المناقب
خصوصاً ابوبکر و فاروق و عثمان — علی چار انہارِ باغِ مناقب
تری آل آلائے والا کی والی — صحابہ سحابِ صبابِ مواہب

مدحِ خاتونِ جنت

حضرت خاتونِ جنت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کی شان میں فرماتے ہیں ؎

جنابِ سرورِ عالم کی پیاری پیاری بتول — ستیزِ پاک، جگر پارۂ رسول اللہ
ادب سے نام زباں پر مرے نہیں آتا — بدن پہ کیفیتِ رعشہ ہے تھرا ہے گویا
جوان کا نام سنا زہرہ سربلندی چھوڑ — بنی ستارہ بیا ہو کے باندیٔ درگاہ
انہیں کے دامنِ اقدس کا صدقہ میرے رسول — انہیں کی چادرِ عفت کا واسطہ یا شاہ

مدحِ صدیقہ

مولانا نے اُم المومنین بی بی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے فضائل و مناقب میں بہت زوردار قصیدہ کہا ہے۔ چند منتخب اشعار حاضر ہیں ؎

آج فردوس میں کس کانِ حیا کا ہے گزر — حکم ہے سبزۂ بیگانہ کو با ھــر باہر
تھیں جو بے پردہ عنادل میں عروسانِ چمن — شرم سے لیتی ہیں دامانِ صبا اب منہ پر
نیل ڈھل جائیگا آنکھوں کا فلک یا در ہے — وا اگر یوں ہی رہی آج بھی چشمِ اختر
خاک اڑاتی پھرے آوارۂ ہر دشت و چمن — اب حضوری کی ہوا سر میں ہے اے بادِ سحر
یہ بنا تختِ زمرد، وہ بنا افسرِ لعل — واہ کیا سبزۂ گل نے ہیں دکھائے جوہر
حورِ رویت کیلئے شوق سے آنکھیں دھولیں — اسی سرکار کی مملوک ہے حوضِ کوثر

تشبیب سے مدح کی طرف گریز کرتے ہیں ؎

یا حُمیرا کا تنِ پاک پہ گلگوں جوڑا — گلچینیِ کے دُر، آویزۂ گوشِ اطہر
ہیں کہاں دلنیں سرکار کی، عفت حرمت — کہہ دو حجرے کو بڑھیں پھولوں کا گہنا لیکر
چمنِ قدس کے بیلے کا جبیں پر چھپکا — نحنُ اَقرب کی چنبیلی سے گلے کا زیور
باغِ تطہیر کی کلیوں سے بنائیں کنگن — آیۂ نور کا ماتھے پہ منوّر جھومر
بانوا تیرا سراپردۂ عفت وہ رفیع — جس میں بے اذن نہ ہو روحِ قدُس کو بھی گزر
بس کہ جُز حضرتِ شہ دل میں نہیں اور کی جا — شاہزادوں سے بھی خالی ہے کنارِ اطہر
سورۂ نور نے کالے کئے منہ اعدا کے — لَعْنَتُ اللّٰہِ عَلٰی کُلِّ شَقِیٍّ اَکْفَر

تیری تدقیق پہ غش حیدر د نخل ہاشم
تیری تحقیق کے قائل عمر و ابن عمر

کوئی خاتون تری طرح کہاں سے لائے
باپ صدیق سا اور ختم رسل سا شوہر

تیرے جلوے سے رہی مسندِ افتار روشن
عہدِ صدیق سے تا دورِ جناب حیدر

تیل بھی خوب ہی نکلے گا تپ محشر میں
آج جس دل میں ترا سوئے ادب ہے بل بھر

قصیدہ در اصطلاحاتِ ہیئت

مولانا نے ایک معرکہ کا نعتیہ قصیدہ کہا ہے۔ جس میں تمام تر علم ہیئت اور علم نجوم کی اصطلاحات ہیں۔ پورا قصیدہ ۱۵۵ اشعار پر مشتمل ہے۔ یہ قصیدہ علمی اور فنی حیثیت میں اتنا بلند ہے کہ اردو اور فارسی ادب میں اس کا جواب نہیں۔ میں رونمائی کے طور پر اس نادر قصیدے کے کچھ منتخب اشعار ذیل میں نقل کرتا ہوں ؎

خالقِ افلاک نے طرفہ کھلائے چمن
اک گل سوسن میں ہیں، لاکھوں گل یاسمن
آسمان — کواکب

موتیے بیلے کے پھول، زیب گریبانِ شام
جوہی چنبیلی کے گل زینتِ جیبِ یمن
نجوم — شمال — ستارے — جنوب

دامنِ البرز کی کلیوں میں پھولے ہیں پھول
کیوڑے کی چوٹی میں ہے، حاصل چندیں چمن
بروج — منطقۃ البروج

شیر کے دل میں جو ہو نارِ غضب کیا عجب
کژدم بارد مزاج کیوں ہے زبانہ فگن
قلب الاسد — عقرب — قلب العقرب

وسطِ گلستاں ہے نہر، نہر کے ہر سمت دوب
دوب میں بوٹے ہزار، بوٹوں میں دُرِّ عدن
فلک — منطقہ — سبزی — کواکب — تابش

سبزہ و گل دل نشیں، محو تماشا حسیں
بانوئے اقلیم چیں، دلبر بابل وطن
فلک نجوم — مشتری — زہرہ

اُف رے ستم شیشہ باز، قطرہ چھلکتا نہیں
سر پہ لیے شیشیاں رقص میں ہے قطرہ زن
فلک ثوابت — کواکب

تشبیب سے مدح کی طرف گریز کرتے ہیں ؎

جانِ دو عالم نثار وہ ہے مرا تاجدار — جس کو کہیں جان و دیں جانِ من ایمانِ من
تابشِ خور کیا گھٹے روز ہے تازہ نکھار — جب پڑی طیبہ کی خاک نور چڑھا لاکھ من
پیرِ فلک کیا تھکے روز تو پاتا ہے جان — جب ترے در تک گیا مٹ گئی ساری تھکن
جلوے ترے ایک چھینٹ شب پہ اگر ڈال دیں — چشمۂ کافور تک مشک کا جائے لبن
کشتۂ حسرت ہو شمس دن کو وصیت کرے — دامنِ شب کا مجھے دیجیو چیٹا کفن
تلوے ترے سیب کو دیں اگر اک بوند ست — بڑھ کے لالی کی آبِ خلد کا سینچے چمن
تیرے ہی جلوے کے نور، تیرے ہی جلوے میں گم — تیرے ہی پرتو سے باغ تیرے ہی پرتو سے بن
یہ شب و شبنم نجوم، ڈالے ہیں ہستی کی دھوم — اے مدنی آفتاب پردہ نہ رخ پر فگن
دم میں ہوا ہو گی جان مانگ لفافے کی خیر — پھر نہ پھرے گی ہوا جھوٹ ہے آواگون
جتنے دو عالم کے کام اُن سے فزوں تیرا جود — جتنے مرادوں کے نام اُن سے زیادہ منن
تیری شریعت کا شور، تیری سیاست کا زور — سنگ و شجر پر ہے ڈور، لاکھوں گلے اک رسن
کورِ نمک بادہ نوش، کیوں نہ ہوں سر کر فروش — شورِ سیاست بہ جوش، نشۂ صہبا ہرن
شعلۂ آواز سے چھالے گلے میں پڑیں — قلقلِ مینا ہو خود اپنی ہی مُہرِ دہن
لال پری لے اگر قافِ زمرد کا نام — چاہے جو نیلم پری وصلِ سیہ دیو دن
شیشے دبائیں گلا ڈر سے لہو خشک ہو — کاگ بنائیں وہ ڈانٹ غم سے ہو نیلا بدن
مار کے ڈر سے جو ڈھول بولے تو بولے پہ پول — حُبِّ مَ کہہ دو اَلْحَدِیْث اَحْمَدُ سَدَّ الْفِتَن
پھیر دے عزّیٰ کا منہ لات جھکا کر منات — کاٹ دے گنگا کی دھار پاؤں لگا کر جمن
بست کی انگشت میں خاتمِ پنجا ہے — گن کے ہیں صاحب نگیں تیرے نبی ہاں تہ دہن
تیرا الف قامت آج چاہے اگر بانٹے قلب — نون کا الٹے حساب قاف کا بدلے چلن

مدینہ طیبہ کا بن

واں بھی ہے تیرا ہی نور ورنہ جناں کو یہ بن — کانٹوں پہ کھینچے کھیے، چل مرے ہوتے نہ بن

ہند میں آفت ہے عیش، زندگی و مرگ نو ۔ طیبہ میں راحت ہے موت، مردن و خوش زیستن
روضہ ہے عرشِ دُوم طیبہ جہانِ سُوم ۔ چرخ دہم یاں کی خاک خلدِ نہم یاں کا بن
کچھ ترے پروانے کو نام کی پروا نہ ہو ۔ لاکھ جلیں ساتوں شمع، بارہ کنول، نو لگن
خشک سبھی زرعِ شرع شعر تو شاداب ہیں ۔ سرو سبھی شمع دیں، تھالے بنے ہیں لگن

۱۵۵ اشعار کے اس قصیدے میں ایک لفظ بھی بھرتی کا نہیں ہے اور تمام اشعار شاداب، گوہر تاب اور انتخاب ہیں۔ اور اس میں ہیئت و نجوم کی جو اصطلاحات اور تلمیحات ہیں، انہوں نے اس قصیدے کو ادب میں لاجواب بنا دیا ہے۔

رباعیات

رباعی اصنافِ سخن میں ایک مشکل صنف ہے۔ بعض لوگ چار مصرع کے ہر کلام کو رباعی سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے۔ قطعات ہر وزن میں کہے جاتے ہیں اور قطعے کے اشعار کی تعداد بھی مقرر نہیں۔ رباعی کے خاص اوزان ہیں۔ اگر چار بیتی نظم رباعی کے مقررہ اوزان میں سے کسی وزن میں نہ ہو تو اُسے رباعی نہیں کہہ سکتے، اسے قطعہ کہیں گے۔ رباعی کے اوزان مقرر ہیں اور اس کے پہلے۔ دوسرے اور چوتھے مصرع کا ہم قافیہ ہونا ضروری ہے۔ اگر تیسرا مصرع بھی ہم قافیہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ فارسی میں عمر خیام اور ابوسعید ابوالخیر کی رباعیات بہت مشہور ہیں۔ ویسے چند رباعیات ہر شاعر نے کہی ہیں۔ اُردو میں میر انیس۔ میرزا دبیر، خواجہ حالی اور اکبر الہ آبادی نے بکثرت رباعیات کہی ہیں۔ بعد کے دور میں رباعیات کہنے والوں میں عیش فیروزپوری۔ جوش ملیح آبادی۔ اثر صہبائی۔ ضیا جعفری اور راقم الحروف شامل ہیں۔ رباعی کی کامیابی کا انحصار چوتھے مصرع کی بے ساختگی اور برجستگی پر ہے۔ مولانا رضا بریلوی نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں رباعیات کہی ہیں۔ جن میں مختلف مضامین ہیں۔ ان کی چار پانچ رباعیات ہم اس مقالے کے ابتدائی صفحات میں ضمناً درج کر چکے ہیں۔ کچھ رباعیات درج ذیل ہیں۔

(۱)

نقصان نہ دے گا تجھے عصیاں میرا ۔ غفران میں کچھ خرچ نہ ہو گا تیرا
جس میں تجھے نقصان نہیں کر دے معاف ۔ جس میں ترا کچھ خرچ نہیں دے مولیٰ!

(۲)

دنیا میں ہر آفت سے بچانا مولیٰ — عقبیٰ میں نہ کچھ رنج دکھانا مولیٰ
بیٹھوں جو درِ پاکِ پیمبر کے حضور — ایمان پر اس وقت اٹھانا مولیٰ

(۳)

ہر جا ہے بلندیٔ فلک کا مذکور — شاید نہیں دیکھے ابھی طیبہ کے قصور
انسان کو انصاف کا بھی پاس رہے — گو دور کے ڈھول ہیں سہانے مشہور

(۴)

معدوم نہ تھا، سایۂ شاہِ ثقلین — اس نور کی جلوہ گہ تھی ذاتِ حسنین
تمثیل نے اس سایہ کے دو حصّے کیے — آدھے سے حسن بنے ہیں آدھے سے حسین

(۵)

بوسہ گہ اصحاب وہ مہرِ سامی — وہ شانۂ چپ میں اس کی عنبر فامی
یہ طرفہ کہ ہے کعبۂ جان و دل میں — سنگِ اسود، نصیبِ رکنِ شامی

(۶)

آبِ درِ دنداں سے عدن ڈوب گیا — رشکِ لبِ لعلیں سے یمن ڈوب گیا
خجلت یہ ہوئی دیکھ کے روئے شہ کو — شبنم کے پسینے میں چمن ڈوب گیا

(۷)

پرواز میں جب مدحتِ شہ میں آؤں — تا عرش پرِ فکرِ رسا سے جاؤں
مضمون کی بندش تو میسّر ہے رضاؔ — کاؔفی کا دردِ دل کہاں سے لاؤں

فارسی رباعیات

(۱)

پایت اے آنکہ چوں تو احسن نہ بود — بر گردنِ قوم تا ہمبرہمن نہ بود
سرتا بہ قدم تو منتِ حق باشی — خود منتِ حق کرا بہ گردن نہ بود

(۲)

اے خدمتِ درگاہِ تو دینِ جبریل | روشن بہ سجودِ تو جبینِ جبریل
جولانگہِ خدامِ جنابت باشد | سدرہ کہ بود شاہ نشینِ جبریل

(۳)

ہرگز شبِ تیرہ شب انور نہ شود | ساقیٔ مغاں، امیرِ کوثر نہ شود
ہم حبِّ علی و ہم خلافِ شیخین | ہر دو خواہی دلے میسّر نہ شود

مخمسات مولانا نے کئی خمسے بھی کہے ہیں۔ قاسم کی مشہور نعت کو اپنے قلم کی سحر طرازی سے لاجواب خمسہ بنایا ہے۔ اس کے چند بند ذیل میں درج کرتا ہوں ؎

اے کاش شانِ رحمت میرے کفن سے نکلے | جاں بوئے گل کی صورت باغِ بدن سے نکلے
ارماں طفیلِ نامِ شاہِ زمن سے نکلے | حسرت ہے یا الٰہی جب جان تن سے نکلے
نکلے تو نامِ اقدس لیکر دہن سے نکلے

کس درجہ روز افزوں عشقِ حبیبِ رب ہے | مرآتِ دل میں تاباں عکسِ مہِ عرب ہے
ہر عضو شوقِ یادِ جاناں میں مثلِ لب ہے | رگ رگ میں عشقِ احمد گر ہے تو کیا عجب ہے
آوازِ یا حبیبی ہر موئے تن سے نکلے

ہے غلغلہ ہماری الفت کا اب ہر اک سُو | کیا خوب ہے کہ مشتاق اپنا ہے یارِ دلجُو
پیدا ہے اس کی باتوں سے انتظار کی بُو | گر مشتِ خاک میری لے جائے اے صبا تُو
اک شور مرحبا کا طیبہ کے بن سے نکلے

یہ شوق کم نہ ہوگا مرقد میں تا بہ محشر | یہ شعلہ وہ نہیں ہے جس کو بجھا دے صرصر
کرتی ہے کارِ روغن جب بادِ مرگ اس پر | جو عشقِ مصطفےٰ میں مر جائیگا نہ کیوں کر
شورِ صلوٰۃ اس کی قبرِ کہن سے نکلے

جب ہوگا رنگ افشاں نورِ شبیہ امجد | کھل جائیں گے ہزاروں گلشن میانِ مرقد
مہکے گی تا بہ محشر خوشبوئے باغِ سرمد | نکلے گی مرقدوں سے یوں اُمتِ محمد
بادِ صبا مہک کر جیسے چمن سے نکلے

میں عندلیب شیدا اس گل عذار کا ہوں — مہکا ہے جس کی بوئے الفت سے قلب محزوں
کیا ہے اگر نکلتی فرقت میں ہے جو ئے خوں — خاکِ مدینہ پر میں جس وقت جا کے لوٹوں
خوشبوئے مشک و عنبر میرے بدن سے نکلے

لاکھوں ہیں سینہ بریاں مثلِ رضا و کافی — انجام کار سب نے اپنی مراد پائی
دشتِ طلب میں ہو کر آوارہ ،کھو گئے جی — وہ دن بھی ہو الٰہی جب صورتِ شہیدی
حضرت کی جستجو میں قاسم وطن سے نکلے

(۲)

بستگی میں تھا مرے غنچۂ دل کو یہ کمال — سو نسیمیں چلیں کھلنا تھا مگر اس کا محال
دفعۃً کیا ہوا اس حال نے پایا جو زوال — صرصرِ دشتِ مدینہ کا مگر آیا خیال
رشکِ گلشن جو بنا غنچۂ دل وا ہو کر

جب جہاں سوز ہو خورشیدِ قیامت یارب — بے قراری رہے، کام آئے، نکالے مطلب
دل کی سیماب وشی رنگ دکھائے یہ عجب — پائے شہ پر گرے یارب تپشِ مہر سے جب
دل بے تاب اڑے حشر میں پارا ہو کر

پیچ و تاب اتنا نہ کر کچھ تو سلجھ اے سنبل — پڑ گئی پیچ میں کیوں تیری سمجھ اے سنبل
کیوں پریشان ہے اتنا تو سمجھ اے سنبل — عاشقِ زلفِ نبی ہوں نہ الجھ اے سنبل
کب میں آتا ہوں ترے دام میں دانا ہو کر

(۳)

مصطفےٰ کون ہے مجتبیٰ کون ہے — جلوۂ نورِ ربِ العلیٰ کون ہے
اپنے رب کا پیارا بتا کون ہے — کون ہے خاتم الانبیا کون ہے
انبیا میں حبیبِ خدا کون ہے

بزمِ محشر کا نقشہ بنا ہے عجب — دامنِ مصطفےٰ ہی سے لپٹے ہیں سب
سامنے سے بھلا بھیڑ ہٹتی ہے کب — جمع ہیں پیشِ محبوبِ رب سب کے سب
سب سمجھتے ہیں حاجت روا کون ہے

المدد یا حبیبِ خدا المدد　　المدد یا رسولِ خدا المدد
المدد یا شفیعِ جزا المدد　　المدد رحمتِ کبریا المدد
بحرِ غم میں مرا ناخدا کون ہے

دور تھے بھید سب فہم و ادراک سے　　لا کے دیدی خبر ہفت افلاک سے
راز ہیں منکشف شاہِ لولاک سے　　فیض پہنچا رضاؔ احمد پاک سے
ورنہ تم کیا سمجھتے خدا کون ہے

(۴)

شعلۂ عشقِ نبی سینے سے باہر نکلا　　عمر بھر منہ سے مرے وصفِ پیمبر نکلا
سازگار ایسا بھلا کس کا مقدر نکلا　　دم مرا صاحبِ لولاک کے در پر نکلا
اب تو ارمان ترا اے دلِ مضطر نکلا

ہے مرے زیرِ نگیں ملکِ سخن تا بہ ابد　　میرے قبضے میں ہیں اس خطے کے چاروں سرحد
اپنے ہی ملک سے تعبیر ہے ملکِ سرمد　　ہے تصرف میں مرے کشورِ نعتِ احمد
میں بھی کیا اپنے نصیبے کا سکندر نکلا

بن گئی میری زباں ماہیِ آبِ کوثر　　نور کے بکّے دہن سے مرے نکلے باہر
سایۂ رحمتِ باری نظر آیا سر پر　　مغفرت صدقے ہوئی میری زباں پر آ کر
جس گھڑی لب سے مرے وصفِ پیمبر نکلا

تشنہ ہوں شربتِ دیدار پلا دیجے مجھے　　آئینہ طلعتِ انور کا بنا دیجے مجھے
مردہ ہوں، آپ مسیحا ہیں، جلا دیجے مجھے　　وہ جمالِ رخِ پر نور دکھا دیجے مجھے
دونوں عالم میں نہ جس کا کوئی ہمسر نکلا

ہے رضاؔ گرچہ سیہ کار سراپا قاسمؔ　　نعتِ احمد ہے مگر اس کا وظیفہ قاسمؔ
ایک مصرع بھی گر آقا کو خوش آیا قاسمؔ　　حشر کے روز اٹھے شور عجب کیا قاسمؔ
قبر سے دیکھو وہ مداحِ پیمبر نکلا

یہ آخری خمسہ بھی جناب قاسمؔ کی نعت کو بنایا گیا ہے۔ مولانا نے اصل اشعار

پر خوب مصرعے لگائے ہیں۔ جو اصل نعت سے شیر و شکر ہو گئے ہیں۔

فارسی کلام

مولانا کا فارسی کلام بھی بہت ہے۔ لیکن وہ "حدائقِ بخشش" کے تینوں حصّوں میں بکھرا ہوا ہے۔ اسے پہلے تو نئی ترتیب سے مجتمع کرنا چاہیئے۔ فارسی کلام میں نعتیں۔ قصائد۔ رباعیات۔ قطعات۔ قطعاتِ تاریخ اور مثنوی ردِ امثال شامل ہے۔ ان سب چیزوں کا پورا جائزہ لینے کے لیے الگ مقالے کی ضرورت ہے۔

فارسی نعتیں اور قصائد اُردو نعتوں اور قصائد کی طرح بہت بلند ہیں۔ جن کا فارسی ادب میں خاص مقام ہے۔ فارسی میں پیرِ پیراں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدّس سرہٗ کی مدح میں بہت سے قصائد۔ منقبتیں اور رباعیات ہیں۔

ان رباعیات میں بعض رباعیات مستزاد میں ہیں۔ جو انہیں کی ایجاد ہیں۔ مثنوی ردِ امثال گذشتہ دور کے باطل دینی فرقوں اور گمراہ سیاسی مسلکوں کے رد میں ہے اور ایک کامیاب نظم ہے۔

خاتمۂ کلام

جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت مولانا احمد رضا خاں قدس سرہٗ کو بلبلِ بستانِ حجاز، حسّان الهند اور امام نعت گویاں کہنا بالکل بجا اور درست ہے۔ اُردو ادب میں اُن کے پایہ کا نعت گو کوئی نہیں۔ ان کے نعتیہ قصائد جن کے اقتباسات گذشتہ صفحات میں دیئے گئے ہیں، بے مثال ہیں۔ انہیں حضور رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات سے جو بے پناہ عشق و محبت ہے، اس کی پوری جھلک ان کے کلام میں موجود ہے۔ اور یہ جھلک ان کی مشکل ترین زمینوں کی نعتوں اور قصائد میں بھی نظر آتی ہے۔ میری خوش بختی ہے کہ میں اپنی ۷۶ سالہ زندگی کے کم و بیش ۶۵ سال شعر و سخن کے مطالعہ میں صرف کرنے کے بعد آخر میں مولانا کے کلام سے پورے طور پر متعارف ہوا اور مجھے مدّاحِ رسول (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی مدّاحی کا شرف حاصل ہوا۔ الحمد للہ

نظیر لودھیانوی

فضل منزل۔ گوالمنڈی۔ لاہور۔ مورخہ ۲۲ر اپریل ۱۹۷۸ء

حضرت مولانا احمد رضا خاں قادری بریلوی کی عطا

از پروفیسر سیّد علی عباس جلالپوری ایم۔اے فلسفہ (گولڈ میڈلسٹ)
ایم۔اے فارسی (گولڈ میڈلسٹ)

کلمہ طیبہ کی رُو سے اسلام ظاہراً دو اساسی عقائد سے عبارت ہے۔

(۱) وحدانیت: یعنی اللہ تعالیٰ کو واحد معبودِ حقیقی تسلیم کرنا اور

(۲) رسالت: جناب رسالت مآب (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی نبوّت پر عقیدہ رکھنا۔

یہ عقائد باہم دگر وابستہ ہیں۔ جناب رسالت مآب کی نبوّت وحدانیت پر مستلزم ہے کیونکہ بنی نوعِ انسان جنابِ رسالت مآب ہی کے توسط سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی وحدانیت سے آشنا ہوئے تھے اور آنحضرت ہی کی ذاتِ بابرکات کے حوالے سے اس دینِ قیّم کا اہتمام ہوا تھا جس کی تبلیغ انبیاء ابتدائے آفرینش سے کرتے آ رہے تھے۔ وحدانیّت اور رسالت کی یہ وابستگی اسلام میں علم وعمل کی یک جہتی پر دلالت کرتی ہے۔ علم اللہ تعالیٰ کی وحدت کا اور عمل جس کا مثالی نمونہ اسوۂ حسنہ میں ملتا ہے۔ گویا جنابِ رسالت مآب صلّی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کو رہنمائے عمل بنائے بغیر ہم اللہ تعالیٰ کی وحدانیّت کا کما حقہ، اثبات نہیں کر سکتے۔ دوسرے الفاظ میں جو مسلمان اپنی حسبِ توفیق جتنا اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے گا اُتنا ہی وحدانیّت کے شعور و ادراک سے بہرہ ور ہو سکے گا۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ قرآن کی نظریاتی تعلیمات کی عملی ترجمانی جنابِ رسالت مآب ہی کی سیرتِ طیبّہ میں کی گئی ہے۔ لہٰذا قرآنی تعلیمات سے عملی فیضان وہی شخص پا سکتا ہے جو جناب رسالتِ مآب کے نقشِ قدم پر چلتا ہو۔ دنیائے اسلام کی بدقسمتی سے جب علمائے

سورنے شخصی اغراض و مقاصد کی خاطر اسوۂ حسنہ کو پیشِ نظر رکھے بغیر براہ راست قرآنِ مجید کی تفسیر کرنا شروع کی تو اسلام کئی فرقوں میں بٹ کر رہ گیا۔ امام غزالی نے اپنے زمانے میں بہتّر فرقے گنائے تھے جن میں آج کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ہر فرقہ اپنے آپ کو ناجی اور دوسروں کو شقی تصوّر کرتا ہے جس سے اسلام کی انقلابی رُوح کو سخت صدمہ پہنچتا ہے اس انشقاق و افتراق کا بڑا سبب یہی ہے کہ علمائے سو نے اسوۂ رسول سے صرف نظر کر کے اپنے محدود ذہن و دماغ سے قرآنِ پاک کی تعبیر و تشریح کی جسارتِ بے جا کی اور وحدتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ اسلام ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح صحرائے عرب سے نکلا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرق و مغرب کے اکثر مہذّب ممالک پر چھا گیا تھا۔ لیکن فرقہ بندی نے اسلام کے ساتھ وہی کام کیا جو نہریں دریا کے ساتھ کرتی ہیں۔ نہریں رہ جاتی ہیں اور دریا کا تموّج ختم ہو جاتا ہے اسی طرح بے شمار فرقوں نے اسلام کی حقیقی انقلابی رُوح کو مجروح کر کے رکھ دیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ فرقوں کے آغاز سے تفصیلی بحث کی جائے اور ائمۂ تلبیس کی گمراہی کے سیاسی و عمرانی اسباب بیان کئے جائیں البتہ اس امر کی جانب توجّہ دلانا ضروری ہے کہ صدرِ اسلام میں خوارج اور دورِ جدید میں وہابی اور اہلِ قرآن (چکڑالویہ) جناب رسالتِ مآب کے بارے میں تقصیر اور تخفیف کے مرتکب ہوئے ہیں۔ خارجیوں کا نعرہ تھا کہ ہمارے لیے قرآن کافی ہے وہابیوں کی رُو سے جناب رسالت مآب کا منصب یہی تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے کلام کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ معاذ اللہ اس سے زیادہ اُن کا کوئی مقام نہ تھا نہ ہے۔ چکڑالویہ نے حدیث سے انکار کر کے گویا ارشاداتِ نبوی کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا اور براہِ راست قرآن کی تفسیر کرنے لگے۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے۔ جناب رسالت مآب کا اسوۂ حسنہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور سیرتِ پاک سے اعراض کر کے ان بد نصیب کم نظر لوگوں نے اسلام کو بازیچۂ اطفال بنا دیا۔ وہابیوں کا استدلال یہ تھا کہ جناب رسالت مآب کی بشریت

کا اثبات قرآن میں کیا گیا ہے اس لیے ہم آنحضرت کو اپنی ہی طرح کا ایک بشر کہنے میں حق بجانب ہیں یہ لوگ ایک خطرناک مغالطۂ فکری میں مبتلا ہو گئے۔ بلاشبہ قرآن میں آنحضرت کو بشر کہا گیا ہے لیکن اس کا مطلب ظاہراً یہ ہے کہ آپ دوسرے انسانوں کی طرح کھاتے پیتے تھے، چلتے پھرتے تھے، سوتے جاگتے تھے۔ وہابیوں نے جب یہ کہا کہ حضور رسالت مآب "ہماری ہی طرح کے بشر" تھے تو اپنی کوتاہ بینی اور کج فکری سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گویا رسالت مآب کی شخصیت اور حضور کا کردار بھی "ہماری ہی طرح کا تھا"۔ آنحضرت کی بشریت کے ذکر سے اللہ تعالیٰ کی یہی مراد ہوتی تو جنابِ رسالت مآب کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کی تاکید کیوں کی جاتی۔ اس تاکید سے بداھتہً ثابت ہوتا ہے کہ جناب رسالتِ مآب محض بشر ہی نہیں تھے بلکہ خیرالبشر تھے، انسانِ کامل تھے۔ انسانیت کے مثالی پیکر تھے، شرفِ انسانیت کے زندہ نمونے تھے۔ خارجیوں اور وہابیوں نے اپنی خیرہ چشمی سے جناب رسالتِ مآب کو اپنے آپ پر قیاس کیا جس کے باعث وہ اسوۂ حسنہ کی رہنمائی سے محروم ہو گئے۔ ان کا اسلام رسومِ عبادت کی ظاہری ادائیگی میں محصور ہو کر رہ گیا جس میں دلی عقیدت، والہانہ شیفتگی اور محبت کے جوش و خروش کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ ان کی حالت یہودی احبار کی سی ہے جو چند ٹھوس اور جامد رسموں کی ادائیگی کو حاصل دین سمجھتے تھے۔ حضور رسالت مآب کی سیرتِ پاک سے قطع نظر کر کے خارجی اور وہابی اعلیٰ محاسنِ اخلاق، وسعت قلب، کشادگیٔ نظر، شہامت و مروّت، عفو و کرم، شجاعت و حمایت، سے جو سیرتِ رسول کے نمایاں اوصاف تھے بے بہرہ ہو چکے ہیں اور اُن کی ساری کاوشیں اسلام کے نام پر دکاّن آرائی کرنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔

وہابی تحریک کا آغاز محمد بن عبدالوہاب نے ۱۸ ویں صدی عیسوی میں نجد سے کیا تھا۔ وہابی اپنے آپ کو موحدین کہتے تھے۔ ۱۷۴۴ء میں امیر محمد بن سعود نے محمد بن عبدالوہاب کی دعوت قبول کر لی اور بزورِ شمشیر وہابیت کو رواج دینے کی کوشش کی۔ ۱۸۰۲ء میں سعود بن عبدالعزیز نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں

کو تاراج کیا۔ اس کے بعد وہابی علی الاعلان حاجیوں کے قافلوں کو لوٹنے لگے اور اصلاحِ مذہب کے نام پر قتل و غارت کرنے لگے۔ ترکیہ کے سلطان نے وہابیوں کی سرکوبی کے لیے محمد علی پاشا اور ابراہیم پاشا کو فوج دے کر بھیجا۔ وہابیوں کو ہر معرکے میں شکست فاش ہوئی فاتحین نے اُن کے گڑھ درعیہ کو فتح کر کے مسمار کر دیا۔ سلطنتِ ترکیہ کے کمزور پڑ جانے سے وہابی پھر زور پکڑ گئے۔

ہندوستان میں کچھ لوگ تحریکِ وہابیت سے متاثر ہوئے اور انہوں نے محمد بن عبدالوہاب کی پیروی میں اصلاحِ مذہب کی کوشش شروع کی۔ یہاں کے مسلمان اکثر و بیشتر ہندوؤں کی اولاد سے تھے جن کے آباء نے صوفیہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا۔ قدرتاً ہندو مذہب کی بعض رسوم مسلمانوں کے معاشرے میں باقی و برقرار تھیں۔ ان رسوم کی بیخ کنی ایک اسلامی اور مستحسن کوشش ہو سکتی تھی لیکن وہابی جوشِ اصلاح میں تمام حدود سے تجاوز کر گئے اور تقصیر و غلو کے مرتکب ہوئے۔ تقصیر جناب رسالت مآب اور آلِ رسول کی شان و منزلت کے بارے میں اور غلو تصوّف کی مخالفت میں۔ محمد بن عبدالوہاب نے امام الموحدون شیخ اکبر محی الدین ابن العربی پر کفر کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ ہندوستان کے وہابی بھی اولیاء و اصفیاء پر زبانِ طعن دراز کرنے لگے اور بھول گئے کہ ہندوستان میں صوفیہ ہی نے اسلام کی اشاعت کی تھی۔ خوارج اور اُن کی اولادِ معنوی وہابیوں نے صوفیہ کی مخالفت کو اس لیے اپنا شعار بنایا کہ

(۱) صوفیہ جناب رسالت مآب سے والہانہ عشق کا اظہار کرتے تھے جسے خوارج اور وہابی غلو اور شرک سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) صوفیہ نے ائمہ اہلِ بیت کی منقبت میں پر جوش قصائد لکھے۔ اس ”جرم“ کی پاداش میں حکیم سنائی اور شیخ عطار پر تعدّی کی گئی اور اہلِ ظاہر نے ان کی ایذا رسانی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

(۳) صوفیہ کے اکثر سلسلے جناب علی ابن ابی طالب کی ذات پر ختم ہوتے ہیں احادیث

صحیحہ میں جنابِ امیر کو مدینۂ علم کا باب کہا گیا ہے۔ صوفیہ کے خیال میں آپ علم لدنّی یا روحانیت کا سرچشمہ ہیں جس سے اکابر صوفیہ اور شیوخ فیض یاب ہوتے ہیں۔

(۴) صوفیہ نے اہلِ ظاہر کی دنیا طلبی اور ریاکاری کے پردے چاک کئے اور بالتواتر و تسلسل اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی کہ مذہب حقۂ محض ظاہری رسوم کی ادائیگی نہیں بلکہ تصفیۂ قلب اور تزکیۂ اخلاق کا نام ہے۔ انہوں نے کٹھ ملاؤں کی دین فروشی پر کڑی گرفت کی اور کہا کہ ان پیشہ ور علمائے سالوس نے مذہب کو اپنی دنیوی اغراض کی پرورش کا وسیلہ بنا رکھا ہے۔ صوفیہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے کہ تصفیۂ قلب اور تزکیۂ اخلاق ہی مذہب کا اصل مقصد اور مدّعا ہے جس کے حصول کے لیے ذاتِ باری اور جناب رسالت مآب کے ساتھ والہانہ محبّت رکھنا از بس لازم ہے۔ مسلمان صوفیہ کے علاوہ چین کے تاؤمت والے یونان کے اشراقی، ہندوستان کے بھگت عشق و محبت ہی کو حسن اخلاق و کردار کی شرطِ اول سمجھتے رہے ہیں۔ مسلمان صوفیہ نے جناب رسالت مآب کی ذاتِ بابرکات کے ساتھ عشق و محبّت کو ضروری قرار دیا اور اس طرح اسوۂ حسنہ کی اہمیّت کو از سرِ نو محکم کر کے اسلام کی بیش قیمت خدمات انجام دیں۔ نفسیاتی لحاظ سے کوئی شخص اپنے مرشد کی تعلیمات سے فیض یاب نہیں ہو سکتا جو اس سے دلی عقیدت نہ رکھتا ہو۔ اُس کی عزّت نہ کرتا ہو اُس کو محبّت کی نگاہ سے نہ دیکھتا ہو۔ موضوع زیرِ نظر کی رعایت سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو مسلمان جنابِ رسالت مآب سے دلی عقیدت اور محبّت نہیں رکھتا وہ آنحضرت کے اسوۂ حسنہ کے فیضان سے محروم رہتا ہے۔ اہلِ ظاہر نے بالعموم اور خارجیوں اور وہابیوں نے بالخصوص اس نکتے کو فراموش کر دیا اور تخفیفِ رسول اور اہانتِ اہلِ بیت کر کے وہ محاسنِ اخلاق اور علوِ کردار کے ان مثالی نمونوں کے فیضان سے محروم ہو گئے۔ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی علیہ الرحمہ کی یہ عطا نہایت گرانقدر ہے کہ انہوں نے اکابر صوفیہ کی طرح نہایت جوش و خروش سے عشقِ

رسول کی روایت کی آبیاری کی، اسوۂ حسنہ کی اہمیت کو از سرِ نو واضح اور محکم کیا۔ اور جمہور مسلمین کو وہابیوں کے برپا کیے ہوئے فتنۂ تخفیفِ رسول سے بچانے میں موثر کردار ادا کیا۔ آپ نے نثر اور نظم میں معرکہ آرا کتابیں لکھیں خواص کے لیے مدلّل اور تحقیقی پیرایۂ بیان اختیار کیا اور جمہور کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کے لیے پُر جوش منقبت اور نعتیں لکھیں جو عشقِ رسول اور ولائے اہلِ بیت میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ نعت اور منقبت کی روایات عربی اور فارسی زبانوں سے اُردو میں آئی تھیں۔ مشہور صوفی شاعروں شیخ عطار، ملّا عبدالرحمٰن جامی وغیرہ کے نعتیہ کلام سے عشقِ رسول کے جو سوتے پھوٹے تھے اُن سے اُردو کی نعت اور منقبت سیراب و سرسبز ہوئی تھی۔ مثال کے طور ملّا عبدالرحمٰن جامی کی مشہور نعت ؎

دیدہ جائے تو یا رسول اللہ ‏‏ جاں فدائے تو یا رسول اللہ
جامیؔ دردمند بے چارہ ‏‏ خاکِ پائے تو یا رسول اللہ

آج بھی اربابِ حال پر وجد طاری کر دیتی ہے۔ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی نے فارسی اور اُردو میں بے مثال نعتیں لکھی ہیں۔ جن کے بغیر درود و سلام کی کوئی محفل گرمائی نہیں جا سکتی۔ ان کا ایک ایک لفظ عشقِ رسول میں بسا ہوا ہے اور انہیں سُن کر سامعین کے دلِ عشقِ رسول سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ ادبی لحاظ سے بھی یہ نعتیں حُسنِ بیان کے اچھوتے نمونے ہیں۔ ایک دن داغؔ دہلوی کے سامنے کسی شخص نے حضرت شاہ احمد رضا خاں کی ایک نعت کا شعر پڑھا ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں ‏‏ تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

مرزا داغؔ پھڑک اٹھے اور کہا وہ ہیں! ایک مولوی اور ایسا شعر! واہ! واہ!
آپ کی اکثر نعتیں ہماری علمی و ادبی میراث کا بیش قیمت حصّہ بن چکی ہیں۔ مثلاً ؎

اُن کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں ‏‏ جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں
رونقِ بزمِ جہاں ہیں عاشقانِ سوختہ ‏‏ کہہ رہی ہے شمع کی گویا زبانِ سوختہ

راہ پُر خار ہے کیا ہونا ہے — پاؤں افگار ہے کیا ہونا ہے
کس کے جلوے کی جھلک ہے یہ اُجالا کیا ہے — ہر طرف دیدۂ حیرت زدہ تکتا کیا ہے
ز عکست ماہِ تاباں آفریدند — ز بُوئے تو گلستاں آفریدند
ایمان ہے قالِ مصطفائیؐ — قرآن ہے حالِ مصطفائیؐ
لحد میں عشقِ رُخِ شہ کا داغ لے کے چلے — اندھیری رات سُنی تھی چراغ لے کے چلے

حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان کے درود و سلام بے مثال ہیں ؎

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام — شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام
سب سے اولیٰ و اعلیٰ ہمارا نبی — سب سے بالا و والا ہمارا نبی

آپ کے قصائدِ منقبت بھی نہایت بلند پایہ ہیں اور حُبِ آلِ نبی کے خوبصورت نمونے ہیں ؎

خوشا دلے کہ دہندش ولائے آلِ رسول — خوشا سرے کہ کنندش فدائے آلِ رسول
یا شہیدِ کربلا یا دافعِ کرب و بلا — گُلرخا شہزادۂ گلگوں قبا امداد کُن
نرم نرم از بزم دامن چیدہ رفتہ باد تُند — یا علی چوں بر زبانِ شمعِ مضطر آمدہ
مشکلیں حل کر شہِ مشکل کشا کے واسطے — کربلائیں رد شہیدِ کربلا کے واسطے
رشکِ قمر ہوں، رنگِ رُخِ آفتاب ہوں — ذرّہ ترا جو اے شہِ گردوں جناب ہوں
دُرِ نجف ہوں گوہرِ پاکِ خوشاب ہوں — یعنی تُرابِ رہ گذرِ بوُ تراب ہوں

عشقِ رسولؐ اور حُبِ اہلِ بیت کرام کے اظہار سے حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان قادری بریلوی نے اس نکتے کی جانب توجہ دلائی تھی کہ جنابِ رسالت مآب اور ائمہ اہلِ بیتِ اطہار سے نیاز مندی اور عقیدت کا رشتہ قائم کرنے ہی سے مسلمان اسوۂ حسنہ کے برکات اور سیرتِ ائمہ اہلِ بیت کے حسنات سے بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ خارجی اور وہابی تخفیفِ رسالت مآب اور تقصیرِ اہلِ بیت کے باعث اعلیٰ کردار کے ان مثالی نمونوں کے فیضان سے محروم ہو چکے ہیں۔ ایک مسلمان کی اس سے بڑی حرماں نصیبی اور کیا ہو گی۔ جنابِ رسالتِ مآب کی ذاتِ بابرکات کے

بارے میں دہابیوں کے دلوں میں جو بُغض بھرا ہوا ہے حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان قادری بریلوی نے اس کی جا بجا مذمّت کی ہے ؎

شرک ٹھہرے جس میں تعظیمِ حبیب   اُس بُرے مذہب پہ لعنت کیجئے
ظالمو محبوب کا حق تھا یہی   عشق کے بدلے عداوت کیجئے
بیٹھتے اُٹھتے حضورِ پاک سے   التجا و استعانت کیجئے

مختصر یہ کہ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان قادری بریلوی قدس سرّہٗ نے بار بار اس امر کی جانب توجّہ دلائی ہے کہ ؎

راہ دان و راہ بین و راہبر
درحقیقت نیست بجز خیر البشر

سیّد علی عباس جلالپوری
مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۷۸ء

مولانا شاہ احمد رضا خاں

چند یادیں

(از سید الطاف علی بریلوی)

برِ صغیر پاک و ہند میں جماعت اہلِ سنت کے سب سے بڑے شیخ حضرت مولانا احمد رضا خان المعروف "اعلیٰ حضرت" رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ آپ کا سنِ پیدائش ۱۸۵۶ء اور سنہ وفات ۱۹۲۱ء تھا۔ حضرت کی سوانح حیات پر متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اسی طرح خود آپ کا ترجمۂ کلام مجید و دیگر بلند پایہ تصانیف بہ تعداد کثیر اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ مندرجۂ ذیل سطور میں راقم صرف ان چیزوں کو بیان کرنا چاہتا ہے جن سے وہ متاثر رہے اور جو اس کی چشم دید ہیں۔

اعلیٰ حضرت کے وصال کے وقت میری عمر سولہ[۱۶] سال تھی لیکن قدرت کا مجھ پر احسان تھا کہ میرا شعور نمعلوم کب سے بیدار ہو چکا تھا۔ اور اس اعتبار سے کہ مجھے اپنے بزرگان عہد سے عشق تھا، میں کہہ سکتا ہوں کہ

ع مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا

ہوش سنبھالتے ہی میں نے پیلی بھیت کے حضرت شاہ محمد شیر میاں رحمۃ اللہ علیہ۔ حضرت شاہ نیاز احمد صاحب رحمت اللہ علیہ اور حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کے اسمائے گرامی اپنے گھر اور گرد و پیش، ہر کس و ناکس سے عزت و احترام کے ساتھ سنے۔ اول الذکر بزرگ بہت پہلے انتقال کر چکے تھے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب

کا وصال میرے سامنے ہوا اور میں ان کی نماز جنازہ میں شریک ہوا۔ حضرت کی میت ان کی جائے قیام محلہ سوداگران سے شہر کے باہر تین چار میل کے فاصلہ پر دریائے رام گنگا کے کنارے واقع عیدگاہ، جہاں وہ عیدین کی نماز پڑھایا کرتے تھے، لے جائی گئی۔ اس وقت سخت گرمی اور دھوپ تھی، لیکن اس کے باوجود جلوس اور نماز میں کم از کم دس ہزار عقیدت مندوں کا ہجوم تھا۔ جس میں ہر طبقے کے لوگ، بڑے بڑے رؤسا اور شہر کوتوال عبدالجلیل صاحب بھی شامل تھے۔ اس روز پورے شہر میں ہر شخص کو بے پناہ صدمہ تھا اور گھر گھر صف ماتم بچھی ہوئی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے درمیان عصر و مغرب حضرت کو محلہ سوداگراں کی مسجد سے متصل ایک شمال رویہ قطعہ اراضی پر سپرد خاک کیا گیا۔ بعد کو اسی جگہ آپ کا مقبرہ تعمیر ہوا جس کی چھت پر جماعتِ اہلِ سُنّت کے بڑے بڑے اجتماعات ہونے لگے۔

میرے دادا سید اصغر علی صاحب، شاہ محمد شیر میاں پیلی بھیتوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور والد سید اسحاق علی (بھائی جان) کسی سے بیعت نہیں تھے، آخر عمر میں البتہ انہیں ایک درویش سے دلی رغبت ہو گئی تھی۔ جنہوں نے اچانک نمودار ہو کر والد صاحب کی نماز جنازہ پڑھائی۔ مجھے ان درویش کی متعدد بار زیارت نصیب ہوئی لیکن نام یاد نہیں رہا۔ یہ بھی یاد نہیں کہ والد صاحب ان سے بیعت ہو گئے تھے یا نہیں۔ میری ننھیال کے سب لوگ مولانا احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ نانا سید شجاعت علی صاحب خنداں، نانی صاحبہ، میری والدہ اور خالہ صاحبہ (جو بفضلہٖ ہنوز انارکلی لاہور میں حیات ہیں) نیز میرے دونوں ماموں حاجی سیّد ایوب علی صاحب رضوی اور سید مشتاق علی صاحب رضوی نہ صرف بیعت تھے بلکہ والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ بڑے ماموں حاجی سید ایوب علی جن کا ابھی چند سال پہلے لاہور میں بعمر ۹۵ سال انتقال ہوا، ساری زندگی اپنے پیرِ طریقت کی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف رہے۔ آں مرحوم ۲۶ سال تک مسلسل حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کے پیش کار رہے۔ خطوط و مضامین کا املا لیتے، مراسلت کا ریکارڈ رکھتے۔ مولانا کی تصانیف اور کتاب خانہ کی نگہداشت رکھتے۔

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب نے اگرچہ صرف ۶۵ سال عمر پائی لیکن عنفوان شباب ہی سے

"بزرگی بعقل است نہ بسال"

کی مثل ان پر صادق رہی۔ بلا استثنا ہر شخص ان کو "اعلیٰ حضرت" یا "بڑے مولانا" کہتا تھا۔

کثرت عبادت و ریاضت اور تحقیق علمی میں بے پناہ مصروفیت اور کسی قسم کی سیر و تفریح یا ورزش جسمانی سے عدم توجہی کے باعث نا معلوم وہ کب سے ضعیف العمر نظر آتے تھے۔ دولت خانہ کے قریب ہی اپنی مسجد میں پانچوں وقت نماز با جماعت کے لیے تشریف لاتے تو ان کی آہستہ خرامی دیدنی ہوتی تھی۔ سلیم شاہی جوتا۔ ایک برکا پائجامہ، گھٹنوں سے نیچا کرتہ، اس پر انگرکھا یا شیروانی اور پھر اس پر عبا پہنتے، سر پر اوسط سائز کا عمامہ جس میں سے پیچھے گردن پر چھوٹی چھوٹی حنائی زلفیں نظر آتی تھیں۔ بڑی بڑی پُرکشش آنکھیں، گندمی رنگ۔ گھنی شرعی ڈاڑھی تھی، لیکن کمال یہ تھا کہ ہمیشہ نظریں نیچی رکھتے تھے، کبھی کسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہ دیکھتے۔

خواب گاہ میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ فرش کی دری اس کے قالین اور دوسرے فرنیچر پر صرف کتابیں نظر آتی تھیں۔ حد یہ کہ پلنگ کے تین جانب کتابوں کی باڑیں لگی رہتی تھیں۔ پائینتی کی طرف البتہ جگہ خالی رکھی جاتی۔ لکھتے تو قلم بہت تیز چلتا تھا۔ اس کی روانی دیکھنے کے قابل ہوتی۔

علوم دینی میں مولانا کا جو مرتبہ اور مقام تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال نے ان کو امام ابو حنیفہ ثانی کہا ہے۔

نعت گوئی میں حضرت اور ان کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا خان حسن نے جو بے مثل مقبولیت حاصل کی اس پر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ میلاد شریف کی قریب قریب ہر محفل میں ان کا کلام پڑھا جاتا اور ان کے پڑھنے والے مثل مولوی عبد الجلیل نے خوب نام پیدا کیا۔ وہ ہندوستان کے طول و عرض میں بلائے جاتے۔ مولانا کے نعتیہ دیوان "حدائق بخشش"، کے نسخے گھر گھر بانٹے جاتے اور خواتین

بھی اپنی زنانہ محفلوں میں ان کو خوش الحانی سے پڑھتی تھیں۔

خود مولانا صاحب کے یہاں ۱۲ ربیع الاول کو خاص الخاص اہتمام سے محفل میلاد ہوتی جس میں یہ قاعدہ تھا کہ داڑھی رکھنے والوں کو تبرک کا ڈبل حصہ اور بے داڑھی والوں کو ایک حصہ دیا جاتا۔ کم عمری کی وجہ سے میں بے ریش و بروت تھا اس لیے مجھ کو بھی اکہرا ہی حصہ ملتا تھا۔ بچپن کے سنے ہوئے درج ذیل اشعار اکثر یاد آتے ہیں۔

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام　　شمع بزم ہدایت پہ لاکھوں سلام

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں　　تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

بھر کے گلی گلی تباہ، ٹھوکریں سب کی کھائے کیوں
دل کو جو عقل دے خدا تیری گلی سے جائے کیوں

یا الٰہی جب رضا خواب گراں سے سر اٹھائے
دولت بیدار عشق مصطفےٰ کا ساتھ ہو

واہ کیا جود و کرم ہے شہ بطحا تیرا
نہیں، سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

دل درد سے بسمل کی طرح لوٹ رہا ہو
سینہ پہ تسلی کو ترا ہاتھ دھرا ہو

دینے والے تجھے دینا ہو تو اتنا دے دے
کہ مجھے شکوۂ کوتاہیٔ داماں ہو جائے

مولانا کے قائم کردہ مدرسۂ دینی کا سالانہ جلسۂ دستار بندی حافظ الملک حافظ رحمت خان شہید کی ہمشیرہ کی بنوائی ہوئی عظیم الشان مسجد واقع بزریہ بہاری پور میں جو "بیوی جی کی مسجد" کہلاتی تھی، بڑی دھوم دھام سے ہوتا تھا۔ جس میں مولانا کے ہم مشرب جید علماء اپنے مواعظ حسنہ سے عوام الناس کو فیض یاب کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت بھی بہ نفس نفیس زینت دہ منبر ہوکر کثیر التعداد حاضرین کے ہوش عقیدت کا محور ہوتے۔ عجب روح پرور نظارہ ہوتا تھا۔ درج ذیل علمائے کرام کی زیارت اور ان کے مواعظ حسنہ سننے کا شرف مجھے زیادہ تر دستار بندی کے ان جلسوں ہی میں حاصل ہوا۔ شاہ علی حسین اشرفی میاں، مولانا ظفر الدین بہاری، مولانا سید دیدار علی شاہ الوری، مولانا قطب الدین برہم چاری، مولانا نعیم الدین مرادآبادی، مولانا عبد العلیم میرٹھی، مولانا سید محمد میاں، مارہروی، مولانا عبد السلام و مولانا برہان الدین صاحب جبلپوری، مولانا امجد علی صاحب اعظمی مصنف بہار شریعت، مولانا عبد الماجد بدایونی اور مولانا حشمت علی صاحب وغیرہم۔

مولانا کے مدرسہ میں قرب و جوار کے طلبہ کے علاوہ آسام۔ بنگال۔ پنجاب۔ سرحد۔ سندھ اور افغانستان تک کے تشنگان علوم دینیہ پڑھتے تھے جنہیں کتب درسی اور قیام و طعام کی سہولت مہیا کی جاتی۔ بکثرت طالب علم شہر کی مساجد میں امامت کرتے۔ انہیں کے حجروں میں قیام کرتے اور اہلِ محلہ ان کے کفیل ہوتے تھے۔ بعض ذہین طلبہ شہر کے بازاروں میں آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں سے آئے دن مناظرے بھی کرتے۔ ایک "دار الافتا" بھی تھا جو استفتاؤں کی روشنی میں ملک کے طول و عرض میں فتوے ارسال کرتا۔ مسلمانوں کے باہمی تنازعات کو بھی شرع شریف کی رو سے طے کرایا جاتا اور ہزاروں لوگ مقدمہ بازی کی تباہ کاریوں سے بچ جاتے۔ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی عظمت روحانی اور ان کے فیصلوں کو بے چون و چرا مخالف فریق تسلیم کرتے تھے۔

حضرت کا معمول تھا کہ بعد نماز عصر صحن مسجد کے شمال مشرقی حصہ میں جہاں ایک سایہ دار درخت بھی تھا تشریف فرما ہوتے، اس مجلس میں حاضری کی اجازت عام تھی۔ بلا روک

ٹوک ہر شخص جو سوال چاہتا کرتا - یہ بابرکت صحبت مغرب کی اذان تک جاری رہتی -
مولانا صاحب کی اس مسجد میں جمعہ کے روز بھی خاصی بھیڑ بھاڑ اور رونق ہوتی جس کی ایک
وجہ یہ بھی تھی - نماز کے لیے ساڑھے تین بجے کا وقت مقرر تھا - سارے شہر کے وہ حضرات
جو اپنے محلوں کی مسجد میں کسی مجبوری سے بر وقت نماز نہ پڑھ سکتے وہ یہاں آجاتے - مولانا
کے ہی ایک مرید کٹرہ مانرائے کے قریب گلی حکیم وزیر علی کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ½ ۱۲ بجے
نماز جمعہ پڑھاتے تھے جس میں ایسے تمام لوگ آتے جنہیں ریل کے سفر یا کسی اور مجبوری کے
باعث جلد نماز جمعہ سے فارغ ہو جانے کی ضرورت ہوتی تھی -

مولانا مالی اعتبار سے بہت ذی حیثیت تھے - معقول زمینداری تھی جس کا تمام تر
انتظام ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد رضا خان صاحب کرتے تھے - مولانا اور ان کے اہل
خاندان کے محلہ سوداگران میں بڑے بڑے مکانات تھے بلکہ پورا محلہ ایک طرح سے انہیں
کا تھا - اس محلہ کے چاروں طرف ہندوؤں کی زبردست آبادی تھی - کوئی ایک راستہ بھی
ایسا نہ تھا جس کے ہر دو جانب کثیر التعداد ہندو نہ رہتے ہوں لیکن مولانا صاحب کا وقار و
جلال کچھ اس طرح کا تھا کہ ہندو مسلم فسادات کی سخت کشیدہ فضا میں بھی کبھی کوئی ناگوار
واقعہ پیش نہ آیا - تقسیم ملک کی ہولناکیوں کا دور بھی گزر گیا اور ان کے چھوٹے صاحبزادے جناب
مصطفٰے رضا خان صاحب اور جملہ اعزہ و متوسلین بخیر و عافیت رہے جسے میں قوت ایمانی اور

ع دشمن اگر قوی ست نگہبان قوی تر ست

کا ایک نادر کرشمہ خیال کرتا ہوں -

مولانا صاحب اپنے مریدوں کا ہر طرح کا خیال رکھتے تھے - ان کی بذل و سخا اور
مرشدانہ شفقت کے صدہا واقعات ہیں جن کو سپرد قلم کیا جائے تو

ع سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

مشتے نمونہ از خروارے یہ ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جب ان کے کسی مرید درمردیا

عورت) کا انتقال ہوتا تو اس کی وصیت یا اس کے اعزہ کی خواہش ہوتی کہ نماز جنازہ مولانا ہی پڑھائیں۔ چنانچہ بریلی جیسے بڑے شہر میں آئے دن مولانا ایک دو جنازوں کی نماز بنفس نفیس پڑھانے تشریف لے جاتے۔ اس سے ان کو کس قدر ایثار نفس کرنا ہوتا ہوگا۔ عیاں راچہ بیان! میں نے غریب سے غریب بستیوں اور نادار سے نادار گھروں میں مولانا کو پہنچتے ہوئے دیکھا۔ جس سے سوگواروں کو اس قدر تسکین خاطر حاصل ہوتی کہ وہ مرنے والے کا بہت کچھ غم بھول جاتے۔

سیاسی نظریہ کے اعتبار سے حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بلاشبہ حریت پسند تھے۔ انگریز اور انگریزی حکومت سے دلی نفرت تھی۔ "شمس العلماء" قسم کے کسی خطاب وغیرہ کو حاصل کرنے کا ان کو یا ان کے صاحبزادگان مولانا حامد رضا خان صاحب و مصطفیٰ رضا خان صاحب کو کبھی تصور بھی نہ ہوا۔ والیان ریاست اور حکام وقت سے بھی مطلق راہ و رسم نہ تھی بلکہ بقول الحاج سید ایوب علی صاحب مرحوم (جن کو ۲۶ سال تک پیش کار رہنے کا اوپر ذکر آچکا ہے) حضرت مولانا ڈاک کے لفافے پر ہمیشہ اُلٹا ٹکٹ لگاتے تھے یعنی ملکہ وکٹوریہ۔ ایڈورڈ ہفتم اور جارج پنجم کے سر نیچے۔ اسی طرح حضرت کا عہد تھا کہ وہ کبھی انگریز کی عدالت میں نہ جائیں گے۔ اس کا سب سے زیادہ مشہور واقعہ جو میرے مشاہدہ میں آیا علمائے بدایوں سے نماز جمعہ کی اذان ثانی نزد منبر یا صحن مسجد میں ہو، کے مسئلہ پر اختلاف تھا جس کی بناء پر مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ اہل بدایوں مدعی تھے اور انہوں نے اپنے ہی شہر کی عدالت میں استغاثہ دائر کیا تھا۔ مولانا صاحب کے نام عدالت سے سمن آیا، اس پر حاضر نہ ہوئے تو احتمال گرفتاری کی بنا پر ہزاروں عقیدت کیش مولانا صاحب کے دولت خانہ پر جمع ہوگئے۔ نہ صرف جمع ہوئے بلکہ آس پاس کی سڑکوں اور گلیوں میں باقاعدہ ڈیرے ڈال دیئے۔ دن رات اس عزم کے ساتھ چوکسی ہونے لگی کہ جب وہ سب اپنی جانیں قربان کر دیں گے تو قانون کے کارندے مولانا کو ہاتھ لگا سکیں گے۔ فدا کاروں اور جان نثاروں کا ہجوم جب بہت بڑھ گیا اور محلہ سوداگران میں تل دھرنے کو جگہ نہ

رہی تو گھنی آبادی سے دور مسجد نو محلہ کے قریب ایک کوٹھی میں حضرت کو منتقل کر دیا گیا۔ اس کوٹھی کے سامنے گورنمنٹ ہائی اسکول کا نہایت وسیع کمپاؤنڈ تھا جس میں کئی لاکھ آدمی سما سکتے تھے۔ اسی کشاکش کے دوران بدایوں کی کچہری میں مقدمہ کی پیشیاں ہوتی رہیں جن میں بکثرت لوگ بریلی سے بھی جاتے تھے۔ اہلِ بدایوں کا بھی خاصا اجتماع ہوتا۔ ایک دوسرے کے مقابل کیمپ لگتے اور ہر لمحہ باہمی تصادم کا خوف رہتا۔ ایک پیشی کے موقع پر میں بھی اپنے چچا صاحب کے ہمراہ گیا تھا اور وہاں پہلی اور آخری بار میں نے اس دور کے مشہور ماہر قانون جناب مولوی حشمت اللہ بارایٹ لاء کو دیکھا۔ یہ سر سید کے دوست تھے ۱۸۹۸ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ دہلی کے صدر ہوئے تھے۔ فی الوقت میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ مولوی حشمت اللہ صاحب ہی کی کوشش سے مقدمہ مذکورہ اس طرح خارج ہو گیا کہ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی آن قائم رہی۔ یعنی وہ ایک مرتبہ بھی حاضرِ عدالت نہ ہوئے اور نہ انہوں نے زبانی یا تحریری کسی قسم کی معذرت خواہی کی۔ کیونکہ بعد ازاں انتہائی وسیع پیمانہ پر مبارکبادیوں کا سلسلہ کئی ہفتے جاری رہا۔ محلہ محلہ اور کوچہ کوچہ سے جلوس نکل کر سڑکوں پر اس طرح گشت کر کے مولانا صاحب کے دولت کدہ پر پہنچتے کہ جھڑکاؤ ہوتا جاتا۔ گلاب پاشی ہوتی اور میلاد خوانوں کی ٹولیاں گلوں میں ہار ڈالے جھوم جھوم کر جوش و خروش کے ساتھ خود مولانا کا نعتیہ کلامِ بلاغت نظام پڑھتے جاتے، مٹھائی اور ہار پھولوں کی خوان پوش سینیاں بھی ساتھ جاتیں جو منزلِ مقصود پر حضرت کی خدمت اقدس میں پیش کر دی جاتیں۔ حضرت ان سب چیزوں کو مجمع میں تقسیم کرا دیتے۔

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی زندگی کا تاریخی اہمیت رکھنے والا واقعہ تحریک خلافت و ترک موالات کے تحت ہندو مسلم اتحاد یعنی ہندوستان میں ہر دو اقوام کی متحدہ قومیت کی تحریک کی پُر زور مخالفت تھا۔ اس وقت صورت یہ تھی کہ جنگ طرابلس و بلقان۔ المیۂ مسجد کانپور اور پہلی جنگِ عظیم میں سلطنت ترکی کی مکمل

تباہی نے عامۃ المسلمین کو انگریزوں سے حد درجہ بدظن کر دیا تھا۔ ہندو بھی بعد از جنگ حکومت کی جانب سے موجودہ حکومت خود اختیاری نہ دیئے جانے اور جلیاں والا باغ کے ہولناک قتل عام کی وجہ سے سخت مشتعل تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے خلاف تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت زور شور سے شروع ہو گئی جس میں ہندو اور مسلمان متفقہ طور پر بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ہندو مسلم بھائی بھائی اور متحدہ قومیت کا جذبہ اس قدر عروج کو پہنچ گیا تھا کہ آریہ سماجی لیڈر شردھانند جیسے اسلام دشمن کو جامع مسجد دہلی میں تقریر کے لیے لا کھڑا کیا گیا۔

انگریز دشمنی میں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، مولانا احمد رضا خان صاحب اور ان کے متبعین بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ لیکن ان کے یہاں ہندو دوستی بھی پسند نہیں کی جاتی تھی اور وہ مشرکین سے موالات کو ملتِ اسلامیہ کے لیے خودکشی کے مترادف سمجھتے تھے۔ لہٰذا ان کی جانب سے مخالفت کا زبردست دھماکہ ہوا۔ ایسا دھماکہ کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی گونج دور دور پہنچ گئی۔ سرسید کی طرح مولانا کو یقین تھا کہ مسلمان ہندو قومیت میں ضم ہو گئے تو نہ صرف ان کا دین و ایمان خراب ہو جائے گا بلکہ ملک میں ان کا سیاسی مستقبل بھی تاریک ہو جائے گا۔ انگریزوں کے جانے کے بعد جو جمہوری نظام حکومت قائم ہو گا اور مذہبی بنیاد پر اکثریت و اقلیت کا تعین ہو گا اس میں مسلمانوں کی نمائندگی برائے نام رہ جانے کے باعث وہ اپنے قومی و ملی تشخص سے بالکلیہ محروم ہو جائیں گے۔ ان کا مذہب۔ کلچر اور زبان سب فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے۔ اسی تاثر کے تحت حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب اور ان کی جماعت اہلِ سنت کے ارکان و اکابر نے ہندوستان کے طول و عرض کے دورے کئے۔ گھر گھر پیغام حق پہنچایا۔ کانگریسی مسلمانوں، بالخصوص جمیعۃ العلمائے ہند اور فرنگی محلی علماء سے بڑے بڑے معرکہ کے مناظرے اور مقابلے ہوئے۔ اور یہ ان کی حق گوئی کا نتیجہ تھا کہ چند سال نہ گزرنے پائے تھے کہ ہندو مسلم موالات کا طلسم ٹوٹ گیا۔ روزمرہ کی زندگی اور سرکاری و نیم سرکاری محکموں میں ہندوؤں کی جارحانہ بالادستی اور خود غرضی کھل کر سامنے آ گئی۔

شدھی سنگھٹن کی قابل نفرت تحریک نے بھی جنم لے کر آناً فاناً ہولناک صورت اختیار کرلی۔ بظاہر غیر متعصب ہندو کانگریسی رہنماؤں کی مسلم دوستی کی بھی نہرو رپورٹ کی شکل میں حقیقت عیاں ہوگئی۔

ان حقائق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر سید نے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اس کو پورے زور شور کے ساتھ عملی جامہ حضرت مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے عقیدت کیشوں نے پہنایا[۵۱]۔ بعد ازاں حضرت قائد اعظم نے ۱۹۳۶ء سے اس نظریہ کو نہایت منظم بنیادوں پر پایۂ تکمیل کو پہونچایا۔ اور پاکستان وجود میں آگیا۔

الغرض مندرجہ بالا سطور سے واضح ہوا ہوگا کہ حضرت مولانا احمد رضا خان اپنے افکار۔ نظریات۔ کردار اور علوم دینی میں اعلیٰ مقام رکھنے کے باعث انیسویں صدی عیسوی کے رُبع آخر اور بیسویں صدی کے ربع اول میں ایک انقلاب آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ اور ان کی چلائی ہوئی تحریکِ اصلاح اس قدر موثر تھی کہ اس کے اثرات آج بھی آب و تاب کے ساتھ برِّ صغیر پاک و ہند میں بالخصوص اور عالم اسلام میں بالعموم پوری قوت کے ساتھ کارفرما ہیں ؎

فانی ز حیاتِ من آشفتہ چہ پرسند ۔۔۔ مرگے است کہ از ہستی جاوید پیام است

سید الطاف علی بریلوی ۵/۷۷ ۲۸

---

۵۱ سر سید نے جو دو قومی نظریہ پیش کیا تھا اس میں اور اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ کے مقاصد میں روشن فرق تھا۔ سر سید عملاً نصاریٰ کی ہی محبت میں ۱۸۵۷ء کے مجاہدین کے خلاف انگریزوں کا حامی ہے وہ انگریزوں کی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو کی مشین کا ایک آلہ تھے۔ سر سید انگریزوں کی حکومت کی اطاعت کو فرض سمجھتے تھے۔ لیکن اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ نے اپنے بزرگوں حضرت مولانا فضل حق خیر آبادی، حضرت مولانا فیض احمد بدایونی، حضرت مولانا کفایت علی حسین کافی رحمہم اللہ تعالیٰ وغیرہم کی طرح انگریزی حکومت کو کبھی تسلیم نہ کیا تھا جس کا اظہار فاضل مضمون نگار کے مضمون سے بھی ہوتا ہے۔ مرید احمد چشتی

چند یادیں۔ چند تاثرات

از جناب سید محمد جعفر شاہ پھلواروی

کئی وجوہ سے مجھے حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک یہ کہ انہیں ندوۃ العلماء لکھنؤ سے سخت اختلاف تھا۔ اور اس کے بانیوں پر بھی اسی طرح نام بنام فتوائے کفر لگایا جس طرح دوسرے دیوبندیوں اور وہابیوں پر لگایا تھا۔

۲۵/۱۹۲۶ء کا ذکر ہے کہ لکھنؤ کے بھرے اجلاس ندوہ میں ہمارے مرشد و والد مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کی زبان سے میں نے حضرت فاضل بریلوی کی تبلیغی مساعی کی تعریف بھی سنی ہے اور جماعت رضائے مصطفیٰ کی سرگرمیوں کو سراہتے سُنا ہے۔ اس وقت میں فارغ التحصیل ہو چکا تھا اور ازدواجی زندگی میں بھی منسلک ہو چکا تھا۔ لطف یہ کہ میری شادی ایک ایسی خاتون سے ہوئی تھی جو دوطرفہ "وہابیت" میں گھری ہوئی تھی۔ یعنی ایک طرف تو وہ سید احمد بریلوی کی خواہرزادی تھیں اور دوسری جانب نواب سید صدیق حسن کی پڑنواسی تھیں۔ اس دوطرفہ نسبت کے باوجود خود وہ نہایت خوش عقیدہ تھیں۔ یہاں تک کہ بعض مواقع پر مجھے "خام خوش عقیدگی" کا طعنہ بھی دیتی تھیں ۔۔۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ حضرت فاضل بریلوی تحریک ترک موالات کے جتنے خلاف تھے میں اتنا ہی حامی تھا۔ اسی حمایت کی وجہ سے میں نے انگریزی تعلیم چھوڑ کر عربی تعلیم شروع کی تھی۔ میں دسویں میں تھا۔ اور میرے بڑے بھائی مولانا شاہ غلام حسنین صاحب سلیمانی بی۔ اے میں تھے۔ دونوں نے انگریزی تعلیم گاہوں سے اسٹرائک کی اور دونوں ندوۃ العلماء میں داخل ہو گئے۔

اسی طالب علمی کے دوران ہم دونوں اجمیر شریف کے عُرس میں گئے واپسی میں چند

دنوں کے لیے بریلی اتر پڑے۔ یہاں ہمارے بہت سے پیر بھائی تھے اور اب بھی ہیں۔ ہمیں ہفتے کے دن ندوے میں حاضر ہونا تھا۔ اس لیے رائے یہ ہوئی کہ جمعے کو دوپہر کی گاڑی سے سیدھے لکھنؤ روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ مسافرت کی وجہ سے ہم پر جمعہ واجب نہ تھا۔ ایک بگھی گاڑی پر ہم دونوں اور ہمارے میزبان بریلی ریلوے اسٹیشن (خورد) کی طرف روانہ ہو گئے۔ خورد سے مراد چھوٹی لائن ہے (اس وقت کی بی، این، ڈبلیو، آر) بڑی لائن پر ای، آئی، آر اور چھوٹی پر بی، این، ڈبلیو، آر چلتی تھی۔

ہماری بگھی روانہ ہوئی اور اسٹیشن سے کوئی آدھے فرلانگ کے فاصلے پر بگھی کا ایک گھوڑا اڑ گیا۔ کوچبان نے چابکیں لگائیں مگر وہ آگے نہ بڑھا۔ اس نے موڑ کر پھرا دیا مگر اس نے آگے چلنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں ہم نے گاڑی کو اسٹیشن پر آتے دیکھا۔ اطمینان تھا کہ ابھی وقت ہے، سوار ہو جائیں گے۔ کوچبان نے پھر چابکیں رسید کرنی شروع کیں۔ گھوڑا کبھی دولتیاں جھاڑتا، کبھی الف ہونے کی کوشش کرتا، کبھی سر اور گردن نیچے اوپر کرتا مگر آگے نہ بڑھتا۔ اسباب ساتھ ہونے کی وجہ سے پیدل بھاگ کر ٹرین پر سوار نہ ہو سکتے تھے۔ اس انتظار میں بیٹھے رہے کہ ذرا دیر میں ہماری بگھی گاڑی اسٹیشن پر پہنچا ہی چاہتی ہے۔ کوچبان نے چابک مارتے مارتے ادھ موا کر دیا مگر وہ ایسا ضدی نکلا کہ ایک قدم آگے نہ چلا۔ یہاں تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ٹرین سیٹی بجا کر چل دی اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ واپس ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ واپسی پر دونوں گھوڑے نہایت خوش مزاجی کے ساتھ بلا عذر گھر تک پہنچا گئے۔ جمعے کی نماز ختم ہو چکی۔ لیجیے نماز جمعہ بھی گئی اور گاڑی بھی نہ ملی۔ "نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم" والا معاملہ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اب بریلی میں کسی جگہ جمعہ نہیں مل سکتا۔ صرف ایک جگہ مل سکتا ہے۔ جہاں خاصی تاخیر سے جمعہ ہوتا ہے۔ ہم لوگ اطمینان سے وضو کر کے روانہ ہوئے اور ایک مسجد میں پہنچ کر دوسری صف میں بیٹھ گئے۔ مسجد بڑی جلدی پُر ہو گئی۔ ذرا دیر کے بعد دیکھا کہ ساری مسجد کے لوگ کھڑے ہو گئے اور فضا درود کی آواز سے گونج گئی۔ دیکھا کہ ایک کرسی پر ایک بزرگ جلوہ افروز ہیں۔ اور چند آدمی کرسی کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔

اگلی صف میں ایک ضعیف اور بیمار آدمی آکر بیٹھ گیا۔ اذان ہوئی۔ خطبہ ہوا اور نماز کے لیے وہ بیمار کھڑا ہوا تو اپنے ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ اپنا عصا پکڑے ہوئے تھا۔ سجدہ ہوتا تو عصا زمین پر رکھ دیتا اور قیام کے وقت پھر عصا سنبھال لیتا۔ نماز ہوئی، سنتیں ہوئیں تو دیکھا کہ ایک بڑا گاؤ تکیہ اسی مسجد میں لاکر رکھ دیا گیا جس سے ٹیک لگاکر وہ بیمار نیم دراز ہوگیا۔ میانہ قد، سر پہ ہلکا بادامی عمامہ (غالباً "ٹسر" کا) جسم پر عبا، داڑھی لمبی گھنی اور سفید، رنگ گندمی، جسم دوہرا مگر اس وقت دُبلا، آواز رعب دار لیکن اُس وقت رقت انگیز اور رقت آمیز۔ اور چار آدمی بیعت کے لیے آئے ان میں ایک نابینا تھا۔ یہ نابینا دس بارہ سال بعد کپور تھلہ ریاست میں مجھ سے ملنے آیا اور اثنائے گفتگو میں جب اس واقعے کا ذکر آیا تو اس نے بتایا کہ: انہی چاروں میں کا ایک میں ہوں۔ "بیعت کے دوران ان سے یہ عہد بھی لیا گیا کہ ہم کسی دیوبندی، کسی وہابی، کسی شیعہ اور کسی قادیانی کے پیچھے نماز ہرگز نہیں پڑھیں گے۔ ہم ڈر رہے تھے کہ اگر اس نے "دو کسی ندوی" بھی کہہ دیا تو ہم کیا کریں گے۔ مگر اس مرد ضعیف نے ایسی کوئی بات زبان سے نہ نکالی۔

بیعت کے بعد اس ضعیف مریض نے اپنی نحیف مگر درد و اثر بھری آواز میں چند وداعی کلمات کچھ اس طرح کہے:

"میری طرف سے تمام اہلِ سنّت مسلمانوں کو سلام پہنچا دو اور میں نے کسی کا کوئی قصور کیا ہو تو میں اس سے بڑی عاجزی سے اس کی معافی مانگتا ہوں۔ مجھے خدا کے لیے معاف کر دو یا مجھ سے کوئی بدلہ لے لو۔" وغیرہ وغیرہ

اس وقت حاضرین چاروں طرف سے اس ضعیف کو گھیرے ہوئے تھے اور سب کے سب متاثر ہو رہے تھے۔ کوئی سسکیاں بھر رہا تھا اور کوئی خاموش رو رہا تھا۔ میں ذرا سخت دل واقع ہوا ہوں۔ اس لیے میں نے کوئی اثر نہ قبول کیا لیکن میرے بھائی حضرت مولانا شاہ غلام حسنین ندوی بی اے (رحمۃ اللہ علیہ) جو بڑے رقیق القلب تھے، ان وداعی کلمات سے خاصے متاثر ہوئے جس کا اظہار انہوں نے واپسی میں

بھی کیا۔

یہی پیرِ ضعیف تھے حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ترکِ موالات یعنی NON CO-OPERATION کی تحریک جب تک زوروں پر رہی، مجھے فاضلِ بریلوی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ترکِ موالاتیوں نے اُن کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ نعوذ باللہ وہ سرکارِ برطانیہ کے وظیفہ یاب ایجنٹ ہیں۔ اور تحریک ترکِ موالات کی مخالفت پر مامور ہیں۔ مجھے کئی بزرگوں کے متعلق یہی بات سنائی گئی جن میں بعض کے متعلق غلط ہونے کا یقین و علم پہلے ہی سے تھا۔ دراصل ہر دَور میں کسی کو بدنام کرنے کے لیے کوئی چلتا ہوا اصطلاحی لفظ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ جس کے تماشے میں اپنی زندگی میں بہت دیکھ چکا ہوں۔ فلاں شخص جاسوس ہے۔ فلاں ٹوڈی بچہ ہے۔ فلاں وہابڑا ہے۔ فلاں کمیونسٹ ہے۔ فلاں شراب پیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی خبریں خواہ ایک فیصد بھی اپنے اندر صداقت نہ رکھتی ہوں لیکن عام لوگ کسی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے بلکہ کوئی ثبوت طلب کئے بغیر ہی اس خبر پر ایمان لے آتے ہیں۔ ایسے مواقع کے لیے یہ محاورہ بنا ہے کہ: کوّا کان لے اڑا۔ تحریک ترکِ موالات کے جوش میں تحقیق کا ہوش نہ تھا۔ اس لیے ایسی افواہوں کو غلط سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ لیکن جیسے جیسے شعور آتا گیا مذہبی تعصب اور تنگدلی کا رنگ ہلکے سے ہلکا ہوتا چلا گیا اور اب جناب فاضلِ بریلوی کے متعلق میرے تاثرات یا دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ وہ علومِ اسلامیہ، تفسیر، حدیث، فقہ پر عبور رکھتے تھے منطق، فلسفے اور ریاضی میں بھی کمال حاصل تھا۔ عشقِ رسول کے ساتھ ادبِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں اتنے سرشار تھے کہ ذرا بھی بے ادبی کی برداشت نہ تھی۔ کسی بے ادبی کی معقول توجیہہ و تاویل نہ ملتی تو کسی رُد رعایت کا خیال کئے بغیر اور کسی بڑی سے بڑی شخصیت کی پروا کئے بغیر دھڑسے فتویٰ لگا دیتے اور تکفیر سے نیچے کوئی فتویٰ ان کے پاس نہ تھا۔ انہیں حُبِّ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہٖ و اصحابہٖ و بارک وسلم میں اتنی زیادہ فنائیت حاصل تھی کہ غلو کا پیدا ہو جانا

بعید[1] نہ تھا۔ تقاضائے ادب نے انہیں بڑا حساس بنا دیا تھا۔ اور اس احساس میں جب خاصی نزاکت پیدا ہو جائے تو مزاج میں سخت گیری کا پہلو نمایاں ہو جانا کوئی متعجب کی بات نہیں۔ اگر بعض بے ادبانہ کلمات کو جوشِ توحید پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ تو تکفیر کو بھی محبت و ادب کا تقاضا قرار دیا جا سکتا ہے[2] اس لیے فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان رحمۃ اللہ علیہ کو میں اس معاملے میں معذور سمجھتا ہوں۔ لیکن یہ حق صرف اُسی کے لیے مخصوص جانتا ہوں جو فاضلِ موصوف کی طرح فنافی الحبّ والادب ہو۔

حضرت فاضل بریلوی کی محبّ رسول ہی تھی جس نے نعتوں کا پیکر اختیار کیا۔ نعت کہتے وقت وہ کوئی قافیہ نہیں چھوڑتے تھے۔ اس لئے نعت عموماً طویل ہو جاتی تھی۔ لہٰذا تمام اشعار مضامین اور زبان کے لحاظ سے یکساں وزنی نہیں ہوتے تھے۔ بعض اشعار تو ایسے انوکھے ہوتے تھے کہ ان کا جواب مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ اور ایک مثال سن لیجئے:

لحد میں عشقِ رخِ شہ کا داغ لے کے چلے　　　اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

اس گلی کا گدا ہوں میں جس میں　　　مانگتے تاجدار پھرتے ہیں

عصائے کلیم اژدہائے غضب تھا　　　گروں کا سہارا عصائے محمد

رضائے محمد رضائے الٰہی۔　　　رضائے الٰہی رضائے محمد

یہی عہد باندھے ہیں وصلِ ابد کا　　　رضائے خدا اور رضائے محمد

مولانا کو تاریخ گوئی میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ انہوں نے بے شمار کتابیں لکھیں

---

[1] پھلواروی صاحب کو جب خود اعتراف ہے کہ جب معقول توجیہ و تاویل نہ ملتی تو تب ہی اعلیٰ حضرت فتویٰ لگاتے تھے۔ تو اس کو غلو سے تعبیر کرنا چہ معنی دارد۔　　　مرید احمد چشتی

[2] جوشِ توحید کا یہ مطلب نہیں کہ نعوذ باللہ انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں گستاخی کی جائے۔ بلکہ خود معاذاللہ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی امکان کذب کا عقیدہ تراشا جائے۔

مرید احمد چشتی

لیکن ہر کتاب کا نام ایسا رکھا جس سے مقصدِ کتاب پر بھی روشنی پڑے اور اسی نام سے تاریخ طباعت بھی نکل آئے یہ خصوصیت شاید ہی کسی دوسرے مصنّف کو حاصل ہوئی ہوگی۔

موصوف کا وصیّت نامہ میں نے لفظ بلفظ پڑھا ہے۔ یہ اپنی وفات سے دو گھنٹے پہلے لکھا تھا۔ بعض پڑھے لکھے لوگوں کو اس وصیّت نامے کا مذاق اڑاتے دیکھا ہے۔ کیونکہ اس میں اشیائے خورد و نوش کی فہرست بھی ہے جو ممدوح نے اپنی سالانہ فاتحہ کے موقعے پر تقسیم کرنے کی وصیّت فرمائی تھی۔ لیکن مذاق اڑانے والوں کی نگاہوں سے یہ پہلو اوجھل رہتا ہے کہ موصوف اس بہانے ان غریبوں کو بہرہ اندوز کرنا چاہتے تھے جنہیں یہ نعمتیں شاذ و نادر ہی میسّر آتی ہیں۔

حضرت فاضل بریلوی کے بہت سے ہم مسلک یا شاگرد ہیں جن سے میرے مراسم رہے ہیں۔ مثلاً مولانا سید نعیم الدین مرادآبادی، مولانا امجد علی۔ مولانا سید محمد کچھوچھوی۔ مولانا ظفر الدین عظیم آبادی۔ مولانا حکیم سید ابوالحسنات (مسجد وزیر خان لاہور) مولانا عبد العلیم میرٹھی اور مولانا حشمت علی خان یہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ بہتیرے جلسوں اور دوروں میں ان حضرات کا ساتھ رہا۔ ساری صحبتوں کو تو یہاں قلمبند نہیں کیا جا سکتا۔ چند صحبتوں کا حال سُن لیجئے:

مولانا سیّد نعیم الدین رحمۃ اللہ علیہ

سن یاد نہیں مولانا نعیم الدین رحمۃ اللہ علیہ سے جالندھر اسٹیشن پر ملاقات ہوگئی۔ وہ کہیں سے آ رہے تھے۔ اور میں اسی ڈبے میں سوار ہوا جس میں مولانا تشریف رکھتے تھے۔ اس اچانک ملاقات سے ہم دونوں بہت مسرور ہوئے۔ پاس ہی مجھے فراغت سے جگہ مل گئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں اثنائے گفتگو میں میں نے ایک کتابچہ "نشانِ اُردو" ان کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ ایک لیکچر ہے جو میں نے مدرستہ البنات جالندھر کے سالانہ اجلاس میں دیا تھا۔ اور مدرسے ہی نے اسے کتابی شکل

میں شائع کیا۔ اس میں اُردو زبان کا تفوق دوسری رائج الوقت زبانوں پر دکھایا گیا تھا۔
اس زمانے میں بعض ہندوؤں اور کانگریسیوں کی طرف سے اُردو کے خلاف مہم چلائی جا
رہی تھی۔ اور اس کے سارے عام فہم عربی و فارسی الفاظ کو بھی ثقیل سنسکرت الفاظ سے
بدل کر اسے "ہندوستانی زبان" کا نام دیا گیا تھا۔ ریڈیو تک میں یہ تصرفات شروع
کر دیئے گئے تھے۔ میرا لیکچر اسی مہم کے خلاف تھا۔ اسے پورے مجمع نے بے حد سراہا،
جسے بعد میں قلمبند کر کے چھپوا دیا گیا۔ مولانا نے یہ لیکچر پڑھنا شروع کیا تو ایک ہی نشست
میں ختم کر لیا۔ درمیان میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ کتابچہ ختم کرنے کے بعد فرمایا: آپ نے بہت
جم کے یہ مضمون لکھا ہے اور اب تک اُردو پر ایسا کوئی مضمون میری نظروں سے نہیں گزرا
ہے۔ لیکن اس مضمون کا لطف آدھا رہ گیا کیونکہ اس میں جو اشعار اور گیتوں کے نمونے ہیں
ان کو جب تک آپ ہی کی زبان سے اسی ترنم کے ساتھ نہ سُنا جائے تب تک لطف
مکمل نہیں ہوگا۔ ادھورا ہی رہے گا۔"

مولانا کی طرف سے دراصل یہ ایک فرمائش تھی لیکن میں اسے بر وقت اس لیے
پورا نہ کر سکا کہ مسافروں کے عام مجمع میں یہ کچھ مناسب نہ معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ ریل
کی گھڑگھڑاہٹ بھی حائل ہو رہی تھی۔

ایک دوسرے موقعے پر سفر ہی میں مولانا سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو میں
نے پوچھا کہ: تارک الصلوٰۃ کی نماز جنازہ پڑھنی چاہئے یا نہیں جبکہ قرآن اسے مشرکوں
کی صف میں شمار کرتا ہے۔

کہنے لگے: آپ کے پیش نظر شاید یہ آیت ہے۔ أقیموا الصلوٰۃ ولا تکونوا
من المشرکین الخ ـــــ

میں نے کہا: جی ہاں یہ آیت بھی ہے اور دوسری بے شمار آیات و احادیث
بھی ہیں جن میں نماز کو اسلام کا اہم ترین ستون قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا جس کا تعلق
زندگی میں نماز سے نہ رہا ہو اس کا مرنے کے بعد نماز سے کیا تعلق رہ سکتا ہے؟
اُس وقت میں اس مسئلے میں متشدد تھا۔ اس لیے اپنے دلائل پیش کرتا رہا مثلاً

یہ کہ فقہ حنفی میں ڈاکو (قاطع الطریق) کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جاتی اور آنحضور نے تو ایک قرضدار اور ایک خودکشی کرنے والے کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار فرما دیا اور بے نمازان سب سے زیادہ مجرم ہے وغیرہ وغیرہ۔

مگر مولانا نے اس سے اتفاق نہ کیا اور فرمایا کہ ہمیں اتنا تنگ دل نہیں ہونا چاہیئے۔ ہاں اگر اسے نماز کی فرضیت سے انکار ہو تو بلا شبہ اس کی نماز جنازہ پڑھنے سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

کہہ نہیں سکتا کہ اس وقت تک فتاویٰ رضویہ کی طباعت و اشاعت ہو چکی تھی یا نہیں۔ بہر حال اس میں ایک جزئیہ میری تائید میں ملتا ہے جو یوں ہے:-

مسئلہ ۲۶۲ . . . .

. . . . رہی نماز جنازہ وہ اگر چہ ہر مسلمان ساعی فی الارض بالفساد کے لیے فرض ہے۔ وھذا منہ کقاتل نفسہ . . . . مگر فرض عین نہیں، فرض کفایہ ہے۔ پس اگر علماء فضلاء باقتدائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فی المدیون وقاتل نفسہ بغرض زجر و تنبیہہ نماز جنازہ بے نماز سے خود جُدا رہیں کوئی حرج نہیں . . . . . اسی طرح غسل دینا مقابر مسلمین میں دفن کرنا صنہ ۲۳

لیکن اب تو میں خود ہی اس مسئلے میں تشدد سے باز آچکا ہوں کیونکہ میں نے بہت سے نمازیوں کو بے نمازوں سے زیادہ بدتر اور بہتیرے بے نمازوں کو نمازیوں سے کہیں زیادہ بہتر پایا ہے۔ مزاج میں، انسانیت میں، ہمدردی و ایثار میں، کردار میں، اخلاقی اقدار میں اور بہت اسلامی خوبیوں میں۔ دل اور ایمان کا حال تو اللہ ہی جان سکتا ہے۔

میں انجمن حزب الاحناف **حضرت حکیم مولانا سیّد ابوالحسنات رحمۃ اللہ علیہ** کے کئی عظیم الشان جلسوں میں شرکت کر چکا ہوں۔ مسجد وزیر خاں کے مرحوم خطیب صاحب

سے خاصے مراسم رہے ہیں وہ میرے معالج بھی رہے ہیں۔ لیکن آج تک میری زبان سے کبھی تو مولانا ابوالبرکات نکلتا ہے اور کبھی مولانا ابوالحسنات۔ دونوں بھائیوں کو اچھی طرح جاننے کے باوجود نام میں اکثر گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ بہرحال اس وقت ان کا ذکر کر رہا ہوں جو حکیم بھی تھے اور اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ عام دنوں میں بھی میں ایک بار ان کا مہمان رہا ہوں۔ انہی ایام میں حکیم صاحب نے حضرت فاضل بریلوی کے بارے میں بیان کیا کہ: وہ ریاضی کے علاوہ نجوم و جفر و رمل وغیرہ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ لیکن میں ان کے بعض استخراج کو اب تک نہیں سمجھ سکا۔ حالانکہ اس فن میں خود بھی درک رکھتا ہوں۔ ہوا یوں کہ سابق نواب رام پور کی بیگم بیمار ہو گئیں۔ رام پور کے وزیر اعظم زیدی صاحب حضرت کے معتقد تھے۔ انہوں نے خط لکھا کہ بیماری بڑھتی جا رہی ہے۔ آپ کا علم اس مریضہ کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ جواب گیا کہ اگر وہ سُنی ہو جائے تو بچ جائے گی۔ نواب صاحب خود بھی حضرت کے معتقد تھے۔ انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ: حرج کیا ہے۔ سُنی ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری جان زیادہ عزیز ہے۔ اس پر مریضہ نے مذاق اڑاتے ہوئے سُنی ہونے سے انکار کر دیا۔ چند دنوں کے بعد ہی رمضان آگیا۔ اور وہ اچھی ہونا شروع ہو گئی۔ زیدی صاحب نے لکھا کہ: حضرت وہ سُنی تو نہ ہوئی مگر بحمد اللہ اب خاصی رُوبصحت ہے۔ حضرت فاضل بریلوی نے لکھا کہ وہ رمضان ختم نہیں کر پائے گی۔ چنانچہ ۲۸ ویں رمضان کو اسے ایک قے ہوئی جس کے بعد اس کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

جناب حکیم صاحب نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد اپنے استعجاب کا اظہار یوں کیا کہ: جفر علم الاخبار میں نفی میں آتا ہے یا اثبات میں۔ لیکن یہ جواب کسی طرح نہیں آ سکتا کہ اگر کوئی سُنی ہو گا تو یوں ہو گا اور شیعہ ہو گا تو یوں ہو گا۔ اس جواب پر مجھے آج تک حیرت ہے۔ حکیم صاحب نے یہ واقعہ بیان کیا تو چند منٹ تک میں بھی خاموش رہا۔ پھر یکایک میرے ذہن میں ایک نکتہ آگیا جسے سن کر حکیم صاحب کا تعجب تو جاتا رہا مگر اتنا ہی تعجب میری توجیہہ پر ہونے لگا۔ میں نے کہا کہ: حضرت فاضل بریلوی نے دراصل دو سوالوں کا جواب نکالا تھا:

کیا وہ اچھی ہوگی ——— جواب آیا نہیں

کیا وہ سُنّی ہوگی ——— جواب آیا نہیں

پھر انہوں نے دونوں کو ملا کر ایک کر دیا یعنی نہ وہ اچھی ہوگی اور نہ سُنّی ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں اگر وہ سُنّی ہوگی تو تندرست ہو جائے گی۔ ظاہر ہے کہ نہ سُنّی ہونے والی تھی نہ اچھی ہونے والی تھی۔ ان دونوں جوابوں کو ملا کر ایک مشروط جملہ بنا دیا۔ اگر وہ سُنّی ہو جائیگی تو اچھی ہو جائے گی۔

حکیم صاحب نے میری یہ توجیہہ سُنی تو پھڑک اٹھے اور فرمانے لگے: بخدا آج تک میرے ذہن میں یہ نکتہ نہیں آیا تھا۔ آپ کی توجیہہ بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے۔

حضرت مولانا امجد علی علیہ الرحمہ (مؤلف بہارِ شریعت)

حضرت مولانا امجد علی علیہ الرحمہ (مؤلف بہارِ شریعت) سے پہلی ملاقات مسجد جان محمد امرتسر کے ایک جلسے (عرس امام اعظم) کے موقع پر ہوئی۔ ان کی تقریر میں متانت، علمیّت اور منطقی ربط موجود تھا۔ سیالکوٹ کے ایک جلسے میں بھی ان کا ساتھ رہا۔ اس وقت موسم بڑا سرد تھا اور اس موقع پر ایک لطیفہ ہوگیا۔ مولانا نے فرمایا: یہ سیالکوٹ کیا نام ہے؟ اور اس کا مطلب کیا ہے؟ میں نے کہا: پنجابی زبان میں سیال کہتے ہیں سردی اور جاڑے کو اور کوٹ یا اُوور کوٹ جاڑے ہی میں پہنتے ہیں لہٰذا اسی مناسبت سے سیالکوٹ نام ہوگیا۔ اس پر علمائے کرام نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔

مولانا سیّد محمد محدّث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی سے میرے خاندانی مراسم تھے۔ سب سے پہلے میری ملاقات حضرت شاہ علی حسین کچھوچھوی سے غازی پور (یوپی) میں ہوئی تھی۔ مَیں نے ان جیسا حسین، وجیہہ اور نورانی صورت والا کوئی

شیخ نہیں دیکھا۔ میں اس وقت نو عمر تھا۔ اس کے بعد قیام پاکستان سے بہت پہلے
لاہور اور امرتسر کے جلسوں میں بھی موصوف کی صحبت نصیب ہوئی۔ مجھ پر بڑی شفقت
فرماتے تھے۔ ان کی بسم اللہ میرے نانا حضرت شاہ علی حبیب نصر پھلواروی نے پھلواری
شریف میں کرائی تھی۔ امرتسر میں موصوف نے اپنا مطبوعہ دیوان بھی مجھے عنایت فرمایا تھا۔
ان کے صاحبزادے حضرت شاہ احمد اشرف کچھوچھوی سے پہلی ملاقات لکھنؤ میں ہوئی تھی
جبکہ میں ندوۃ العلماء میں پڑھتا تھا۔ ان کے دو عزیز بھی اس وقت ندوے میں پڑھتے تھے۔
اس کے بعد مختلف جلسوں میں ان کا ساتھ رہا یہ بھی بڑی وجیہہ اور نورانی شکل رکھتے تھے۔
انہی کے بھانجے تھے مولانا سید محمد کچھوچھوی۔ ان سے غالباً پہلی ملاقات انجمن اسلامیہ
گورکھپور (یوپی) کے جلسے میں ہوئی۔ یہ انجمن اس پورے علاقے میں سب سے زیادہ وسیع
اور وقیع انجمن تھی۔ اور اس کے سالانہ جلسے بڑے شاندار ہوا کرتے تھے۔ اس کی شرکت
کرنے والوں میں مولانا فاخر الہ آبادی، مولانا نثار احمد کانپوری، غازی محمود دھرمپال اور
بابا خلیل داس چترویدی بی اے، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا قطب الدین برہمچاری
جیسے اکابرِ قوم ہوتے تھے۔ اور اس عظیم الشان جلسے کے بعد مختلف مقامات پر شاخہائے
انجمن کے جلسوں کے دورے ہوتے تھے۔ میری سمجھ میں یہ بات آج تک نہ آسکی کہ ان اکابرِ
امت کے ساتھ مجھ جیسے ہیچمدان کو کیوں مدعو کیا جاتا تھا۔ انتہا یہ ہے کہ وہ اسکا بازار،
کے جلسوں کے درمیان جمعہ آگیا۔ مسجد بھری ہوئی تھی۔ اگلی صف میں مولانا احمد اشرف
کچھوچھوی، مولانا فاخر الہ آبادی اور مولانا نثار احمد کانپوری جیسے اکابر تشریف فرما تھے۔
ساتویں یا آٹھویں صف میں میں بیٹھا ہوا تھا۔ کیونکہ یہاں دھوپ تھی اور موسم سردی کا تھا۔
ذرا دیر میں کیا دیکھتا ہوں کہ مولانا قمر الدین دربھنگوی صفوں کو چیرتے ہوئے میرے پاس
آئے اور کہنے لگے کہ: آپ سے جمعہ پڑھانے کی درخواست کی گئی ہے۔ اُٹھئے آگے آجائیے۔"
میں پہلے تو یہ سمجھا کہ مولانا قمر الدین کو کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ اس تذبذب میں چند لمحے گزرے
تو مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر اُٹھایا اور منبر کے پاس لے جا کر بٹھا دیا۔ موذن اذان خطبہ دینے
کے لیے کھڑا ہوا اور میں منبر پر بیٹھ گیا۔ منبر سے متصل ہی مولانا احمد اشرف کچھوچھوی کا آبنوسی

سیاہ عصا رکھا ہوا تھا۔ اذان ختم ہوتے ہی میں وہ عصا اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا اور برجستہ عربی خطبہ دیا میں اُردو خطبہ شروع کرنے سے پہلے یعنی ۳۰ سال تک مختلف موضوعات پر ہمیشہ اپنا ہی تصنیف کردہ عربی خطبہ زبانی دیتا رہا اور کتاب دیکھ کر یا کسی اور کا لکھا ہوا خطبہ کبھی نہ پڑھا۔ یہی عادت تھی جو یہاں کام آئی اور جمعے کے بعد ان تمام علمائے کرام نے اس خطبے کو سراہا۔ انہی مولانا احمد اشرف کچھوچھوی کے بھانجے تھے مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی۔ ان سے بھی میری پہلی ملاقات گورکھپور ہی کے کسی جلسے میں ہوئی تھی۔ پھر کئی دوروں میں ساتھ رہا۔ بہاول پور اور لاہور کے جلسوں میں بھی صحبتیں رہیں۔ اچھے مقرر تھے اور اپنے عقائد میں بڑے پختہ بلکہ متشدّد و غالی تھے۔ ان کے نانا بزرگوار یعنی حضرت شاہ علی حسین کچھوچھوی کا ایک دلچسپ واقعہ بھی سن لیجئے۔ اجمیر شریف میں بہ ایام عرس ایک بار بزم صوفیہ کا جلسہ ہوا اور اس جلسے کا صدر انہی کو تجویز کیا گیا کیونکہ سب سے زیادہ عمر رسیدہ اور سب سے زیادہ وجیہہ و نورانی یہی تھے۔ جلسے کے وقت سے ذرا پہلے ہی یہ جلسہ گاہ میں آکر مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے۔ حضرت شاہ صاحب نے یکے بعد دیگرے کئی مشائخ سے ان کی عمر دریافت کی۔ جس نے بھی اپنی عمر بتائی اس کے جواب میں حضرت کچھوچھوی نے یہی فرمایا کہ:

"ابھی آپ مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں آپ سے اس وقت اتنے سال بڑا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابھی مجھ سے آپ اتنے سال چھوٹے ہیں"

حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی بھی موجود تھے بلکہ وہی جلسے کے کرتا دھرتا تھے۔ ان کی رگِ ظرافت پھڑکی تو ان سے رہا نہ گیا۔ حضرت کچھوچھوی سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ: حضرت بات یہ ہے کہ:

ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اس ظرافت و لطافت پر چند لمحے کے لیے محفل کشتِ زعفران بن گئی ——

حضرت مولانا ظفر الدین عظیم آبادی رحمۃ اللہ علیہ

مولانا ظفر الدین عظیم آبادی بھی اپنے عقائد میں بڑے پختہ تھے۔ لیکن ہم لوگوں سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ وہ اکثر پھلواری شریف آیا کرتے تھے اور ہمارے ہی ہاں قیام کرتے تھے۔ اہل علم تھے۔ مدرس تھے اور کئی کتابوں کے مؤلف تھے۔ ان کی "موذن الاوقات"، اپنے فن کی پہلی اردو کتاب ہے جس میں طلوع و غروب اور اوقات نماز اور تمام دوسرے شہروں کے فروق بتائے ہیں۔ اسکے علاوہ صحیح البہاری بھی انہی کی تالیف ہے جس میں مسلک اہل سنت خصوصاً حنفی مسلک کی تائید میں احادیث یکجا کر دی ہیں۔ اس کی ابتدائی دو جلدیں انہوں نے خود پیش کی تھیں جو مجھے بہت عزیز تھیں ۱۹۴۷ء کے فسادات میں جب میں کپورتھلہ (مشرقی پنجاب) سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تو یہ کتاب وہیں رہ گئی۔

مولانا میں پختگی کے باوجود خاصی لچک موجود تھی۔ جس کی وجہ سے ہم لوگوں سے ان کے خاصے مخلصانہ مراسم تھے۔ ورنہ انہیں بھی اس کا کافی علم تھا کہ ہم لوگوں کا مسلک نہ دیوبندی ہے نہ بریلوی۔

مولانا ظفر الدین رحمۃ اللہ علیہ ہم لوگوں کے مسلک سے پوری طرح واقف تھے۔ لیکن پھلواری شریف سے ان کے مراسم ہمیشہ مخلصانہ رہے۔ اور میرے خیال میں ایک عالم کی یہی شان ہونی چاہیئے۔

مولانا سے ایک بار میری گفتگو ٹیلی فون کے ذریعے شہادت پر گفتگو ہوئی۔ معاملہ تھا رویت ہلال کا۔ مولانا نے فرمایا کہ: ٹیلیفون کی شہادت کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک شخص کی آواز دوسرے شخص کی آواز کے مشابہ بھی ہوتی ہے اور اس میں دھوکا بھی ہو سکتا ہے"۔ میں نے کہا کہ: ایسی شکل بھی نکل سکتی ہے جس میں دھوکے کا کوئی امکان نہ ہو۔ مثلاً میرے اور آپ کے درمیان یہ طے ہو جائے کہ جب میں آپ کو مثلاً آرہ شاہ آباد سے فون پر یہ اطلاع دوں کہ چاند ہو گیا ہے۔ میں نے خود بھی دیکھا ہے۔ تو میں

پہلے تین بار کہوں گا۔ "اونٹ، اونٹ، اونٹ"، تو آپ سمجھ جائیں گے کہ میں ہی بول رہا ہوں۔ یہ کوڈ ورڈ (CODE WORD) صرف میرے آپ کے درمیان راز رہے تو بتائیے آپ کو کسی دوسرے کی آواز اور میری آواز کا فرق سمجھ لینے میں کون سی خطا کا امکان ہے؟ تحریر میں بھی اس قسم کا کوڈ ورڈ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ٹیلی فون یا تحریر کو اس وقت تک مشکوک نہیں سمجھنا چاہیئے جب تک اس کے مشکوک یا غیر معتبر ہونے کے دلائل و شواہد یا قرائن موجود نہ ہوں[1] ہر ٹیلی فون یا ریڈیو یا تار یا خط کے لیے غیر معتبر ہونے کا کلیہ بنا دینا صحیح نہیں ــــ"

حزب الاحناف لاہور کے جلسے میں دو حضرات اور بھی تھے۔ جن سے ملاقاتیں رہیں۔ ایک مولانا عبدالعلیم صدیقی اور دوسرے مولانا حشمت علی خان۔

اوّل الذکر یعنی مولانا عبدالعلیم صدیقی سے پہلی ملاقات سفر بمبئی کے دوران ہوئی۔ ایک ہی ڈبّے میں مولانا موصوف، مولانا عبدالحنان مرحوم، مولانا محمد بخش مسلم بی۔ اے وغیرہ بھی تھے۔ یہ سب کے سب بمبئی جا رہے تھے۔ اس زمانے میں بمبئی میں بہی دھوم دھام سے اہلِ سُنّت حضرات محرّم منایا کرتے تھے۔ محلّے محلّے جلسے ہوتے تھے۔ یکم سے دوازدہم محرم الحرام تک ہر روز تقریریں ہوتی تھیں۔ یازدہم کو چھٹی رہتی تھی۔ مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے اپنے روزنامے "انقلاب"، کے فکاہی کالم میں ان تمام بمبئی جانے والے مولویوں کو "محرم الحرامی واعظین"، لکھا تھا۔ اس لفظ پر وہ حضرات

---

[1] اصل بات یہ ہے کہ شریعت نے رویتِ ہلال کے لیے معیار شہادت بنایا ہے۔ بڑے سے بڑے آدمی کو بھی شہادت دینے کیلئے خود قاضی کے پاس جانا پڑتا ہے۔ جب قاعدہ کلیہ شہادت ہے تو اُسے ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ تار اور خط یا ٹیلی فون اور ریڈیو پر شہادت کا حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے۔
مرید احمد چشتی

بہت ناراض ہوئے جو لطافت و ظرافت کی ادبی حس سے محروم تھے۔ میں نے مولانا صدیقی سے کئی آدمیوں کا تعارف کراتے ہوئے مولانا عبدالحنان مرحوم کا بھی تعارف کرایا اور کہا: ان سے بھی ملئے یہ دیوبندی قسم کے مولانا ہیں۔ مولانا صدیقی "دیوبندی قسم کے مولانا" کے لفظ پر ہنسے اور پھر باہم باتیں شروع ہو گئیں۔ مولانا عبدالحنان مرحوم ایک تو کٹر دیوبندی تھے۔ دوسرے شدید کانگریسی۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ پاکستان کو انہوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ نہ دل سے نہ زبان سے۔ لیکن آدمی فراخ دل تھے اور زندہ دل بھی۔ میرا ان کا بھی کئی جگہ جلسوں میں ساتھ رہا ہے لیکن باوجود اختلافِ خیالات کے کبھی انسانی تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا۔ یہ مقرر بھی اچھے تھے اور احراری تھے۔

مولانا عبدالعلیم صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ باوجود کٹر بریلوی ہونے کے نہایت فراخ دل تھے اور شاید بی۔ اے ہونے کی وجہ سے نیز عالمی سیاح و مبلّغ ہونے کی وجہ سے ان کے اندر یہ فراخ دلی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں یکساں گفتگو کرنے پر قادر تھے۔ بہت اچھے قاری تھے اور انگریزی تلفظ میں بھی "پورے قاری" تھے۔

مولانا کی تقریر بڑی رواں ہوتی تھی لیکن عربی، فارسی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے زبان ادق ہو جاتی تھی۔ اُردو بولتے ہوئے بھی عربی الفاظ کو پوری تجوید اور صحیح مخارج سے نکالتے تھے۔ ان کی عمر کا بڑا حصّہ تبلیغ میں گزرا ہے۔ یورپ، افریقہ، امریکہ، انڈونیشیا وغیرہ میں انہوں نے تبلیغِ اسلام کا کام انجام دیا۔

مولانا صدیقی مرحوم کی ملاقات سے کوئی آٹھ سال پہلے ان کے بڑے بھائی مولانا نجندی سے تعارف ہوا تھا۔ یہ تعارف غائبانہ تھا۔ پھر بالمشافہ ہوا۔ یہ غالباً "۲۶-۱۹۲۷ء" کی بات ہے۔ مولانا نجندی بمبئی سے ایک اخبار نکالتے تھے جس کا نام تھا "غیبی گولہ" یہ اخبار نجدیوں، وہابیوں، دیوبندیوں اور اہلحدیثوں کے خلاف بڑے سخت مضامین شائع کرتا تھا۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مولانا اپنے عقائد و خیالات میں کتنے متشدد ہیں۔ ان سے اچھی طرح یاد نہیں کہ پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی تھی یا آل پارٹیز مسلم کانفرنس

امرتسر میں۔

مولانا حشمت علی خان مرحوم سے زیادہ متشدّد بریلوی میں نے نہیں دیکھا ہے۔ تکفیر سے کم کوئی فتویٰ ان کے ہاں نہ تھا۔ ہمارے بعض اکابر کو بھی انہوں نے نہیں بخشا ہے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

تشدّد میں میرا ان کا کبھی اتفاق نہ رہا۔ تاہم میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی خوش آوازی میں ایک کشش اور تقریر میں درد ہے۔ یہ دونوں باتیں ان کی تقریر کو پُر اثر بنا دیتی تھیں۔

جس سفر کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں اس میں مولانا امجد علی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید محمد کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مولانا حشمت علی خان مرحوم بھی میرے رفیق سفر تھے۔ دوران گفتگو یہ موضوع زیر بحث آگیا کہ حضرت حسن بصری کی لقا حضرت علی رضی اللہ عنہ، سے ثابت ہے یا نہیں؟ میں نے کہا: بعض اہل علم کو لقا سے انکار ہے لیکن دلائل لقا کے حق میں زیادہ ہیں۔ مولانا حشمت علی خان بولے کہ: ٹھیک ہے۔ مولانا حسن رسولنما دہلوی نے "فخر الحسن" میں یہی لکھا ہے۔ جو آپ کہتے ہیں"۔

یہاں ان دلائل کو بیان کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو "خاتم سلیمانی"، حصہ چہارم کے ملفوظ ۲ میں ہیں۔ یہ حضرت قبلہ مولانا شاہ سلیمان قادری چشتی پھلواروی کے ملفوظات ہیں۔ ارشاد ہوا:

"جناب حسن بصری ام المومنین حضرت ام سلمہ کی ایک کنیز (خیرہ) کے صاحبزادے ہیں۔ شہادتِ فاروقِ اعظم سے دو سال پہلے پیدا ہوئے۔ چودہ سال کی عمر میں جبکہ خلافتِ ذی النورین کا آخری دور تھا۔ "بصرے" چلے آئے۔ اسی لیے بصری کہے جاتے ہیں۔ یہاں یعنی بصرے میں حضرت علی مرتضیٰ کا آنا بھی ثابت ہے۔ پھر یہ بات مشکل ہی سے سمجھ آسکتی ہے کہ چودہ سال کی عمر تک مدینے میں یہ اس طرح روپوش رہے ہوں کہ حضرت علی سے کبھی ملاقات ہی نہ ہوئی ہو اور بصرے میں بھی حضرت علی

کی تشریف آوری سن کر یہ روپوش ہو گئے ہوں۔ امام محمد نے "آثار" میں عن الحسن البصری عن علی روایت نقل کی ہے۔ امام بخاری کے ہاں عنعنہ سے لقا ثابت نہیں ہوتی لیکن یہ بھی ایک اصولِ حدیث ہے کہ دو معاصروں میں عنعنہ ہو تو ظنِ غالب لقا کے حق میں جاتا ہے۔" انتہی ملخصًا۔

بات یہ ہے کہ سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں دو جگہ زمانی انقطاع ہے۔ عام رائج الوقت نقشبندی مجددی شجروں میں امام جعفر صادق کے بعد ابو یزید بسطامی کا سنہ وفات ۲۶۱ھ (یا زیادہ سے زیادہ ۲۶۴ھ) ہے گویا دونوں کے درمیان کم از کم ۱۱۳ سال کا فرق ہے۔ اور ابو الحسن خرقانی کا سنہ وفات ۴۴۵ ہے۔ یعنی ان کے اور بسطامی کے درمیان ۱۸۴ سال کا زمانی خلا ہے۔

میرے بڑے بھائی مولانا حسن میاں رحمہ اللہ نے تذکرۂ ابو النجیب سہروردی میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی تحفہ اثنا عشریہ کے حوالے سے اس خلا کو یوں پُر کیا ہے:

ابو الحسن خرقانی عن ابی العباس القصاب عن ابی محمد الجریری عن ابی القاسم جنید البغدادی عن ابی سعید الخراز عن ابی عبد اللہ السوخی عن ابی تراب عسکر بن الحسین النخشبی عن ابی یزید البسطامی عن جعفر الزکی وعلی الرضا عن موسیٰ کاظم عن جعفر الصادق — یعنی ابو الحسن خرقانی اور ابو یزید بسطامی کے درمیان چھ مزید واسطے ہیں اور ابو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اور امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے درمیان مزید دو واسطے ہیں۔

علاوہ ازیں صوفیہ میں "اویسیت" ایک ایسا مسلم اصول ہے جس سے کوئی صوفی مشکل ہی سے انکار کر سکتا ہے۔ اویسیت نام ہی ہے غائبانہ فیض حاصل کرنے کا۔ اس میں نہ لقائے صوری شرط ہے، نہ ہم عصری۔ ہزاروں میل کا مکانی فاصلہ اور سینکڑوں سال کا زمانی بُعد ہو جب بھی روحانی فیض اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے جس طرح دو ہم عصروں کی مکانی لقا سے حاصل ہوتا ہے۔ پس اگر حسن بصری کی لقا

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہ ثابت ہو یا جعفر صادق، ابویزید بسطامی اور ابوالحسن خرقانی کے درمیان زمانی انقطاع موجود ہو تو اہلِ روحانیت کے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

غرض اس قسم کی گفتگو ہوتی رہی اور سفر بڑی اچھی طرح کٹ گیا

فاضلِ بریلوی کی "عظمتِ کلام"

از ڈاکٹر سید نظیر حسنین زیدی

پاک و ہند میں ایک بات خصوصیت سے یہ پائی جاتی ہے کہ یہاں ایک نقطۂ نظر کو حتمی طور سے اختیار کر کے دوسرے نقطۂ نظر سے اس طرح روگردانی کر لی جاتی ہے کہ پھر اس مسئلہ کے سلسلے میں کوئی گفتگو کا سلسلہ اگر کسی گوشے سے پیدا ہو تو اس پر لعن طعن کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اور اس طرح کسی دوسرے کا نقطۂ نظر اپنے لیے قابلِ توجہ نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ اب یہ نکلا ہے کہ جس کا پروپیگنڈہ زیادہ ہو گیا وہ کامیاب قرار دیا اور دوسرا لعنتی اور پھر یہ کہ بعض اختلافات کے ساتھ اگر کسی کی کوئی بات اچھی ہو تو اسے قبول کرنا چاہیئے لیکن یہاں یہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ لہٰذا دُنیا پروپیگنڈہ کی ہو گئی۔ اس مادی دُنیا کی ہائے ہائے کہاں کسی کو چین لینے دیتی ہے۔ کہ وہ اپنی کثافتی دنیا سے نکل کر کسی دوسرے کی بات بھی سُن سکے۔ یا کوئی کسی کی سکہ بند چیز کی تعریف کر سکے۔

ہندوستان میں مناظرانہ کتابوں کی اشاعتِ بے جا نے بقول حالی ہندوستان کی فضا کو متعفن کیا اور اس طرح ہر لکھنے والے نے اپنے نقطۂ نظر کی اشاعت کے لیے دوسرے پر لعن وطعن کی انتہا کر دی۔ اور اختلافات نقطۂ نظر کے افہام و تفہیم تک محدود نہیں رہے۔ بلکہ پورے معاشرہ کو عصبیت کی لپیٹ میں لے لیا۔ گویا گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل کا مسئلہ آن پڑا۔ یہی اسباب تھے جن کی بنا پر تکفیرِ مسلم میں خود علمائے ہند نے تعجیل کی۔ اور پھر بات اتنی پھیلتی گئی کہ فتویٰ کی تحقیق کی طرف کسی کی نظر اُٹھ نہیں

پائی۔ حالانکہ تکفیرِ مُسلم کا مسئلہ بے حد مشکل مسئلہ ہے۔ اور اس سلسلہ میں فاضلِ بریلوی کا اندازِ فکر ہی صائب بلکہ قابلِ تقلید ہے۔ کہ

"ہمارے نزدیک مقامِ احتیاط میں کافر کہنے سے خود کو روکنا مناسب ہے"۔

(الکوکبۃ الشہابیہ فی کفریاتِ الوھابیہ)

ایک دوسری کتاب میں انہوں نے واضح طور پر یہ تحریر فرمایا۔ کہ اقوال کا کلمۂ کفر ہونا اور بات رہے) اور قائل کو کافر مان لینا اور بات ہے۔ ہم احتیاط برتیں گے، سکوت اختیار کریں گے جب تک ضعیف سے ضعیف احتمال ملے گا۔ حکم کفر جاری کرتے ڈریں گے۔

(بحوالہ سل السیوف الہندیہ علی کفریات بابا النجدیہ مطبوعہ ۱۸۹۸ء)

میں سمجھتا ہوں کہ فاضلِ بریلوی نے نہایت واضح طور پر جن جن مسائل پر اظہارِ خیال کیا ہے، وہ کسی بھی فرقے کے لیے ناقابلِ قبول نہیں، رہا یہ امر کہ وہ کرنا ہے۔ اسں "وہ" کا شرع جواز نہیں یا کسی فرقے کو یہ حق نہیں کہ وہ افراد کے غلط طریقِ کار کو کسی عالم کی طرف منسوب کر دے یا اُس عالم کو اس کا ذمہ دار قرار دیا جائے۔ وہ حضرات بلاشبہ قابلِ ستائش ہیں جو غلط رسموں کو ترک کر دیں اور خارجی دباؤ کا لحاظ کئے بغیر اُن کو ترک کرنے کی سعیٔ مسلسل میں لگے رہیں۔ ایک ہی رسم جو میّت کے کھانے کی ہے، یہ بلا تفریق فرقہ سب کے یہاں ممنوع ہے۔ حکم صرف یہ ہے کہ محتاجوں کو کھانا کھلائیں تاکہ اس کارِ خیر سے معاشرہ میں غریبی کے آثار پیدا نہ ہوں۔ اور نیک اولاد اپنے والدین کے مرنے کے بعد بھی اُن کے نام پر دوسروں کے ساتھ نیکی کرتی رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ سُنّی ہوں یا شیعہ، دونوں فرقوں کے علماء اس بنیادی اصول پر متفق ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی کرتا ہے تو اس امر سے وہ خود متہم ہے نہ کہ کسی عالم کو اس سلسلہ میں متہم کیا جائے۔ فاضلِ بریلوی نے ایک جگہ یہ کہہ کر "میّت کی طرف سے کھانے کی ضیافت تیار کرنی منع ہے کہ شرع نے ضیافت خوشی میں رکھی ہے نہ کہ غمی میں اور یہ بدعتِ شنیعہ ہے"۔ مسئلہ بالکل صاف کر دیا۔

اب اس کا کیا علاج کہ ہم غم میں دعوتِ عام کر کے اور اپنے غیر مستحقین دوستوں،

ملنے والوں کو بلا کر، یعنی غیر محتاجوں کو دعوت دے کر اپنی سخاوت کا اعلان کرتے ہیں۔ اللہ کی نظر میں وہ عمل قابلِ قبول ہوگا جو مرضئ الٰہی کے تحت ہو نہ کہ خواہشاتِ نفسانی کے تحت، اب اگر کوئی سُنّی کرتا ہے یا شیعہ وہ خود ذاتی حیثیّت سے اس فضول خرچی/مصرفِ بے جا کا خدا کے سامنے جواب دہ ہے نہ کہ یہ اس فرد کے غلط کام کو کسی فرقے کے مسلّمات کی طرف منسوب کر دیا جائے ——

اسی طرح عُرس کے نام پر ایسے افعال، جو شریعت کی نظر میں ممنوع ہیں، کرنے والے اگر کرتے ہیں، تو یقیناً قابلِ ستائش نہیں۔ لیکن تلاوتِ کلامِ مجید، اور تلاوت کے بعد مرحوم کی روح کو ایصالِ ثواب کرنا یا ان کے نام غریبوں کو کھانا کھلانا کب افعالِ شنیعہ میں آسکتا ہے (معاذ اللہ) میں سمجھتا ہوں کہ فاضلِ بریلوی کا جو نقطۂ نظر ہے وہ اس قدر واضح ہے کہ جس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ اب اگر کوئی ایسا کام کرتا ہے تو اس کا ذمّہ دار وہ خود ہے نہ کہ علماء۔ (بشرطیکہ علماء بھی اپنے جذبۂ تفوق میں کسی دوسرے کے خلاف فتویٰ صادر نہ فرما دیں)

فاضلِ بریلوی کے سلسلہ میں غلط فہمیوں یا یہ کہا جائے کہ تنگ نظریوں کے سبب جو باتیں عام کر دی گئی ہیں یا خود غلط کرنے والوں نے اپنے خیال میں وجہ جواز پیدا کر لی ہے اور اس کے نتیجہ میں ہر کہ ومہ کی حرکت کو ان کی ذات کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ اس کے سبب (اُن کے متعلق) عام طور پر ان کا نقطۂ نظر سامنے نہیں آسکا۔ تو پھر طرح طرح کے الزامات یکے بعد دیگرے لگتے چلے گئے۔

فاضلِ بریلوی کی سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبتوں کے ساتھ محبّت و اُلفت کی حد اس لیے نہیں کہ یہ نسبتیں حضور (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک جا کر پہنچتی ہیں۔ اور اس دربار کی عظمت کا احساس ہے ——

انما یخشی اللہ من العباد علماء

یہ وہ جذبہ تھا جس نے اُن سے ایسی نعتیں لکھوائیں جن کی نظیر ملنی مشکل ہے، انہوں نے اس سلسلہ میں محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جو منازل طے کیے

اس کے سبب حضور کی ذات بابرکات نقطۂ عشق بن گئی۔ کاش ہم سب مل کر حضور (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے احسانات عظیمہ کو یاد کر کے اُن کے حضور میں سرِ تسلیم خم کریں۔ اور یہ سمجھیں کہ حضور آج بھی ہمارے افعالِ شنیعہ کو دیکھ رہے ہیں۔ یہ اُن کا احسان ہے کہ ان حرکتوں کے باوجود اُمتِ رسول عذابِ الٰہی سے محفوظ ہے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبّت کے معنی یہ ہیں کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) جس سے نفرت کریں، ہم ان سے نفرت کریں۔ اس لیے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی الحبُ لِلّٰہ والبُغضُ لِلّٰہ کی مصداق ہے اور ہمارا یہ حال کہ ہم حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) سے عشق کا غلط دعویٰ کریں۔ اور زیارت کر کے واپس آئیں تو اسبابِ ممنوعہ ساتھ لے کر چوری سے آئیں۔ اور آتے ہی جھوٹ بھی بولیں۔ کملی والے کے ذکر پر تو وجد میں آئیں، اور کملی والے کے ارشادِ عالیہ کے لیے تاویلات شرعی نکالنے کے لیے جواز ڈھونڈتے پھریں۔ حضور خود آگاہ ہیں اور اللہ تو واقف ہے ہی، وہ دِل کے رازوں کو خوب جانتا ہے۔ جس طرح اللہ سے محبّت کے دعویٰ کرنے والے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظمت و حرمت میں ذرا برابر کمی کرنے والے غلط کار ہیں، اسی طرح رسول سے محبّت کے دعویٰ کرنے والے اور ان کی اولاد سے دشمنی رکھنے والے، اور ان کے حالاتِ زندگی لکھ کر ان کی طرف معاذ اللہ غلط اقدامات کو منسوب کرنے والے کل رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیا منہ دکھائیں گے۔ یا تو حضور (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی محبّت و نفرت کو "بشری محبّت و نفرت"، کہہ کر منصبِ رسالت کے متعلق اپنے خیالاتِ فاسدہ کو دل میں جگہ دے لیجئے یا حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشاداتِ عالیہ کو اپنا کر اس حکم کو اپنے لیے سرمایۂ نجات سمجھ لیجئے۔ "حسین منی وانا من الحسین"۔

حضرت فاضلِ بریلوی کے دل میں محبّتِ اہلِ بیت اس شدّت سے تھی کہ کسی سیّد زادہ سے خدمت لینا گوارا نہ کرتے، کجا کہ اہلِ بیت کے خلاف

نفرت و عناد![1]

حضرت فاضلِ بریلوی قدس سرہٗ کا قصیدہ مبارکہ عربی نعتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ان کی اس عظمتِ علمی کا ثبوت ہے ۔ جہاں اربابِ علم نے اس درگاہ کے سامنے سرِ نیاز جھکا کر اپنی انکساری کا اظہار کیا ۔ اور ہم ہیں کہ جب درود شریف پڑھتے ہیں تو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ان کی آل کا ذکر ترک کرنا گویا کسی شرعی فعل کا اجرا سمجھتے ہیں ۔ معاذ اللہ، بھول چُوک کی بات الگ ہے ـــــــ میں نے جب فاضلِ بریلوی کا یہ قصیدہ مبارکہ پڑھا تو ان کی عظمتِ بیان کا اس قدر اثر ہوا جو بیان سے باہر ہے ؎

الحمد للمتوحد — بجلالہ المتفرد
وصلوتہٗ دوماً علی — خیر الانام محمد
والآل والاصحاب ھم — ماوای عند شدائد
وبکل من وجد الرضا — من عند ربّ واحد

حضرت فاضلِ بریلوی قدس سرہٗ نے اپنی فاضلانہ کتاب "الدولۃ المکیہ"

---

[1] کراچی میں آج کل ان کتابوں کی بعض افراد زیادہ اشاعت پر زور دے رہے ہیں ۔ یا ایسے افراد کی کتابوں کو دلیل مستقل قرار دے رہے ہیں جن کتابوں میں اہلِ بیتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اتہام لگائے گئے ہیں ۔ یہ ان لوگوں کا حال ہے کہ خود کو محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں نہیں بلکہ عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ڈوبا ہوا سمجھتے ہیں ۔ گویا قمر جلالوی کا یہ مصرعہ اُن کی زندگی کا مصداق ہے ۔

؏ ہم آپ کے ہیں آپ کی اولاد کے نہیں

اگر کسی کو محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) اور محبتِ اہلِ بیت اطہار سیکھنی ہو تو حضرت فاضلِ بریلوی مولانا احمد رضا خان صاحب قدس سرہٗ سے سیکھے ـــــــ پاک و ہند میں وہ محبت کا مینار ہیں ـــــــ (زیدی)

نبی حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جلالتِ قدر عظمت کے اظہار میں جو مثال دی ہے وہ اس قدر دل میں گھر کرنے والی ہے کہ جس سے بہتر کوئی مثال نہیں پھر یہ کہ صحیح بخاری شریف، مسلم شریف کی روایات سے اپنی دلیل کو مضبوط تر بنا دیا ہے۔ اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علم ——— اور علم غیب کے متعلق جو غلط پروپیگنڈہ تھا ——— اسے دفع فرمادیا ———

"جب ہمیں معلوم ہوگیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا علم شریف قرآنِ عظیم سے مستفاد ہے اور ہر چیز کا روشن بیان اور ہر شے کی تفصیل ہونا، اس کتاب کریم کی صفت ہے۔ اور ہر چیز کا مفصّل روشن بیان پورا ہوگیا" اور حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ہر شے کا علم ہے اور اہلِ سنّت کے نزدیک "شے" ہر موجود کو کہتے ہیں۔ اس میں جملہ موجودات داخل ہوگئے۔ اور انہیں موجودات میں سے لوحِ محفوظ کی تحریر ہے۔ تو ضرور ہے کہ قرآنِ عظیم میں ان تمام چیزوں کا بیان روشن اور تفصیل کامل ہے۔ اور یہ بھی ہم اسی حکمت والے سے پوچھیں کہ لوح میں کیا لکھا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ———

"ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی ہوئی ہے"[۱]

---

[۱] میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے اس سلسلہ میں فاضلِ بریلوی قدس سرّہٗ العزیز کے نعتیہ کلام کے متعلق جو رائے تحریر فرمائی ہے وہ بالکل صحت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ ———

"جن لوگوں نے فاضلِ بریلوی کے نعتیہ کلام کا مطالعہ کیا ہے اُن کو ان کے پاکیزہ و لطیف اور اخلاص مندانہ خیالات و کلمات کا خوب اندازہ ہے۔ ان کی تصانیف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی کسی سطر سے بُغض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو بڑی بات ہے، گستاخی اور تنقیص کا بھی پہلو نہیں نکلتا۔ ایسی محتاط تحریریں ان کی سچی اور قابلِ رشک محبت پر گواہ ہیں۔" (زبیدی)

حضرت فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ کا اصل کارنامہ

علامہ سیّد محمد فاروق القادری

۷۸۶
۹۲

شاہ آباد شریف

محبِ گرامی چشتی صاحب

سلام مسنون۔ اعلیٰ حضرت کے بارے میں اپنا مختصر تاثر ارسال خدمت ہے۔ قبول کیجئے۔ آپ کی علمی خدمات، تبحّر اور دیگر گوناگوں خوبیوں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جائے گا۔ میرے نزدیک آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے جسے مختصر طور پر میں نے بیان کیا ہے۔ اس موضوع پر ایک طویل مضمون بلکہ بہترین کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

والسلام
مخلص: سیّد محمد فاروق القادری

داستانِ عہدِ گل را از نظیری بشنوید
عندلیب آشفتہ تر گفت ست ایں افسانہ را

خوش عقیدگی اور روایت پرستی کے اعتبار سے غالباً برّ اعظم ایشیا ساری دُنیا سے آگے ہے۔ شخصیات کے بارے میں حقائق تک رسائی یہاں ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ میرے نزدیک ان حالات میں کسی عالم، مفکّر، درویش یا سیاسی شخصیت کے محاسن روایتی انداز میں بیان کر دینا ذرّہ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس برّ اعظم کی مجموعی ذہنیت کچھ اس قسم کی ہے کہ یہاں کا ہر شخص اپنے ممدوح چاہے وہ کسی بھی

طبقہ سے تعلق رکھتا ہے کوما فوق الانسان ثابت کئے بغیر قطعاً مطمئن نہیں ہوتا،
بہر حال اپنے اپنے ذوق کی بات ہے ؎

وللناس فی ما یعشقون مذاهب

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ایشیا نے شخصیات پیدا نہیں کیں۔ اصل بات یہ
ہے کہ ہمارے علماء اور مفکرین کو جدید ذہن کے رد و قبول کے سائنٹفک معیار کو
خوش آمدید کہنا چاہیئے۔ اور شخصیات پر کام کرتے وقت رطب و یابس کی بجائے
معقول انداز میں صرف ان کی علمی و ملی خدمات پر زور دینا چاہیئے۔

برِ صغیر کی جن چند ایک ہستیوں نے اپنی خدمات کی بنا پر اس پورے خطّے کو
متاثر کیا ہے۔ علمی دُنیا میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی (م ۱۱۷۶ھ)
کے بعد ان میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خان (م ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) کا نام نامی
سرِ فہرست ہے۔ آپ جس دَور میں پیدا ہوئے، وہ مسلمانوں کے لیے ہر لحاظ سے
زوال و انحطاط کا دَور تھا۔ اگر ایک طرف خرقہ پوشانِ مکر و ریا نے خانقاہی نظام کو
بدنام کر رکھا تھا تو دوسری طرف مسواک و استنجا پر لڑنے والے ملاؤں نے شریعت
کو مضحکہ خیز اور عجوبہ بنا دیا تھا۔ اگر ایک طرف انگریزوں کے تسلّط سے مغربی افکار و
تہذیب کا مسلمانوں میں نفوذ جاری تھا تو دوسری طرف برادرانِ وطن کی کڑی گرفت
نے تساہل پسند مسلمانوں کے اقتصادی اور معاشی ڈھانچہ کو تباہ و برباد کر کے رکھ
دیا تھا۔ اگر ایک طرف ہندو مسلم بھائی بھائی کے دلفریب جال بچھائے جا رہے تھے
تو دوسری طرف عظمتِ رسول کو گھٹا کر مسلمانوں کے اس سے والہانہ تعلق کو کم کرنے
کی پوری کوششیں جاری تھیں۔ الغرض ملّتِ اسلامیہ اسلامی، تہذیبی، علمی اور
اقتصادی طور پر رُو بہ زوال اور بے جان ہو کر رہ گئی تھی۔ انہی حالات میں ۱۲۷۲ھ
کے لگ بھگ فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے۔

یوں تو فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی علمی خدمات اس قدر زیادہ ہیں کہ انہیں کسی ایک مضمون میں بیان کرنا مشکل ہے اور برِصغیر کا مؤرخ ان کی علمی خدمات سے کبھی صرفِ نظر نہیں کر سکتا، مگر ہمارے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ مایوس کُن حالات میں نبی آخر الزمان علیہ التحیۃ والسلام کی ذاتِ اقدس کے ساتھ عشق و محبت اور نسبتِ غلامی کی استواری کی دعوت ہے۔ آپ نے ایک نبّاضِ ملّت کی حیثیت سے ملّت کی جہالت، تنزلی، اور پسماندگی کے اسباب کا جائزہ لے کر اسے اپنی حقیقی عظمت کی بازیافت کے لیے طریقِ کار اور لائحہ عمل دیا ہے۔ آپ کے نزدیک، گذشتہ ایک سو سال میں وارثانِ منبر و محراب کی اکثریت نے شعوری یا غیر شعوری طور پر برِصغیر کے مسلمانوں کو اس ذاتِ گرامی سے روحانی طور پر بعید کر دیا ہے۔ ادھر کرم کتابی مولویوں نے دینِ اسلام کی عظیم الشان عالمگیر دعوت کا بدعات و شرک کی مصنوعی دیواریں کھینچ کھینچ کر حُلیہ بگاڑ دیا ہے۔ اس لیے فاضلِ بریلوی کا پیغام عشقِ رسول آپ کی دعوت، حبِّ نبوی، آپ کی تحریک سیرتِ طیّبہ پر عمل، اور آپ کی گذارش اس ذاتِ قدسی صفات سے نسبتِ غلامی کی اُستواری ہے۔

میرے نزدیک برِصغیر کے تمام مسلمان مفکّرین نے ملّتِ اسلامیہ کی زبوں حالی کے اسباب اور اس کے علاج میں سوچ و فکر کی ایک ہی راہ اختیار کی ہے۔ اور سب نے ایک ہی نتیجہ نکالا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی "فیوض الحرمین"، "الدرّ الثمین"، "اطیب النغم"، "انفاس العارفین"، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی "جذب القلوب"، "مدارج النبوّت" اور "مکتوباتِ شیخ" میں فاضلِ بریلوی کی دعوت سے علیحدہ کوئی چیز ہے، حاشا و کلّا ہرگز نہیں۔ ہر دو جلیل القدر مشائخ کے بعد فاضلِ بریلوی اور ان کے بعد دورِ حاضر کے عظیم مفکّر علّامہ اقبال کا نعرہ ہے

به مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

ایک ہی سلسلہ کی مختلف کڑیاں نہیں ؟ شاہ ولی اللہ سے علامہ اقبال تک بات ایک ہے ___

ہاں چودہ سو سالہ تاریخی تجربے اور خود اعتمادی کی بنا پر فاضلِ بریلوی نے اس راہ کو قطعی اور آخری سمجھا ہے۔ اور اس میں پس و پیش اور اگر مگر کرنے کرنے والوں کو انہوں نے کسی صورت معاف نہیں کیا۔ اور اس میں وہ یقیناً حق بجانب اور مخلص ہیں۔ کیونکہ ہزار سال کے بعد تو ہمیں اپنے مرض کی تشخیص کر لینی چاہیئے ___ اس راہ میں جس قدر مصائب و مشکلات کا سامنا کر کے فاضلِ بریلوی نے اپنا کام آگے بڑھایا ہے۔ اس میں وہ منفرد ہیں۔ علمی خود اعتمادی، صدری قوت اور مشن کی پاکیزگی و بلندی کی بنا پر انہوں نے اپنا موقف ڈنکے کی چوٹ بیان کیا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ غیر مسلموں کی بجائے انہیں "اپنوں" کی زبان و قلم کا زیادہ نشانہ بننا پڑا ہے۔ کس قدر عجیب بات ہے کہ ان کی خوبی ان کا عیب بنا دیا گیا ہے بقولِ صائب

ع بے گناہی کم گناہے نیست در دیوانِ عشق

تاہم انہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے اور آج برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے ساتھ غلامی اور عشق و محبت کی نسبت کی دعوت کا امام فاضلِ بریلوی ہی کو سمجھتی ہے۔ فاضلِ بریلوی عظمتِ رسالت کے سلسلے میں کسی رواداری کے قائل نہیں اور یہ ایک واقعہ ہے کہ اگر بقول ان کے تحذیر الناس یا تقویۃ الایمان ایسی کتابیں نہ لکھی جاتیں یا انہیں فوراً دریا برد کر دیا جاتا تو بعد میں منکرینِ ختمِ نبوت اور منکرینِ حدیث کو خود "ہمارے گھر" سے تائیدی مواد نہ ملتا، اور نہ یہ لوگ یوں دیدہ دلیری سے ہمارے سروں پر سوار ہوتے۔ فاضلِ بریلوی نے بروقت شدّ و مدّ سے ان کی تردید و تنقید کی۔ بعد میں جو حالات سامنے آئے اس سے ان کی فراست کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح بقول علمائے دیوبند سید ابو الاعلیٰ مودودی نے بعض صحابہ کرام کے متعلق جو سخت الفاظ لکھ دیئے اگر کوئی غیر جانبدار شخص آج یہ کہہ دے کہ ان سب حضرات کو

پلیٹ فارم اور وجہ جواز دیوبند نے مہیا کی ہے تو اسے کیسے غلط قرار دیا جا سکے گا؟ اس سے بہتر اور امن کی راہ وہی نہیں تھی کہ سرے سے عظمتِ رسول کو بازیچۂ اطفال بنایا ہی نہ جائے۔ ان حالات میں فاضل بریلوی کا کارنامہ عظیم اور مثالی ہے۔ اور ایسے حالات کی روشنی میں سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ میں ان علماء سے گزارش کرتا ہوں جو روایتی عقیدت کے جوش میں فاضل بریلوی پر شرک و بدعت کے مؤید و مجوز ہونے کا فتویٰ داغتے رہتے ہیں کہ وہ پہلے ان کی تصانیف کا مطالعہ کریں اور ان کے مشن پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں ورنہ انہیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ وقت اب دیر تک ان کے کارناموں پر غلاف قائم نہ رکھ سکے گا۔ ان کا عظیم کارنامہ اور علمی خدمات دن بدن نکھرتی آئیں گی۔ اور یہ حضرات صرف لاحول ولا قوۃ پڑھتے رہیں گے۔ محبتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا درس دے کر مسلمان قوم کا انفرادی تشخص جس طرح فاضل بریلوی نے واضح کیا ہے، عملی طور پر اس میں برصغیر کی کوئی دوسری شخصیت ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی ؎

شورشِ عندلیب نے رُوح چمن میں پھونک دی
ورنہ یہاں کلی کلی مست تھی خوابِ ناز میں (اصغر)

سید محمد فاروق القادری ایم اے
آستانہ عالیہ قادریہ شاہ آباد شریف، گڑھی اختیار خان،
بہاول پور ڈویژن

۲ر ذی الحجہ ۱۳۹۵ھ

اعلیٰ حضرت اخلاقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل نمونہ

از جناب مولانا منور حسین سیف الاسلام

۷۸۶

مکان ۱۱ نظام بلڈنگ ۱۴ر محرم الحرام ۱۳۹۶ھ

راوی روڈ۔ لاہور ۱۷ر جنوری ۱۹۷۶ء

برادرِ محترم۔ سلام مسنون، آپ کا نہایت ہی پُر مسرت معلومات کے مطالبے کا، محبت نامہ صادر ہوا۔ جزاک اللہ تعالیٰ۔

کسے کہ جانب اہلِ خدا نگہ دارد خدائش در ہمہ حال از بلا نگاہ دارد

میں نے پندرہ برس تبلیغ کے لیے ہندوستان، بنگال، بمبئی، گجرات، بلوچستان، سندھ، پنجاب وغیرہ تمام میں گشت کی لیکن ایسا عاشقِ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جلوہ نما نہیں پایا، جیسے حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ چونکہ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں شیر محمد صاحب پیلی بھیتی سے مُرید تھے یہ بھی میں نے سُنا تھا۔ چونکہ میں دو۲ برس ہی کا تھا کہ ان کے سایہ سے محروم ہوگیا تھا۔ خیر میں حضرت مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوا جب میری عمر سولہ۱۶ سترہ۱۷ سال کی تھی۔ میں خدائے تعالیٰ کے فضل سے دس۱۰ برس کی عمر ہی میں تقریر کرنے لگا تھا۔ میں سوداگری محلہ میں حاضر ہوا تو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا دولت خانہ لبِ سڑک تھا ــــ میں غالباً بعد عصر حاضر ہوا تھا بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ میں سلام کر کے حاضر ہوا تو اعلیٰ حضرت کھڑے ہوگئے اور مجھ کو اپنے سرہانے بٹھانے لگے۔ میں تو شرم کے مارے پانی پانی ہوگیا مگر ادب کا تقاضا تھا کہ ان کے سامنے دم نہ ماروں۔ سوئے اتفاق سے میں ایک حکیم صاحب کے مشورہ سے حُقّہ پیا کرتا۔ مجھ کو

اعلیٰ حضرت نے اپنے سرہانے بٹھا کر حُقّہ میری طرف بڑھایا تو میری چیخ نکل گئی۔ بھلا میں جو بڑے بھائی کے سامنے بھی حُقّہ نہیں پیتا تھا بھلا اعلیٰ حضرت کی خدمت میں یہ گستاخی کیسے گوارا ہوتی۔ لوگوں نے حضرت سے عرض کیا حضور! یہ صاحبزادے کون ہیں؟ تو اعلیٰ حضرت نے فرمایا یہ میرے محترم سیّد صاحب کے صاحبزادے ہیں جو حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چہیتے مُرید تھے۔

بخدا مجھ کو یہ معلوم بھی نہیں تھا جو اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔ آہ آہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے جذبات اس قدر غالب تھے کہ وہ کسی چیز کے خیال میں لانے کے مخالف تھے گویا مجھ کو جو اس قدر پیار و محبّت سے آسمانِ عزّت پر جگہ دی تو دو باتوں کی وجہ سے، کہ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، حضرت پیلی بھیتی صاحب کے مُرید تھے اور سیّد تھے۔ آہ آہ سیّد کی قدر و منزلت کا حال اعلیٰ حضرت کے روئیں روئیں پر اس قدر غالب تھا کہ بس لوگوں کو حیرت ہی ہوتی تھی۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک سیّد صاحب کو محلّے میں آباد کر لیا تھا۔ ایک اُن کا تین ۳ چار ۴ سال کا بچہ کھیلتے کھیلتے بچّوں کے ساتھ دروازے کے سامنے آیا اور تین ۳ بار آیا اعلیٰ حضرت تینوں بار تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ تو اُن کے ماموں زاد بھائی شاہد یار خاں صاحب بہت وجیہہ اور ایسی پیاری، رعب داب والی صورت والے تھے بچّے تو کیا بڑے بھی ان کو دیکھ کر ڈر جاتے تھے۔ وہ اُٹھ کر دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ تو سارے بچّے اُن کو دیکھ کر بھاگ گئے۔ تو اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے رو کر فرمایا کہ اے بھائی کیا آپ نے سیّد زادے صاحب کو دروازے سے ہٹا دیا، ہائے میں قیامت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے قدم کیسے چوم سکوں گا؟ —— ذرا اُن اعلیٰ حضرت کے چھوٹے بھائی حضرت ننھے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدا پرستی اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے عشق و محبت اور اتباع کے شوق کو بھی ملاحظہ فرمائیے۔

ان کا ہمیشہ یہ مبارک دستور تھا کہ مسجد کے سامنے، یہ وہی مسجد تھی جس میں

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور تمام اہلِ محلّہ نماز ادا کرتے تھے۔ ایک بڑا مضبوط لکڑی کا موٹا تختہ چار لوہے کے پایوں پر رکھا ہوا تھا۔ یہ عام سڑک تھی، اس پر ننھے میاں تشریف رکھتے تھے۔ حقیقۃً وہ پسند فرماتے تھے جب کسی مسافر یا راہ گیر کو غریب یا مجبور سمجھتے تو اس کا حال دریافت فرما کر اس کی امداد فرماتے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور اس خاندان کے جتنے بھی حضرات تھے سب پرانے خاندانی زمین دار تھے۔ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے بڑے بڑے باغات تھے۔ شہر بریلی میں بہت سی دکانیں اور محلّوں میں بہت سے مکانات تھے۔ جن کا کرایہ آتا تھا مگر مجھ کو کرایہ وصول کرنے والوں سے معلوم ہوا کہ غریبوں، بیواؤں سے کرایہ نہیں لیتے تھے۔ اب وہ بات جو میں نے ہندوستان کے کسی بزرگ میں نہیں دیکھی یہ تھی کہ حضرت ننھے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نماز ایسے خلوص سے پڑھتے کہ اکثر اوقات میں نے ان کی ریش مبارک کو آنسوؤں سے تر دیکھا۔ مسجد سے تمام نمازیوں کے چلے جانے کے بعد نکلتے تھے۔ اگر کوئی مسافر نظر آئے تو ان سے حالات دریافت فرماتے اگر ان کا کوئی رشتہ دار یا ٹھہرنے اور آرام کرنے کا ٹھکانا نہ ہوتا تو بڑی بیٹھک میں نہایت آرام سے جگہ دیتے اس بیٹھک میں چند اچھے خاصے پلنگ بھی بستروں سمیت موجود رہتے، پھر بیٹھنے کے لیے مونڈھے بھی ہوتے، حضرت ننھے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نماز فجر و اشراق و چاشت کے بعد فتوح الغیب اور کبھی کیمیائے سعادت مجھ سے روزانہ سنتے تھے۔ اگرچہ وہ خود عربی، فارسی کے عالم تھے مگر یہ بھی یاد رکھیے یہ واقعات میں اس وقت کے سنا رہا ہوں جب اپنی بائیس ۲۲ تیئیس ۲۳ سال کی عمر میں منظرِ اسلام، اعلیٰ حضرت کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ جب میں اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ تو اس کے بعد میں اپنے خاندانی مریدوں میں بنارس، ضلع جون پور گیا تھا اور ضلع اعظم گڑھ وغیرہ میں بھی اپنے مریدوں میں گیا اور بنارس میں سنسکرت ہندی وغیرہ بھی پڑھی تھی۔ پھر بعد میں جب خلافت اور کانگریس انگریزوں کے نکالنے کے لیے متحد تھیں، ہندو مسلمان جیلوں میں ایک ساتھ

ہوتے، بڑے بڑے ہندو لیڈر کرپلانی شمبھو نانند اور بہت سے مشہور لیڈر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ اور مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ قید سے رہا ہو کر پنڈت رام بلی مشر صاحب کے کہنے پر ان کے ضلع گورکھپور موضع پیلی پار میں رہا اور چونکہ تلسی داس جی کی رامائن گورکھپور کی زبان میں ہے اس لیے میں نے رامائن پنڈت رام بلی مشر صاحب سے دوبارہ پڑھی۔ چار پانچ ماہ وہاں رہا۔ وہ گاؤں صرف برہمنوں ہی کا تھا۔ لیکن برہمن عورتوں کی حالت یہ تھی کہ جب تمام مرد کھیتوں یا کام کاج کو چلے جاتے تو وہ تمام عورتیں مشریاں، پنڈت رام بلی مشر صاحب کی بزرگ بچی صاحبہ کے کہنے پر ان کے مکان پر آ جاتیں اور حضور اکرم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حالات اور ان کے رحم وکرم خصوصاً بچیوں کی پرورش اور عورتوں کی قدر و منزلت اور ان کے حق اور ان کی حفاظت کے احکام اسلامی سنتی تھیں۔ سب روتی تھیں۔ چونکہ ہندو دھرم میں تو لڑکی کو منحوس، بے قدری سمجھا جاتا ہے اور اس کی نجات کا ذریعہ صرف ستی ہونے کو ہی مانا جاتا ہے۔ آہ رحمۃ للعالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) ساری دنیا ہی آپ کی رحمت پر ناز کرتی ہے میں نے تو دنیا کے کسی دھرم کو نہیں دیکھا جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مداح نہ ہو۔ میں تمام ہندو لیڈروں اور آریہ سکھ ہندو لیڈروں کے گھروں پر جاتا، سب ہی اپنی گھریلو زندگی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے تھے۔ میں آریہ ہندو لیڈر رام چندر کے گھر بھی جاتا تھا۔ تو وہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف ہی کرتا مگر اس کی بیوی اور بچیاں تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بے انتہا تعریف کرتیں اور کہتی تھیں کہ سوامی دیانند جی نے اسلام ہی کے نور سے ستیارتھ پرکاش میں دنیا کو بت پرستی اور ستی ہونے کی لعنت سے بچایا ہے غرض یہ ہے کہ وہ محبوب رب العالمین (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کے عاشق صادق کا ذکر کر رہا ہوں ایسے تھے کہ دنیا سے تمام خرابیاں ان کے انوار کے صدقے میں دور ہوتی رہیں گی ــــ

الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیک

وعلیٰ آلک واصحابک اجمعین

اب ذرا اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی حضرت ننھے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی میری بات بھی سنیئے یہ تو میں نے لکھ دیا ہے کہ فتوح الغیب یا کیمیائے سعادت مجھ سے سُنا کرتے تھے ایک دن جو صبح کی نماز کے بعد پہنچا اور دیکھا کہ بڑے میاں ان کی بیٹھک میں چار پائی پر بستر میں بیٹھے ہوئے ہیں اور حضرت ننھے میاں صاحب اُن کے پاؤں کی طرف ہاتھ جوڑے ہوئے کھڑے ہیں اور نہایت عاجزانہ طریقے سے کہہ رہے ہیں کہ حضرت کم از کم دو دن تو اور رہیئے تاکہ آپ کی خدمت کا حق تین دن ادا کر دوں تو وہ بڑے میاں نہایت شرمندگی سے کہہ رہے ہیں کہ حضرت میں تو ایک مسئلے کے لیے آیا تھا جو وہ میں نے دار الافتاء میں حضرت مولانا مصطفیٰ رضا خان صاحب مدظلہ، سے حاصل کر لیا ہے یہ حضرت مولانا غلام مصطفیٰ رضا خان صاحب اعلیٰ حضرت کے چھوٹے صاحبزادے تھے جو دار الافتاد کے فرائض انجام دیتے تھے۔ تو ننھے میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان بڑے میاں، اپنے مہمان کو کچھ روپے کے نوٹ دیئے کہ یہ میری طرف سے آپ کے چھوٹے بچوں کی چیزوں کے لیے ہیں۔ اور جو کمبل وہ بزرگ اوڑھے ہوئے تھے وہ بھی خاصا قیمتی تھا وہ بھی ان کو دے دیا اور جب میں یاد آؤں تو میرے لیے دُعا کیا کیجئے اُس مہمان نوازی کے بعد میں نے اندر جانے کی اجازت چاہی یہ منظر میں کواڑ ذرا سا کھول کر دیکھتا رہا تھا ـــــ یہ تھی اعلیٰ حضرت کے خاندان والوں کے عشق و اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت، کیا کوئی دنیا کے اُس زمانے کے کسی عالم کے گھر والوں میں دکھا سکتا ہے ایسے ہوتے ہیں عاشقانِ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم۔

اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی کھانا کھلانے والی بڑی بی سے میں نے اپنی تعلیم کے زمانۂ رہائش میں اُن کے کھانے کے متعلق دریافت کیا تو کہنے لگیں جی حالت یہ تھی کہ بس لکھنے پڑھنے میں اس درجہ مصروف رہتے تھے کہ میں اندر سے گرم روٹی گویا تازہ روٹی لائی کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں فقط روٹی لائی اور سالن لینے چلی گئی تو دیکھا کہ رُوکھی ہی کھا رہے ہیں۔ کبھی میں سالن پہلے رکھ گئی اور روٹی لے کر آئی تو دیکھا کہ سالن . . . .

کھالیا ہے۔ میں نے کہا۔ حضرت آپ نے بے سالن روٹی اور بے روٹی کے سالن کھا کر مجھ کو تو بہت ہی حیرت میں ڈال دیا ہے تو فرماتے پیٹ میں دونوں چیزیں خود مل جاتی ہیں۔ ایک چیز جو بہت ہی ملاحظے کے قابل ہے وہ یہ ہے تمام خوش حالوں اور امیروں کے یہاں کھانا سینی یا بڑے طباق میں باقاعدہ سرپوش سے ڈھکا ہوا لایا جاتا ہے اور کئی کئی کھانے چُنے ہوتے ہیں۔ مگر اعلیٰ حضرت نے سُنّت کی پابندی کی خاطر یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔ کسی قسم کا تکلّف، بناوٹ یا کھانوں کی کثرت نہیں تھی۔ گویا مسلمانوں میں سُنّت کی پیروی کا شوق پیدا فرماتے تھے۔ چونکہ ان کا کمرہ سڑک کی جانب تھا۔ شاید ایک کھڑکی بھی سڑک کی جانب تھی اگر کواڑ کھول دیا جاتا تو لوہے کی سلاخوں میں سے نظر آتا تھا اگر کسی غریب یا فقیر کو دیکھتے تو کھانا اسی کو دے دیا کرتے تھے اور اس کے لیے مکان سے کافی کھانا منگا دیتے تھے۔ اعلیٰ حضرت کا لباس بھی نرالا ہی تھا۔ انگرکھا یا فقط کُرتا اور صافا یا ٹوپی مگر بالکل معمولی کپڑے کی، اس قدر سادہ تھا کہ آدمی جو لاہا سڑک پر جا رہا تھا۔ حضرت مسجد سے مکان کو آ رہے تھے یا مکان سے مسجد کو تشریف لا رہے تھے تو اُس نے کہا شیخ جی آج بازار میں سُوت کا کیا بھاؤ ہے؟ تو بہت عاجزی سے کہا کہ آج میں بازار نہیں گیا ہوں۔ یہ سادگی، اتنی بڑی امیری کے بعد بھی فروتنی۔ لباس ایسا معمولی کہ نہ تو کوئی ان کو بڑا عالم سمجھ سکتا نہ رئیس۔ بھائی میں نے تو تبلیغ کے لیے پندرہ سال بفضلہٖ تعالیٰ ہندوستان کی گشت کی۔ بڑے بزرگوں کی زیارت نصیب ہوئی مگر ایسی انکساری کہیں نہیں دیکھی۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ علیہ پاؤں پھیلا کر نہیں سوتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور گستاخی ہے۔ ایک سیدانی صاحبہ سال میں دو بار میلاد شریف کی مجلس کا اہتمام کرتیں تو اعلیٰ حضرت پیدل ہی تشریف لے جاتے حالانکہ بہترین گھوڑا گاڑی بھی تھی۔ اب ذرا ان کے خاندان والوں میں مسلمانوں کا جذبہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

میں اُس وقت اعلیٰ حضرت کے دولت خانے پر حاضر تھا۔ حضرت الحاج مولانا حامد رضا خاں صاحب علیہ الرحمۃ اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے صاحبزادے

موجود تھے۔ گاؤں سے چوکھیا یعنی محافظِ گاؤں آیا اور اُس نے کہا کہ فلاں ہندو نے ایک مسلمان کو بہت مارا ہے۔ حضرت حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ غصے میں بھر گئے اور نوکر سے کہا جلدی میری بندوق اور کارتوس لاؤ اور سواری تیار کرو ابھی جاکر اس ہندو سے انتقام لوں گا تاکہ آئندہ کسی ہندو کو مسلمان پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوسکے۔ ہمارے خداداد گاؤں میں رہ کر بھی ہمارے بھائیوں کو ستاتے ہیں۔ اس وقت حضرت شاہدیار خان صاحب ان کے بڑے بہادر رشتے کے بھائی بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا آپ نہ جائیں میں جاکر دیکھتا ہوں تب حامد رضا خان صاحب کو سکون ہوا۔ غرض یہ کہ ان بزرگوں میں اللہ تعالیٰ اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مبارک طریقوں پر عمل کرنے کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ اور اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں میں بھی میں نے اسی قسم کے جذبات دیکھے اور اب بھی دیکھ رہا ہوں۔ مسلمانوں کی حفاظت کے خیال سے اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ نے انگریزوں کے زمانے ہی میں سخت مخالفت کی تھی اور وہ مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے طریقوں پر چلنا یا ان کے ساتھ میل جول رکھنا، گوارا نہیں فرماتے تھے۔ جب کانگرس اور خلافت انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ایک ہوگئی تھیں اس وقت بھی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ اور ان کے تمام خاندان والوں اور مُریدوں نے سخت مخالفت کی تھی اور اس معاملے میں دیوبندی جیّد علماء بھی اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے پیرو تھے۔

غرض یہ کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے یا ان کے خاندان والوں نے قرآن وسُنّت کے خلاف کسی بھی طریقے کو گوارا نہیں فرمایا۔ اور ہمیشہ ظلم وستم یعنی مخلوقِ خدا پر جبر وتشدّد کے طریقوں کو بُرا اور مٹانے کے قابل ہی سمجھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم کو ان کے مبارک طریقوں پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دعاگو خادم منوّر حسین سیف الاسلام

حضرت مولانا احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ

میاں عبدالرشید صاحب

۷۸۶
۹۲

۴۸۳۴ - این سمن آباد، لاہور
۲۱-۲-۷۶

مکرمی محترمی - السلام علیکم ورحمت اللہ و برکاتہ،

نوازش نامہ ملا - اس سے پہلے خطوط بھی موصول ہو گئے تھے - میں ان دنوں کچھ زیادہ ہی مصروف ہوں - اس لیے آپ کے ارشاد عالیہ کی تعمیل سے قاصر رہا - آنکھوں میں کچھ تکلیف ہے زیادہ پڑھ لکھ نہیں سکتا - یہ خط بھی ایک اور صاحب سے لکھوا رہا ہوں - اپنے ایک پرانے انگریزی مضمون کا ترجمہ ارسال خدمت ہے پسند آ جائے تو اپنی کتاب میں شامل کر لیں -

والسلام
عبدالرشید

حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی برِ عظیم پاک و ہند کی چوٹی کی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں - اللہ تعالیٰ نے آپ کو اعلیٰ درجے کی قابلیت عطا فرمائی تھی - آپ اپنے زہد و تقویٰ کی وجہ سے سب کی نظروں میں محترم تھے - علم آپ کا بحرِ ذخار کی مانند تھا - بالخصوص فقہ کی باریکیوں پر آپ پوری طرح سے حاوی تھے - آپ کی خاص خوبی جناب رسالت مآب سے آپ کا پر جوش عشق ہے - نہ صرف آپ خود اس دولت سے

مالامال تھے بلکہ آپ نے اس برِ عظیم اور اس سے باہر کے لاکھوں اشخاص کے سینوں میں عشقِ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی جوت جگائی۔ اس دور میں جب یورپی پادری برطانوی حکومت کی سرپرستی میں ہمارے حضور اکرم کی شان میں بڑھ بڑھ کر گستاخی کر رہے تھے اور ان سے شہہ پا کر ہندو بھی یہی روش اختیار کر رہے تھے، حضرت بریلوی اور علامہ اقبال ہی حضور کے ناموس کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہوئے۔ عبدالوہاب نجدی کے پیروکار اور مدرسہ دیوبند کے بیشتر متعلقین اس میدان میں کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے تھے کیونکہ ان کے اپنے سینے عشقِ رسولِ مقبول کی لذت سے ناآشنا تھے نیز ان کی غالب اکثریت سیاست میں ہندو کانگریس کی ہم نوا تھی۔ عیسائیوں اور ہندوؤں نے ایک منظم سازش کے تحت یہ روش اختیار کی تھی۔ اسلام کے قلعے کو کمزور کرنے کے لیے انہوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے دلوں سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت اور احترام کو کم کرنا چاہا۔ علامہ اقبال نے کالجوں کے تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں عشقِ رسولِ مقبول کی شمع روشن کی۔ اور حضرت بریلوی نے مسلمان عوام کے سینوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے گرمایا۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی کی پیدائش ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء بمطابق ۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ میں ہوئی۔ آپ بریلی (روہیل کھنڈ) کے ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے یہ خاندان اپنے علم و تقویٰ کے باعث ممتاز تھا۔ آپ کے والدِ محترم مولانا نقی علی خان بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ آپ کے دادا حضرت رضا علی خان روحانیت میں خاص مقام رکھتے تھے۔ ان کے حالات "تذکرۂ علمائے ہند" میں موجود ہیں۔ حضرت مولانا احمد رضا خان شروع ہی سے ذہین اور طباع تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بلا کا حافظہ عطا فرمایا تھا۔ بعد میں آپ نے مختلف موضوعات پر ڈیڑھ ہزار سے زائد کتب تصنیف فرمائیں ان میں قرآنِ پاک کا ترجمہ بھی ہے۔ نیز حدیث شریف، فقہ، تصوف، تاریخ، ادب اور ریاضی کے علاوہ بہت سے دیگر

مضامین بھی شامل ہیں۔ سر ضیاء الدین مرحوم جو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر اور مشہور ریاضی دان تھے ایک بار ریاضی کے کسی مسئلہ کے سلسلہ میں جرمنی جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے تاکہ وہاں کے کسی پروفیسر سے اُسے سمجھیں۔ اس اثنا میں مولانا سلیمان اشرف ڈائریکٹر دینیات ادھر آنکلے انہوں نے سر ضیاء الدین کو حضرت بریلوی سے ملنے کا مشورہ دیا۔ پہلے تو وہ تیار نہ ہوئے لیکن پھر حضرت بریلوی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضرت نے ان کا مسئلہ چند لمحوں میں حل فرما دیا۔

حضرت بریلوی نے عبدالوہاب نجدی یا علمائے دیوبند کی طرح اسلام میں کسی نئے فرقے کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ آپ نے عامۃ المسلمین کے دلوں میں اسلام کی محبت کا نیا جذبہ پیدا کیا۔ اور ان کے اعتقادات کو دلائل و براہین سے مستحکم فرمایا۔ آپ کے علم و استدلال کے سامنے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے میدانِ سیاست میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی سخت مخالفت کی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہندو مفادات کو تقویت پہنچا رہے تھے۔ حضرت بریلوی کا موقف یہ تھا کہ کافروں اور مشرکوں سے مسلمانوں کا ایسا اشتراکِ عمل نہیں ہو سکتا جس میں مسلمانوں کی حیثیت ثانوی ہو۔ انہوں نے گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں کو مساجد میں لے جانے کی بھی مخالفت کی کیونکہ قرآنِ پاک کی رُو سے مشرکین نجس اور ناپاک ہیں اسی بنا پر آپ نے تحریکِ خلافت کی بھی مخالفت کی۔ آپ بھی قائدِ اعظم کی طرح "تحریکِ عدمِ تعاون" اور "تحریکِ ہجرت" دونوں کے مخالف تھے۔ کیونکہ یہ دونوں تحریکیں اس برِّ عظیم کے مسلمانوں کے مفادات کے منافی تھیں۔ بیشتر دیوبندی علماء کانگریس کے حامی تھے۔ ان کا یہ رویّہ بڑا عجیب تھا کہ ایک طرف وہ انگریز کی مخالفت کے زور میں ہندو کانگریس کی گود میں جا گرے تھے اور دوسری طرف وطنیت یا نیشنلزم جیسے مغربی نظریہ کو، جو اسلام کے منافی تھا، اپنا رہے تھے۔ اسی طرح ان کا یہ طرزِ عمل بھی سمجھ سے بالا تھا کہ جب وہ پارلیمانی جمہوریت کے حق

میں تھے تو پھر ہجرت کے ذریعے اندرونِ ملک مسلمانوں کی تعداد کیوں کم کرنا چاہتے تھے۔ پارلیمانی جمہوریت میں تو سیاسی اقتدار کی بنیاد ووٹوں کی تعداد قرار دی گئی ہے۔ لیکن چونکہ ان دنوں برِعظیم کا تقریباً سارا پریس ہندو کے قبضے میں تھا۔ اس لیے اس میں حضرت بریلوی کے خلاف بدنیتی سے انہیں بدنام کرنے کی ایک مہم شروع کر دی گئی۔ اور یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ آپ انگریزی اقتدار کی مخالفت نہیں چاہتے۔ حالانکہ حضرت بریلوی کا موقف یہ تھا کہ ہندو اور انگریز دونوں مسلمان کے مخالف ہیں۔ یہی علامہ اقبال کا موقف تھا۔ اور اسی کو بعد میں قائدِ اعظم نے اپنایا۔ حضرت بریلوی فرمایا کرتے تھے کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی ابھی ایک آنکھ کھلی ہے۔ انہیں چاہیئے کہ وہ دونوں آنکھیں کھولیں۔ یعنی ابھی وہ صرف انگریز کی مخالفت دیکھ سکے ہیں۔ ہندو کا تعصب اور عداوت نہیں دیکھ پائے۔

حضرت بریلوی نے بھرپور روحانی، علمی اور سیاسی زندگی گذارنے کے بعد ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ھ (۱۹۲۱ء) میں وصال پایا۔ ۱۹۴۰ء میں قراردادِ پاکستان منظور کی گئی۔ یہ گویا آپ کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ یہ قرارداد منظور ہوتے ہی حضرت بریلوی کے تمام عقیدت مند علماء اور صوفیاء تحریکِ پاکستان کے حق میں ایک دم اُٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے تمام مسلم جماعتوں کی مخالفت کے باوجود پاکستان قائم کرکے دکھا دیا۔

حضرت مجدد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

جناب مولانا وحید احمد مسعود بدایونی صاحب

مخالفین کو اگرچہ ناگوار ہے مگر حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے معتقدین "اعلیٰ حضرت" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ حضرت مولانا صاحب کی تعلیمات و تصنیفات انہیں اس سے بھی بہتر سید العلماء، تاج العرفاء، امام الاولیاء اور مجدد عصر کے خطابات کا مستحق قرار دیتی ہیں۔ وہ صرف عالم ہی نہیں تھے بلکہ عالم باعمل بھی تھے۔ ان کی فضیلت علمی ہی کی شہرت نہیں ہے بلکہ ان کے متعلق زہد و اتقاء کی بھی روائتیں مشہور انام ہیں۔ لہٰذا عالم متقی کو ولی بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان کے ملفوظات میں ان کے مکشوفات کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن محض کشف، دلیل ولایت نہیں ہے۔ اولیائے کرام فرماتے ہیں کہ کشف و کرامت کو مت دیکھو بلکہ استقامت کو دیکھو کہ شریعت کے ساتھ کیسی ہے۔ یہ تو سید احمد رائے بریلوی کے ہی معتقدین ہیں جنہوں نے ان کی ولایت کا انحصار محض کشف و کرامات پر رکھا ہے۔ حضرت مولانا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا علم نافع ان کی فقاہت پر منتہی تھا۔ اسی سے انہیں مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی سے اُن کا نام زندہ ہے۔ مولانا نے خود عالم کی تعریف بتائی ہے کہ وہ عقائد سے پوری طرح آگاہ ہو اور مستقل ہو اور اپنی ضروریات کو کتاب سے بغیر کسی مدد کے نکال سکے۔[1]

برسبیل تذکرہ اپنے کچھ حالات بیان کئے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ سب سے پہلا

---

[1] ملفوظ اوّل ص۹

فتوی ۱۲ر شعبان ۱۲۸۶ھ کو لکھا تھا۔ اس روز منصب افتاء عطا کیا گیا تھا۔ ۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء کو ولادت ہوئی تھی۔ گویا منصب افتاء کے حصول کے وقت عمر تیرہ برس دس مہینے چار دن کی تھی[1] اس سے ظاہر ہے کہ چھوٹی ہی عمر میں علم منقول و معقول کی تحصیل سے فارغ ہو گئے تھے۔ ان کے فتاوے اور تصانیف شاہد ہیں کہ انہیں فقہ و حدیث پر ہی نہیں بلکہ محدثین و فقہا کے اختلافات پر بھی عبور تھا۔ اور ذہانت و فراست کا یہ حال تھا کہ جملہ قسم کے حوالے اور سندیں پیش کر کے دقیق سے دقیق مسائل برجستہ حل کر دیا کرتے تھے۔ علماء عرب ان کی شاگردی پر فخر کرتے تھے۔ ان سے سندیں لینے یہاں آیا کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ محض کتابیں پڑھنے سے رد و افتاء نہیں آتا بلکہ اس کے لیے ماہر فن کی صحبت کی بھی ضرورت ہے۔ علم جفر میں اعلیٰ دستگاہ رکھتے تھے۔ متعدد عربی و مغربی علماء اس کو سیکھنے کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ اور مہینوں رہتے تھے[2] بجنور کے ایک مولوی صاحب عملیات کی کتاب لے کر کسی عمل کی ترکیب پوچھنے حاضر خدمت ہوئے۔ فرمایا میرے پاس ان عملیات کے ذخائر بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن بحمد اللہ آج تک کبھی اس طرف خیال بھی نہیں کیا۔ البتہ ان دعاؤں پر جو حدیث میں ارشاد ہوئی ہیں، عمل کیا ہے۔ میری تمام مشکلات ان ہی سے حل ہوتی رہتی ہیں[3] چنانچہ اکثر اپنے مصائب کا حال بھی بیان کیا ہے کہ ان حدیث والی دعاؤں سے بفضلہ تعالیٰ یک دم دور ہو گئی ہیں۔ مکہ معظمہ میں پہلی حاضری والدین کی معیت میں بہ عمر ۲۲۔۲۳ سال ہوئی تھی۔ واپسی میں تین دن شدید طوفان رہا۔ لوگوں نے پریشان ہو کر کفن پہن لئے۔ والدہ ماجدہ کا اضطراب دیکھ کر بے ساختہ میری زبان سے نکلا کہ اطمینان رکھئے۔ خدا کی قسم یہ جہاز نہیں ڈوبے گا۔ یہ قسم میں نے حدیث کے اطمینان پر کھائی تھی۔ جس میں کشتی پر سوار ہوتے وقت غرق سے حفاظت کی دعا ارشاد ہوئی ہے۔ چنانچہ میں نے وہ دعا

---

[1] ملفوظ اوّل ص۱۴، [2] ملفوظ حصہ دوم ص۳۸، [3] ملفوظ حصہ دوم ص۱

پڑھ لی تھی۔ قسم کھانے کے بعد بھی اندیشہ ہوا میں نے حضرت عزت کی طرف رجوع کی اور سرکارِ رسالت سے مدد مانگی۔ الحمدللہ کہ شدید مخالف ہوا موقوف ہو گئی اور بھانہ نے نجات پائی[۱]

فرمایا کہ گائے کا گوشت قطعاً حلال ہے بعض امزجہ میں گوشتِ بُز سے نافع تر ہے اس کی قربانی کا قرآنِ عظیم میں ارشاد ہے۔ خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اس کی قربانی ازواجِ مطہرات کی طرف سے فرمائی ہے۔ ہندوستان میں بالخصوص شعائرِ اسلام سے ہے۔ ہاں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا گوشت تناول فرمانا ثابت نہیں۔ اور مجھے تو گائے کا گوشت سخت ضرر کرتا ہے ایک دعوت میں مجبوراً کھانا پڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسوڑوں میں ورم آ گیا۔ اور اتنا بڑھا کہ حلق اور منہ بند ہو گیا پھر بخار آ آیا۔ اور کان کے پیچھے گلٹیاں نمودار ہو گئیں۔ ان دنوں بمبئی میں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی حکیم صاحب نے دیکھ کر بار بار کہا کہ یہ وہی ہے (یعنی طاعون) میں بول نہیں سکتا تھا مگر دل میں کہا کہ مجھے طاعون کبھی نہیں ہو سکتا حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ جو شخص کسی بلا رسیدہ کو دیکھ کر یہ دعا پڑھ لے گا وہ اس بلا سے محفوظ رہے گا۔ وہ دُعا یہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا ط جن جن امراض کے مریضوں اور جن جن بلاؤں کے مبتلاؤں کو دیکھ کر میں نے اسے پڑھا بحمدہٖ تعالیٰ آج تک ان سب سے محفوظ ہوں۔ اور بعونہٖ تعالیٰ محفوظ رہونگا[۲]

آخر ایک روز آخر شب میں کرب بڑھا۔ میرے دل نے درگاہِ الٰہی میں عرض کی۔ اللّٰھم صدق الحبیب وکذب الطبیب۔ اس کے بعد کسی نے میرے داہنے کان پر منہ رکھ کر کہا کہ "مسواک اور سیاہ مرچیں" میرا جو نگران جاگ رہا تھا اسے اشارے سے میں نے بلایا اور مسواک اور سیاہ مرچ کا اشارہ کیا۔ مسواک کا

---

[۱] ملفوظ دوم صد۲ ۔ [۲] ملفوظ جلد اوّل ص۲۱

اشارہ وہ سمجھ گئے۔ گول مرچ کے اشارے کو بڑی مشکل سے سمجھے۔ پھر مسواک کے سہارے تھوڑا منہ کھولا۔ اور مرچیں اسی راہ سے داڑھوں تک پہنچا دیں۔ اس کے بعد دو کلیاں خون کی آئیں۔ مگر تکلیف محسوس نہیں کی۔ بحمد اللہ تعالیٰ وہ گلٹیں جاتی رہیں۔ منہ کھل گیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور طبیب صاحب سے کہلا بھیجا کہ آپ کا وہ طاعون بفضلہ تعالیٰ دفع ہوگیا۔ اور بعونہ تعالیٰ دو تین روز بعد بخار بھی جاتا رہا [۱]

۱۹ سال کی عمر تھی۔ رامپور جاتے ہوئے ایک شخص کو رُمدِ چشم میں مبتلا دیکھ کر یہ دعا پڑھی جب سے اب تک آشوبِ چشم نہیں ہوا۔ صرف دو مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک آنکھ دُکھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دو چار دن کے بعد وہ صاف ہوگئی۔ . . . . . . مگر جمادی الاولیٰ ۱۳۰۰ھ میں بعض مہم تصانیف کے سبب ایک مہینہ کامل باریک خط کی کتابیں شبانہ روز علی الاتصال . . . . . دیکھیں۔ اٹھائیسواں سال تھا۔ ایک روز دوپہر شدتِ گرمی کی وجہ سے لکھتے لکھتے نہایا سر پر پانی پڑتے ہی معلوم ہوا کہ کوئی چیز دماغ سے داہنی آنکھ میں اُتر آئی — بائیں آنکھ بند کر کے داہنی آنکھ سے دیکھا۔ تو وسط شئے سوئی میں ایک سیاہ حلقہ نظر آیا۔ اس کے نیچے شئے کا جتنا حصہ ہوا وہ ناصاف اور دبا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

ایک ماہر چشم ڈاکٹر اینڈرسن نے غور سے ملاحظہ کرنے کے بعد بتایا۔ کہ کثرتِ کتب بینی کی وجہ سے یبوست آگئی ہے۔ پندرہ دن کتب نہ دیکھو مگر مجھ سے پندرہ گھڑی بھی کتاب نہ چھوٹ سکی۔ حکیم سید مولوی اشفاق حسین صاحب مرحوم سہسوانی ڈپٹی کلکٹر طبابت بھی کرتے تھے۔ اور فقیر کے مہربان تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ مقدمۂ نزولِ آب ہے۔ بیس برس بعد (خدا نا کردہ) پانی اُتر آئے گا۔ میں نے التفات نہ کیا۔ نزولِ آب والے کو دیکھ کر وہی دعا پڑھ لی۔ اور اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ پاک پر مطمئن ہوگیا۔ ۱۳۱۶ھ میں ایک اور حاذق طبیب کے سامنے ذکر ہوا۔ بغور دیکھ کر فرمایا چار برس بعد (خدا ناخواستہ) پانی اُتر آئے گا۔ ان کی رائے ڈپٹی صاحب کی رائے سے منطبق ہوگئی۔

---

[۱] ملفوظ حصہ اوّل صـ ۲۳-۲۴

مجھے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر ایسا اعتماد نہ تھا کہ طبیبوں کے کہنے سے معاذ اللہ متزلزل ہو جاتا۔ الحمد للہ کہ بیش۲ در کنار تیس۳ برس سے زائد گزر چکے ہیں اور وہ حلقہ ذرا بھر نہ بڑھا اور نہ بعونہٖ تعالیٰ بڑھے۔ نہ میں نے کتب بینی میں کبھی کمی کی اور نہ انشاء اللہ تعالیٰ کمی کروں۔ یہ میں نے اس لیے بیان کیا۔ کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائم و باقی معجزات ہیں جو آج تک آنکھوں سے دیکھے جا رہے ہیں۔ اور قیامت تک اہلِ ایمان مشاہدہ کریں گے۔۔۔۔۔۔ [۱]

مولانا صاحب کے اس قسم کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس درجہ عقیدت رکھتے تھے۔ وہ یقیناً " فنا فی الرسول تھے۔ چونکہ عاشق رسول تھے، اسوۂ حسنہ سے پوری طرح واقف تھے۔ اتباعِ سنّت ان کی عادت تھی۔ لہٰذا شانِ نبوی میں خفیف سی اہانت یا بے اعتدالی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہابیوں اور دیوبندیوں اور ندویوں کی مخالفت ان کی خصوصیت بن گئی تھی۔ اسی مخالفت کے سلسلہ میں ایک افترا پرداز کا قصّہ بیان فرمایا کہ پہلی مرتبہ کی حاضریٔ حرمین طیبین میں ایک کٹر وہابی نے خاص کعبۂ معظمہ میں مجھے آکر کہا کہ آپ میلاد شریف میں قیام کرنے کے لیے بہت زور دیتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ عام طور سے عرب شریف میں قیام ہوتا ہے مگر یہاں شیخ العلماء احمد زینی دحلان قیام کو منع کرتے ہیں۔ میں نے کہا شیخ العلماء کا دولت کدہ یہاں سے چند قدم ہے ابھی چلو دریافت کر لیں۔ میں نے چلنے کے لیے ہر چند اصرار کیا ۔ مگر وہ زمین پکڑ گیا۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ حضرت شیخ العلماء قیام فرماتے ہیں۔ استحسان قیام میں ان کے متعدد فتوے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب مستطاب " الدرر السنیہ فی الرد وہابیہ" میں اس کی جلیل صریح ہے اور سیرتِ نبویہ میں اس سے بھی روشن تر۔ [۲]

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوسرے حج کے عجائبات

---

[۱] ملفوظ حصّہ اوّل ص ۲۲-۲۳ [۲] ملفوظ حصّہ دوم ص ۷

سے اہلِ دانش متحیر ہو کر رہ جاتے ہیں اور صاحبانِ بصیرت لطف اندوز ہوتے ہیں۔
پہلی مرتبہ حج کی واپسی میں گھر پہنچ کر والدہ ماجدہ نے حکم فرمایا تھا کہ الحمد اللہ فرضِ حج تم نے ادا کر لیا۔ اب میری زندگی میں نفل حج کے واسطے نہ جانا لہٰذا والدہ کے حکم کے خلاف مولانا ان کی زندگی میں حج کی نیت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ہُوا یہ کہ اعلیٰ حضرت کے چھوٹے بھائی اور بڑے صاحبزادے نے مع متعلقین حج کی ٹھہرائی اور بوقت روانگی مولانا صاحب ان کو رخصت کرنے کے لیے لکھنؤ تک گئے۔ گھر آ کر چھ روز تک طبیعت منتشر رہی ساتویں روز عصر کے بعد خود بخود رائے قائم کی کہ حج کو چلنا چاہیئے چنانچہ ایک صاحب کو اسٹیشن پر بھیجا کہ اسٹیشن ماسٹر سے سیٹ ریزرو کرائیں اور ٹکٹ لے آئیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے جواب دیا کہ ریزرویشن کے لیے چوبیس گھنٹے پہلے درخواست آنا چاہیئے اور آج اس ٹرین میں جگہ بھی نہیں ہے۔ وہ صاحب مایوس واپس آ رہے تھے۔ کہ ایک شناسا گارڈ صاحب ملے انہوں نے کہا واپس چلو میں سیٹ ریزرو کرا دوں گا۔ چنانچہ ہو گئی اور ٹکٹ بھی خرید لیا گیا۔ اس کے بعد مولانا صاحب نے بعد مغرب اسٹیشن جانے کے لیے شکرم بھی منگوا لی۔ اب سوال یہ تھا کہ والدہ ماجدہ اجازت دیں گی یا نہیں۔ دربارِ رسالت میں اپنی مشکل پیش کی اور اجازت حاصل کرنے کے لیے امید وبیم میں گھر کے اندر پہنچے والدہ صاحبہ چادر اوڑھے ہوئے لیٹی ہوئی تھیں۔ ان کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ دریافت کیا کیا بات ہے؟ عرض کیا کہ حج کی اجازت چاہتا ہوں۔ جواب میں سنا کہ خدا حافظ اور یہ باہر آ کر شکرم میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے کچھ وقفہ کے بعد والدہ صاحبہ نے کہا میں نہیں جانے دوں گی۔
فوراً آدمی بھیجا گیا کہ واپس آئیں مگر یہ روانہ ہو چکے تھے۔ بے سرو سامانی کے ساتھ فوراً ارادہ کیا تھا۔ لہٰذا مشکلات برابر حائل راہ ہوتی رہیں۔ جب آگے جا کر ٹرین بدلی گئی تو وہ بے حد دیر میں ملی پھر سست چلی اور اتنی دیر ہو گئی کہ یقین ہو گیا کہ نہ وقت پر بمبئی پہنچ سکیں گے نہ قرنطینہ میں داخلہ ہو سکے گا۔ نہ ٹکٹ مل سکے گا اور نہ عزیزوں کی معیت حاصل ہو سکے گی۔ مگر حدیث کی دعاؤں کی برکت سے مشکلیں

حل ہوتی چلی گئیں اور جہاز میں جگہ مل گئی۔ عدن پہنچے اور کامران میں قرنطینہ میں داخل ہوئے۔ جہاز پر تقریباً روزانہ بیان فرمایا کرتے تھے۔ مناسکِ حج کی تعلیم فرماتے تھے۔ اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی تلقین کرتے تھے۔ ایک بڑا تاجر جو گنگوہی صاحب کا مرید تھا اس کے چہرے پر میرے بیان سے کدورت آجاتی تھی۔ دوسرے روز میں نے وہابیہ کے رد میں تقریر کی پھر وہ ہماری مجلس میں نہیں آیا۔ قرنطینہ ختم ہونے میں ایک دن باقی تھا کہ ہمارے سب ساتھی بیمار ہو گئے۔ اندیشہ ہوا کہ ہم روک لیے جائیں گے اور حج سے محروم ہو جائیں گے۔ جنگل میں جا کر حدیث کی دعائیں پڑھیں حضور غوث پاک سے استمداد کی درخواست کی۔ دس منٹ کے بعد جو دیکھا تو سب عزیز تندرست تھے اور ڈھائی میل پیدل چل کر سمندر کے کنارے پہنچے غرض مشکلات اپنی جگہ رہیں اور بعونہٖ حج کے تمام مناسک ہم لوگوں نے ادا کیے حرم محترم کے کتب خانے میں حضرت سید اسماعیل سے ملاقات ہوئی میری فوری دالتفاقیہ حاضری کی وجہ یہاں آکر یہ کھلی کہ وہابیہ یہاں آئے ہوئے ہیں جن میں خلیل احمد انبیٹھوی اور دیگر اہلِ ثروت و رؤسائے ریاست بھی ہیں۔ انہوں نے شریف مکہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مسئلہ علم غیب چھیڑا ہے۔ حضرت مولانا شیخ صالح کمال سابق قاضی مکہ و مفتی حنفیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے مسئلہ علم غیب کے متعلق مجھ سے دریافت کیا میں نے دو گھنٹے تقریر کی اور آیات احادیث اور اقوال آئمہ سے مخالفین کے شبہات کی تردید کی شیخ صالح کمال نے فرمایا۔ تمہارا آنا باعثِ رحمت ہوا پھر دوسری ملاقات میں مجھے پرچہ دیا جس میں علم غیب کے متعلق پانچ سوال تھے۔ اور بتایا کہ سیدنا شریف علی پاشا کے ذریعہ یہ سوالات ملے ہیں، ان کا جواب مقصود ہے۔ دو دن کے اندر لکھ دو کہ شریف کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں۔ مجھے اگرچہ بخار تھا مگر جوابات لکھنے میں مصروف ہو گیا کہ اتنے میں شیخ الخطباء وکبیر العلماء مولانا شیخ احمد ابوالخیر نے ناتمام جوابات کو سننے کے لیے اصرار کیا۔ سن کر بہت خوش ہوئے اصرار کیا کہ علم غیب کے سلسلہ میں بحث خمس کو بھی لکھئے اور رخصت ہوتے ہوئے فرمایا۔ "میں تمہارے قدموں کو بوسہ

دوں میں تمہارے جوتوں کو بوسہ دوں"۔ یہ میرے حبیب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت ہے۔ کہ ایسے اکابر کے قلوب میں اس بے وقعت کی یہ وقعت ہوئی۔ پھر صبح کو مولانا سید عبد الحیٔ ابن مولانا سید عبد الکریم محدث ملک مغرب تشریف لائے۔ علوم حدیث کے متعلق گفتگو رہی۔ اور انہوں نے علوم حدیث کی اجازتیں فقیر سے طلب فرمائیں رسالہ جواب میں لکھ لیا۔ اس کا تاریخی نام "الدولۃ المکیۃ بالمادۃ الغیبیۃ"، رکھا اور پنجشنبہ کی صبح ہی کو حضرت مولانا شیخ صالح کمال کی خدمت میں بھیج دیا۔ مولانا نے شریف کے دربار میں بعد نماز عشاء اس رسالہ کو پیش کیا۔ الغرض وہ رسالہ پڑھا گیا۔ اس محفل میں دو وہابی احمد نگیہ اور عبد الرحمٰن اسکوبی بھی تھے۔ انہوں نے بار بار دخل اندازی کرکے بحث چھیڑنے کی کوشش کی مگر حکم ہوا کہ پورا مضمون سننے کے بعد آپ اعتراض و بحث کرسکتے ہیں۔ رسالہ سن کر مخالفین پر اوس پڑ گئی۔ شریف محفل برخاست کرکے رسالہ اپنے ساتھ لے گئے۔ ان سے ہی علمائے کرام نے اس کی نقلیں حاصل کیں۔ اب مکہ معظمہ کے گلی کوچوں میں لڑکے تمسخر کے طور پر وہابیہ سے کہتے کہ اب کچھ نہیں کہتے وہ جوش کیا ہوا۔ تمہارا کفر و شرک تم پر ہی الٹ گیا"۔ علمائے کرام نے اس پر دھوم دھام سے تقریظیں لکھیں۔ مولانا ابو الخیر میر داد کے صاحبزادے مولانا عبد اللہ میر داد نے میرے ہاتھ پر بیعت کی یہ مسجد حرم کے پیش امام تھے۔ اس کے بعد وہابیہ نے فریب دینے اور مجھ پر حملہ کرنے کی متعدد کوششیں کیں مگر وہ اپنی ہر کوشش میں ناکام رہے۔ اس زمانہ میں میں نے اپنی کتاب حسام الحرمین کی تصنیف شروع کی اس پر اکابر نے جو عالی شان تقریظات لکھی ہیں، وہ اس میں شامل ہیں۔ حضرت مولانا شیخ صالح کمال نے خلیل احمد انبیٹھوی کی کتاب "براہین قاطعہ"، کا بھی ذکر شریف صاحب سے کر دیا۔ انبیٹھوی صاحب کو جب اس کی خبر ہوئی۔ تو مولانا کے پاس کچھ اشرفیاں بطور نذرانہ لے کر پہنچے کہ حضرت مجھ پر کیوں ناراض ہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ تجھ پر افسوس تو نے "براہین قاطعہ" میں وہ شنیع باتیں کیسے لکھ دیں۔ میں اس پر تجھے زندیق لکھ چکا ہوں۔ (اس سے پہلے مولانا غلام دستگیر قصوری مرحوم اپنی کتاب "تقدیس الوکیل"۔۔۔۔۔ لکھ کر علمائے مکہ سے تقریظیں لے چکے تھے

مولانا شیخ صالح کمال نے اس پر جو تقریظ لکھی ہے اس میں انبیٹھوی صاحب اور ان کے استاد: گنگوہی صاحب کو زندیق لکھا ہے) انبیٹھوی صاحب نے کہا جو باتیں میری طرف منسوب کی گئی ہیں وہ افتراء ہیں میری کتاب میں نہیں ہیں۔ حضرت نے فرمایا تمہاری کتاب براہین قاطعہ میرے پاس موجود ہے۔ انبیٹھوی صاحب نے کہا کہ کیا کفر سے توبہ قبول نہیں ہوتی۔ فرمایا کہ ہوتی ہے۔ مولانا نے چاہا کسی مترجم کو بلائیں اور براہین قاطعہ انبیٹھوی صاحب کو دکھا کر اور ان کلمات کا اقرار کروا کر توبہ لیں مگر انبیٹھوی صاحب رات ہی میں جدہ کو فرار ہو گئے۔ اور پھر غالباً مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت مولانا شیخ صالح کمال نے حضرت مولانا سید اسماعیل کو اس واقعہ کی اطلاع کا خط بھیجا اور انہوں نے وہی خط مجھے بھیج دیا۔ جو میرے پاس محفوظ ہے اس کے بعد صبح کو مولانا شیخ صالح کمال فقیر کے پاس تشریف لائے۔ اور خود یہ واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ وہ رات ہی میں بھاگ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ نے ہی بھگا دیا۔ فرمایا کہ میں نے کیسے بھگا دیا۔ عرض کیا کہ جب اس نے آپ سے پوچھا کہ کیا کافر کی توبہ قبول نہیں ہوتی اور آپ نے فرمایا ہوتی ہے بس اسی وجہ سے وہ بھاگ گیا۔ اس کا جواب آپ کو دینا یہ تھا۔ کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرے اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی یہ سن کر فرمایا واللہ یہ مجھ سے رہ گئی۔ غرض زمانہ قیام میں علماء و عظماء مکہ معظمہ نے بکثرت فقیر کی دعوتیں کیں۔ اور میری بڑی عزت افزائی فرمائی ...... اگرچہ صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ بیماری نے طوالت اختیار کر لی تھی۔ مگر روضۂ نبوی کی زیارت کے شوق میں تزلزل واقع نہیں ہوا لہٰذا ۲۴ / صفر ۱۳۲۴ھ کو کعبۂ تن سے کعبۂ جاں کی طرف روانہ ہوا۔ دیار حبیب میں ۳۱ روز حاضری نصیب ہوئی بارھویں شریف کی مجلس مبارک یہیں ہوئی۔ صبح سے شام تک علماء عظام کا ہجوم رہتا۔ سب نے میری عزت افزائی کی۔ حسام الحرمین پر تقریظیں لکھیں۔ اور فقیر سے علماء کرام نے سندیں اور اجازتیں لیں۔ مسجد قبا میں حاضری دی۔ سید الشہداء حمزہ کے مزار کی زیارت کی مگر زیادہ تر سرکار اقدس کے ہی یہاں اپنی حاضری رکھی۔ سرکار کریم ہیں۔ اپنے کرم سے قبول فرمائیں ....." [1]

---

[1] اقتباس از ملفوظات حصہ دوم ص ۵۵-۱

بہ تذکرۂ اعدا و حاسدین ارشاد فرمایا - میری عمر گزری لوگ میری مخالفت ہی کرتے رہے - مجھ سے بعض لوگوں نے کہا کہ مجموعۂ اعمال بھرا ہوا ہے - سینیاں بھری پڑی ہیں - کوئی عمل کر لیجئے - میں نے کہا - "جنہوں نے یہ تلواریں مجھے دی ہیں - انہیں کا حکم ہے کہ تلوار ہاتھ میں کبھی نہ لینا - ہمیشہ ڈھال ہی سے کام لینا - چنانچہ کبھی کسی پر تجربہ نہیں کیا - سوائے ایک دفعہ کے، کہ میں نے کرنا چاہا! اور نہ ہوا، جس سے ثابت کر دیا گیا کہ تیرے کئے کچھ نہیں ہو سکتا - ہم کرتے ہیں (پھر فرمایا) وہ خود ایسی مدد کرتا ہے کہ آپ انتظام کرنے کی ضرورت نہیں -" [۱]

باوجود خاندانی تعلقات ہونے کے مجھے حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف حاصل نہ ہو سکا - میں اس زمانہ میں طالب علم تھا اور مذہب سے زیادہ واقف نہ تھا - آج کوئی بیس۲۰ یا بائیس۲۲ برس ہوئے تو اعلیٰ حضرت کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کا اتفاق ہوا جب فاتحہ پڑھی تو نورانیت محسوس ہوئی اور دل جمعی حاصل ہوئی - خداوندِ کریم اپنے حبیب کے صدقے میں اُن کا فیض جاری رکھے -

(عطیہ حکیم محمد موسیٰ صاحب، امرتسری دام ظلہٗ)

---

[۱] ملفوظ چہارم ص۵۹

مولانا احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

از شفیق بریلوی

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضلِ بریلوی علیہ الرحمۃ ایک ہمہ صفت بزرگ تھے۔ عرب و عجم ہر جگہ ان کے علم و فضل، ان کی ذہانت اور نکتہ رسی کی غیر معمولی انداز سے تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ قرآنِ مجید کی تفسیر، احادیثِ نبوی کی تشریح اور فقہی مسائل کی شرح و بیان میں وہ بلند درجہ پر فائز تھے۔ وہ ایک جیّد عالمِ دین اور بڑے نکتہ رس فقیہ ہونے کے علاوہ ایک بلند پایہ نعت گو شاعر بھی تھے۔ ان کو فن اور زبان پر پوری قدرت حاصل تھی۔ وہ عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتیں قرآن و احادیث کی تفسیر و ترجمہ ہیں۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی نے نعت گوئی قرآنِ مجید سے ہی سیکھی تھی۔ ان کو عربی، فارسی، اردو اور ہندی زبانوں پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ان کا قرآنِ مجید کا ترجمہ بھی بہت مشہور و مقبول ہے۔ قرآنِ مجید کے اس ترجمہ میں زبان و بیان کی شگفتگی بھی موجود ہے اور یہ عام فہم بھی ہے۔ اس میں اعلیٰ حضرت کے شاعرانہ ذوق، عالمانہ بصیرت، ایمان کی پختگی، محبتِ رسول اور ادب کے جوہر نمایاں ہیں۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان فاضلِ بریلوی قدس سرہٗ، ۱۰ر شوال ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء کو روہیلکھنڈ کے تاریخی شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ اعلیٰ حضرت کے والد ماجد مولانا نقی علی خان اور دادا مولانا رضا علی خان بھی اپنے وقت کے ممتاز عالم اور مشہور بزرگ تھے اور اعلیٰ حضرت کے جدِّ اکبر حضرت مولانا سعید اللہ خان قندھاری

سے ، محمد شاہ کے عہد ۱۷۳۶ء میں ہندوستان آئے وہ قندھار کے ایک ممتاز و معزز خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔

ولادت کے بعد اعلیٰ حضرت کا نام، محمد رکھا گیا۔ اور تاریخی نام المختار (۱۲۷۲ھ) لیکن دادا نے احمد رضا نام پسند فرمایا اور وہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔ آپ نے علوم ظاہری و باطنی اپنے والد ماجد اور اس دور کے دوسرے مشاہیر علمائے کرام سے حاصل کئے۔ عمر کی چودھویں منزل میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی فارغ التحصیل ہو گئے اتنی کم عمری میں تبحر علمی کا حامل ہونا بھی ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت کا بڑا ثبوت ہے ، ۲۱ سال کی عمر میں والد ماجد کے ساتھ بریلی سے مارہرہ گئے اور وہاں سلسلۂ قادریہ ، چشتیہ ، سہروردیہ اور نقشبندیہ کے ممتاز و مشہور بزرگ حضرت مولانا شاہ آلِ رسول مارہروی سے بیعت اور خلافت کا شرف حاصل کیا۔ پھر حج بیت اللہ شریف کا فخر پایا اور اسی سرزمینِ مقدس میں اکابر علمائے کرام سے احادیث ، تفاسیر اور فقہ میں فیض حاصل کیا۔

اب اس آفتابِ دین کی روشنی محلہ سوداگران بریلی کے ایک حجرہ سے تمام برِ صغیر میں پھیل رہی تھی۔ وہ پورے برِ عظیم کے مسلمانوں کو اسلام کا سچا شیدائی اور رسول مقبول کی ذاتِ اقدس سے والہانہ محبت و عقیدت میں ڈوبا ہوا دیکھنا چاہتے تھے اسی جذبے اور اسی نصب العین کے تحت جب ۱۹۲۰ء میں انگریز حکومت کے خلاف ، تحریکِ خلافت کی ہم نوائی میں مسٹر گاندھی کے اشارہ پر کانگریس نے ترکِ موالات کا اعلان کیا اور ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائے تو مولانا احمد رضا خان نے اس کی شدید مخالفت کی۔

مولانا احمد رضا خان فرماتے ہیں کہ معاملات ، روزمرہ کے لین دین اور تعلقات و مراسم کی بات مختلف ہے لیکن دو قوموں کا اتحاد ، یعنی ہندو مسلم اتحاد کی بات بالکل علیحدہ اور جدا ہے۔ لفظ ، اتحاد کے انتخاب و استعمال پر ان کو سخت اختلاف تھا اور آخر یہی مفہوم تھا جس کو علامہ محمد اقبال اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے آخری دور میں

واضح کیا۔

مولانا احمد رضا خان صحیح معنوں میں، مجدّدِ ملّت تھے۔ انہوں نے اپنے دَور کی تمام دینی تحریکات میں بڑے جوش و خروش سے حصّہ لیا اور جدید نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی بڑے کام کئے، دین کے ہر گوشہ اور ہر موضوع پر ان کی تصانیف و تالیف موجود ہیں۔ قرآن، احادیث، فقہ، سیرت اور تاریخ و تصوّف پر تقریباً ایک ہزار کتابیں موصوف نے لکھی ہیں۔ عالم اسلام کے اکابر علمائے کرام آپ کے شرعی فیصلوں اور فتاویٰ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ فرماتے تھے کہ: مولانا احمد رضا خان بریلوی اپنے دور کے امام اعظم ابوحنیفہ ہیں۔"

مولانا احمد رضا خان بریلوی ۲۵ / صفر المظفر ۱۳۴۰ھ بمطابق ۱۹۲۱ء کو بعد نمازِ جمعہ، اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے اور واصل بحق ہونے سے قبل قرآنِ مجید کی ایک آیت سے اپنی تاریخ وفات خود نکالی اور اس آیت کا ترجمہ ہے کہ:

"اور گردش میں لائے جائیں گے اُن پر چاندی کے جام اور پیالے"

قرآنِ کریم کی آیت سے اپنی تاریخِ وفات نکالنا اپنی جگہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ مولانا احمد رضا خان کو اپنے ماضی، حال اور مستقبل، حیاتِ ابدی اور جنت الفردوس کے حصول کا کس قدر یقین تھا اور یہی وہ یقین ہے جس کا خود خداوند تعالیٰ اور بارگاہِ رسالت سے حکم ملا ہے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی نے اپنے خلفاء، مُریدین اور تلامذہ کی بہت بڑی تعداد چھوڑی جو دُنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں، پاکستان اور ہندوستان میں بھی ان کے مُریدوں اور معتقدوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ لیکن مولانا احمد رضا خان بریلوی کے حقیقی نصب العین کو پوری طرح سمجھ کر اس کو پیش کرنے اور ملتِ اسلامیہ کو دین کے مرکز پر سمیٹنے اور مستحکم کرنے کی مخلصانہ کوششیں کم ہی کی گئی ہیں۔"

موجودہ دَور میں خاص طور پر پاکستان میں اصول اور فروع، جڑوں اور شاخوں کے فرق کو پیشِ نظر رکھ کر مولانا احمد رضا خان بریلوی کے ارشاد و ہدایات کی اشد ضرورت ہے۔ فقہی اختلافات تمام مشاہیر فقہاء میں بھی ہوتے رہے ہیں۔ امام شافعی

(المتوفی ۲۰۴ھ) نماز میں رکوع میں جاتے اور سر اٹھاتے وقت بھی، رفع یدین کرتے تھے یعنی ہاتھ اٹھاتے تھے۔ اور امام ابو حنیفہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نماز میں ایک مرتبہ ابتداء میں ہاتھ اٹھانے کے قائل تھے امام شافعی سورۃ فاتحہ کے بعد بلند آواز سے "آمین"، کہتے تھے۔ اور امام ابو حنیفہ سورۃ فاتحہ کے بعد آہستہ سے آمین کہنے کے قائل تھے۔ لیکن جب امام شافعی، امام ابو حنیفہ کے مزار مبارک پر بغداد میں فاتحہ پڑھنے کے لیے گئے اور وہاں مسجد میں نماز ادا فرمائی تو نہ بلند آواز سے آمین کہی اور نہ ہاتھ اُٹھائے۔ بلکہ امام ابو حنیفہ کے فیصلہ کے مطابق عمل کیا اور یہ بتایا کہ اصل چیز دین ہے۔ اس میں اختلاف نہیں ہو سکتا اور فروعی مسائل کے اختلاف کو اتنا سنگین نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے اختلاف شخصی اور دائمی ہو جائے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اس نظریہ پر عمل پیرا تھے۔ وہ مسائل میں شدید تھے۔ مگر جن لوگوں سے ان کا اختلاف ہوا وہ فقط مسائل کا اختلاف رہا۔ شخصی محبت اور احترام میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔ اب کہاں ہوں گے ایسے عظیم المرتبت انسان"

اعلیٰ حضرت اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

جناب محمد ایوب صاحب

۷۸۶

ڈپٹی سکریٹری، منسٹری آف فنانس
336، شالیمار 6/3 - اسلام آباد

11-1-76

مکرمی و محترمی جناب چشتی صاحب!

سلام مسنون - مزاج گرامی - آپ کا یکم دسمبر کا لکھا ہوا نامۂ کرم مجھے مل گیا تھا۔ شدید مصروفیات کے سبب جواب جلد نہ لکھ سکا - اس اثنا میں مجھے کچھ عرصہ کے لیے کراچی بھی جانا پڑا - تاہم تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں ——

آپ کی جانب سے یہ اطلاع باعثِ مسرت ہوئی کہ آپ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان قدس سرہٗ العزیز کے بارے میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں - بلاشبہ یہ ایک مبارک اقدام ہے - اللہ تعالیٰ توفیق ارزانی فرمائے کہ آپ اس کارِ خیر کو بوجہ احسن پورا کر سکیں - مولانائے موصوف سے متعلق مشاہیر کے تاثرات یقیناً "کتاب کی افادیت میں اضافہ کا باعث ہوں گے - لیکن مجھ ایسے عامی کو مشاہیر کی صف میں کھڑا کرنا نہ صرف برعکس نہند نام زنگی کافور، کے مصداق ہوگا - بلکہ عروسِ شہرت بھی نوحہ گر ہوگی - کہ

ع اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی !!!

اپنی نااہلی اور پستی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حضرت کی عظمتوں کا ضرور معترف ہوں - چنانچہ ایک عظیم دینی شخصیت کا ذکر میرے لیے تحدیثِ نعمت سے کم نہیں۔

نعمت کا ذکر و شکر یوں بھی احکام الٰہیہ سے ہے اور بمنزلۂ فرض۔ اس لیے ایک فرض کی ادائیگی جان کر، اپنی محدود استعداد، معلومات اور فکر و نظر کی سطح کے مطابق اعلیٰحضرت سے متعلق چند گذارشات پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وما توفیقی اِلّا باللّٰہ العلی العظیم ۵

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان قدس سرہٗ العزیز بڑے متبحّر عالم تھے۔ اُن کے تبحّرِ علمی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ جن علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے۔ اُن کی تعداد ۵۴ تک پہنچتی ہے۔ انھوں نے ایک ہزار کے قریب کتابیں اور رسائل تصنیف و تالیف کئے۔ اُن کی ذہانت و فطانت کا یہ عالم تھا کہ آپ صغر سنی ہی میں متداولہ دینی علوم کی تحصیل سے فارغ ہو گئے۔ یہاں تک کہ تیرہ برس کی عمر میں فتویٰ نویسی کرنے لگے۔ طریقت کے میدان کے بھی شہسوار تھے۔ متعدد سلسلوں میں آپ کو خلافت و اجازت حاصل تھی۔ منجملہ دیگر علوم و فنون کے آپ علمِ عروض میں مہارتِ تامہ رکھتے تھے۔ نعت گوئی کے لطیف و عزیز فن میں اُن کا مرتبہ عظیم تھا۔

اعلیٰ حضرت کو مختلف خطابات سے پکارا گیا ہے۔ مثلاً اپنے زمانہ کے تمام مؤلفوں کے سردار اور مصنّفوں کے امام، استادِ کامل، آسمانِ صفا کے آفتابِ عرفان، اصولیٔ زمان، آفتابِ معرفت، افضل الفضلاء، امام الائمۃ، امام المحدثین، امامِ شہیر، امامِ کبیر، امامِ معظّم، انبل النبلاء، بارانِ نافع، البحر الطمام، برکۃ الانام، بقیۂ سلف کرام، بلند ہمّت فاضل، بے نظیر عالم، پیشوائے زمانہ، پیشوائے معتمد، حامیٔ ملّتِ محمدیہ، حضرت المولیٰ، خاتم علمائے محققین، خزانۂ حقائق، الدراکۃ الفہامہ، ذوالتحقیق الباہر، دریائے بیکراں، دریائے عظیم الفہم، دریائے علم و دانش، دین و شریعت کے مینارہ کے محافظ، زکی بلند ہمّت، رسولِ اکرم کے سچے عاشق، رونقِ محفل، ستودۂ اقوال و افعال، سردارِ وقت، سعد الملّت والدین، سلطان العلماء المحققین، سیّد العلماء العلّام، سیّدِ شیوخ و

فضلائے کرام، الشیخ الامام، الشیخ الکامل، صاحبِ احسان، صاحبِ تحقیق و تنقیح، صاحبِ تدقیق و تزئین، صاحبِ ذہنِ رسا، صاحبِ فضیلت و معرفت، صاحبِ عدل، صاحبِ مناقب و مفاخر، عالمِ باعمل، عالمِ لغت و علم جدل، عالم محقق و مدقق، عقدۃ الموحدین، عقدہ کشائے علوم ظاہر و باطن، علّامۂ اجل، علامۂ دوراں، علّامۂ عقیل، علامۂ فاضل، علامۂ کامل، علّامۂ کبیر، علّامۂ محقق، عمدۂ علمائے اہلِ سُنّت، فاضلِ کامل، فاضلِ متبحر، فاضلِ مصنّف، فخرِ فضلائے کرام، فخرِ سلف، فخرِ ہندوستان، الفہامۃ الشہیر، الفہامۃ المدقق، کنز الدقائق، کنز العلم، قامع بدعت، قدوۃ الخلف، گمراہوں اور ملحدوں کی زبانوں کو اپنے براہین کی تلوار سے کاٹنے والے، گوہرِ یکتائے زمانہ، متکلم، مناظر اور مفسّر، مجدّدِ ملّتِ اسلامیہ، محبوب و مقبول و مرغوب، محفوظ خزانوں کا انتخاب، محقق و مدقق علوم اصول و فروعِ شریعت، محیطِ کامل، مرکزِ دائرۃ المعارف، مسائل اور مشکل احکام کی تنقیح کرنے والے اور دلائل و براہین سے اُن کو مستحکم سے مستحکم تر کرنے والے، مطلع کواکب آسمان علوم، مفسر، محدّث، اصولی فقیہہ، ملحدوں کی گردنوں کے لیے تلوار، موجودہ زمانے اور وقت کا نور، موجودہ صدی کے مجدّد، مؤیدِ نورِ قلب و یقین، مینارِ ایمان کو بلند کرنے والے، ...... نادرِ روزگار و خلاصۂ لیل و نہار، ناصرِ سنّت، نام آور و شہیر نہایت محمود سیرت، وہ علّامہ جس کی وجہ سے پچھلے، اگلوں پر فخر کرتے ہیں، ہدایت یافتگان کے نگہبان، یکتائے ائمۂ زہاد و کاملینِ عباد، یکتائے زمانہ، یگانۂ اساتذۂ ہند، یگانۂ روزگار وغیرہا۔

یہ صرف وہ القابات ہیں جو حجازِ مقدّس کے عظیم المرتبت علمائے کرام نے اپنی تحریروں میں اعلیٰ حضرت کے لیے استعمال کئے ہیں۔ مجھ ایسا بے بصر اگر ایسے القابات اُن سے منسوب کرتا تو یقیناً "وہ تحسینِ ناشناس ہوتی۔ یہ کلمات، اعلیٰ حضرت کی ہمہ گیر شخصیت، اُن کے فضل و کمال، اُن کی بے نظیر دینی خدمات اور اربابِ نظر کے حلقہ میں اُن

کی محبوبیّت کی نشاندہی کرتے ہیں ـــــ

اعلیٰ حضرت کے فضائل و شمائل کی جانب جب توجّہ مبذول ہوتی ہے تو سرِ فہرست اُن کا جذبۂ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ روحی و امی و ابی و کونینی) نظر آتا ہے ۔ راقم کے نزدیک اعلیٰ حضرت کی گوناگوں خوبیاں، بلندیٔ معراج و مراتب اور تیزیٔ فہم و فراست صرف اسی ایک جذبہ کے انعامات ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ایک دن اعلیٰ حضرت، احباب و تلامذہ کے ساتھ، اپنے گھر کے باہر چبوترہ پر تشریف فرما تھے ۔ محلّہ میں سے سیّد گھرانے کا ایک بچّہ، بازار کی جانب جاتے ہوئے چبوترہ کے سامنے سے گزرا ۔ اعلیٰ حضرت بچّے کو دیکھ کر تعظیماً دست بستہ کھڑے ہوگئے ۔ اس کے بعد وہ بچّہ کئی مرتبہ بازار کی طرف گیا ۔ اور واپس آیا ۔ ہر مرتبہ، جب وہ چبوترہ کے سامنے سے گزرتا تو اعلیٰ حضرت بلا تکلّف دست بستہ کھڑے ہو جاتے ۔ یہ واقعہ بادی النظر میں ممکن ہے کہ غیر اہم بلکہ قابلِ استہزا سمجھا جائے ۔ لیکن اہلِ دل جانتے ہیں کہ یہ جذبۂ تعظیم، دراصل سرورِ کونین، سیدالثقلین، صاحبِ قاب قوسین، محبوبِ ربِ المشرقین والمغربین، جدالحسن والحسین، وسیلتنا فی الدارین، علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی بے پناہ محبّت کا اظہارِ بے اختیار تھا ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس درجہ کی جنوں ساماں محبّت، اللہ تبارک و تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے ۔

نصوصِ قطعیہ سے ثابت ہے کہ جب تک محمدٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب محبّتوں سے بالاتر محبّت نہ ہوگی، ایمان کا دعویٰ باطل قرار پائے گا ۔ گویا حضور سید المرسلین، خاتم النبیّن کے ساتھ انتہائی محبت ہی شرطِ ایمان اور عین اسلام ہے ۔ اس شرط کو صحابہ کبار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے کما حقّہٗ پورا کیا ۔ ان قدسی صفات ہستیوں نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بے پناہ عشق و محبّت سے سرشار ہو کر جاں نثاری، اور فدا کاری کی وہ درخشاں اور قابلِ صد رشک مثالیں پیش کیں جن سے تاریخ انسانی کا دامن بالکل تہی تھا ۔ اسی طغیانِ محبّت نے مسلمانوں کو تھوڑے ہی عرصہ میں برگزیدۂ عالم و عالمیان بنا دیا ۔ دراصل دنیاوی

زندگی کی ساری نعمتیں اور حیاتِ اُخروی کی تمام سعادتیں حضورِ اقدس کی والہانہ محبت ہی کے ثمرات ہیں ـــــ مسلمانوں میں جب تک یہ رسمِ محبت پورے اخلاص کے ساتھ کار فرما رہی، اقوامِ عالم میں اُن کا پایہ سب سے بلند رہا۔ لیکن جونہی اس محبت کے اندر بعض آمیزشوں نے راہ پائی۔ ملتِ اسلامیہ کو ہمہ جہت انحطاط نے آلیا۔ اعلیٰحضرت کے جذبۂ عشقِ رسول کو جب ہم اپنی تاریخ کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اُن کے دل میں عہدِ اوّلین کی اُس پاکیزہ و مطہر اور نفیس و جمیل رسمِ محبت کے احیا کی تمنّا صد ہا پیچ و تاب کے ساتھ انگڑائیاں لے رہی تھی ـــــ

انسان کے اندر متعدد اعضاء و جوارح ہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مقام، الگ الگ عمل اور اپنے اپنے قواعد و خواص ہیں۔ جگر، دماغ کا ہمسر نہیں، دماغ، دل کا ہم پایہ نہیں، دماغ کے شئون و عوالم اور دل کے احوال و کوائف اور، دماغ، مقامِ عقل ہے تو دل، مقامِ محبت۔ داعیاتِ انسانی میں سب سے ارفع و اعلیٰ داعیہ، داعیۂ محبت ہے۔ کیونکہ کائنات کی بقاہی محبت و رحمت پر ہے۔ محبّت کے مقابلہ میں باقی تمام تصوّرات فروتر ہیں۔ اس لیے دل کا مقام سب سے بلند ہے۔ محبّت کے کاروبار میں خرابی اُس وقت پیدا ہوتی ہے۔ یا بالفاظِ دیگر، محبّت اُس وقت بے تاثیر ہوتی ہے۔ جب دماغ کے ذریعے محبّت کرنے کی کوشش کی جائے۔ یا عقل کے شئون کو دل کے کوائف سمجھ لیا جائے۔ حضور صلیّ اللہ علیہ وسلم کے دینِ حسین و مبین کے ساتھ محبت، جو حضور کی محبّت کا پیش خیمہ ہے، اُسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ اللہ علیم و حکیم اپنے فضلِ عمیم سے، علمِ دین کو قلبِ مومن پر نازل فرمائے۔ ورنہ ایسا شخص جس کے علم کے سوتے مقامِ عقل سے پھوٹتے ہیں یا جس کا علم، خانۂ دماغ میں نزول کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ علمی گردانوں کے چکر ہی میں پھنسا رہتا ہے۔ محبّت کا عرفان و عروج اُسے نصیب نہیں ہوتا۔ اعلیٰحضرت خوش نصیب تھے کہ انہیں علمِ دین مقامِ دل پر عطا ہُوا۔

محبّت نعمائے الٰہی میں سے عظیم ترین نعمت ہے۔ جسے یہ نعمت مل گئی اُسے

سب کچھ مل گیا۔ انعامات قابلیت کے اعتبار سے ہی دیئے جاتے ہیں۔ ادنیٰ انعامات کثرت میں تقسیم ہوتے ہیں تو اعلیٰ انعامات قلت کے حصہ میں آتے ہیں۔ اور جب انعام، اعلیٰ ترین ہو تو ظاہر ہے کہ اس کے پانے والے بھی خال خال ہی ہوں گے۔ خود منعم بھی اس قسم کے انعام کو ارزاں نہیں ہونے دیتا۔ چنانچہ محبّت کا انعام، جو تمام انعامات سے افضل و اعلیٰ ہے، اگر کسی کو مل جاتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ اُس کے پانے والے کی خوبیِ قسمت منفرد ہے ؎

کنند جیب پُر از سیم و زر ہزاراں را
متاعِ عشق ولیکن بہ ہر کسے نہ دہند

حضور کی محبّت تمام محبّتوں کی سرتاج ہے۔ اس عالم کی ساری محبّتیں، حضور ہی کی محبّت میں گُم ہو جاتی ہیں — حضور ہی کی محبّت اصلِ ایمان ہے۔ محبّت صرف محرکِ عمل ہی نہیں بلکہ بجائے خود ایک عمل بھی ہے۔ ایمان و عمل یہی زندگی کی دنیاوی کامیابیوں اور اُخروی شادکامیوں کا مدار ہے۔ زندگی کی تفصیلات سے نکل کر جب اس کے اجمال پر نظر کرتے ہیں تو دل پکار اٹھتا ہے ع

زندگی عشقِ محمد ہست و بس

مذکورہ صدر حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان قدس سرّہٗ العزیز نے زندگی کی حقیقی تعبیر کو پالیا تھا —

والسلام مع الاکرام

خادمِ محبّانِ رسولِ محبوب

محمد ایوب

اُردو نعت گوئی کا درخشندہ ستارا

الحاج حکیم مظفر عزیز مدیر اعلیٰ ماہنامہ "نویدِ بہار" (لاہور)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی رُوْحِ مُحَمَّدٍ فِی الْاَرْوَاحِ، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی جَسَدِ مُحَمَّدٍ فِی الْاَجْسَادِ، اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی قَبْرِ مُحَمَّدٍ فِی الْقُبُوْرِ، یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا عَزِیْزُ۔

عزیز محترم محمد مرید احمد صاحب چشتی! سلامت باشد!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے ارشاد کے مطابق حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ کی نعت گوئی اور حُبِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر چند سطور پیشِ خدمت ہیں۔ قلم اُٹھانے کی ہمت نہیں تھی، آپ کے ارشاد کی تعمیل ملحوظ تھی ع

من آنم کہ من دانم

خصوصی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ والسلام : مخلص : مظفر عزیز

ممتاز عالمِ دین حضرت مولانا احمد رضا خان رضا بریلوی، اپنے وقت کے ایک پابندِ شریعت اور صاحبِ طریقت، خدا رسیدہ بزرگ تھے، آپ کا سلسلہ آج بھی قائم ہے اور اس سلسلہ سے تعلق رکھنے والے لاکھوں حضرات اپنے نام کے ساتھ بریلوی لکھتے ہیں۔ آپ کی نعتیہ اور عاشقانہ شاعری کو اہلِ دل کے حلقوں میں ایک بلند مقام

حاصل ہے، آپ ۱۸۵۶ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۲۱ء مطابق ۱۳۴۰ھ میں وفات پائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

آپ کا نعتیہ کلام "حدائقِ بخشش" کے نام سے چھپ چکا ہے اور مدینہ پبلشنگ کراچی نے بھی اس کا ایک خوبصورت ایڈیشن چند سال قبل شائع کیا تھا۔ لیکن اس "خوبصورت ایڈیشن" کی اشاعت میں بھی مولانا احمد رضا خان کی نعت گوئی سے انصاف نہیں ہُوا۔ کتابت کی عجیب و غریب غلطیوں نے بعض اشعار کے حُلیے بگاڑ دیئے ہیں۔ کاش نئے ایڈیشن میں اس پر توجہ کی جائے۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا حالی، مولانا شبلی، اکبر الہ آبادی اور امیر مینائی وغیرہ کے ہم عصروں میں تھے، آپ کی شاعری کا محور خاص، محبوب رب العالمین، رحمۃ للعالمین، فخرِ موجودات، سردارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، زندگی اور محبوبیت تھی۔ ان کی نعتیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت میں ڈوبی ہوئی ہیں اور محبوبِ حق سے والہانہ لگاؤ کا ثبوت ہر قدم پر فراہم کرتی ہیں۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اور ذاتِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک کے سارے پہلوؤں کو اپنی نعتیہ شاعری کی صورت میں سمیٹ لینے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے مولانا، اُردو کے اہم ترین نعت نگار ہیں۔

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ کے نزدیک نعت کے موضوع کا حقیقی محور سیرتِ محمدی اور اُسوۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ اور اس محور سے انحراف سے توحید و رسالت کا عقیدہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ بقول علامہ اقبال

ؔ بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی، تمام بولہبی ست

مولانا احمد رضا کی نعتیہ شاعری نے ہماری زندگی، اور شعر و ادب دونوں پر گہرا اثر ڈالا ہے ان کی نعتیہ شاعری پر تصوّف کے اثرات بھی بہت گہرے

اور واضح ہیں۔

مولانا نے نعت گوئی کو نہایت سنجیدگی سے ایک مستقل فن کی حیثیت سے اپنایا، اُردو شاعری میں نعت گوئی کی روایت کو بلند سطح تک پہنچانے میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ انہوں نے درُود و مناجات اور سلام کی صورت میں نہایت مؤثر، پاکیزہ اور معنی آفریں نعتیں کہی ہیں، ان کے نعتیہ کلام سے محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والاصفات سے والہانہ محبّت اور خلوصِ عقیدت کا رنگ ٹپکتا ہے۔ ان کی نعتوں کا مطالعہ کرنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہنا چاہا ہے، وہ نہایت سادگی، بے ساختگی، دل کی گہرائی اور عقیدت مندی کے ساتھ کہا ہے، ان کی نعتیں، ان کے وفورِ جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی نعتیں مولود شریف کی محفلوں اور سیرتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ جن سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والاصفات سے شدید محبّت اور ایک طرح کی تڑپ کا احساس ہوتا ہے۔

حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی علیہ الرحمۃ کے بعض نعتیہ اشعار کی پُرکاری کا یہ عالم ہے کہ پڑھ کر قلب و روح دونوں مسحور ہو جاتے ہیں۔ ان کے ایک "سلام" کو مقبولِ عام کا درجہ حاصل ہے، جس کا مطلع ہے ؎

مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

اِس "سلام" کا ایک نہایت پاکیزہ شعر، فخرِ موجودات، سرورِ کائنات، نبیِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی عزّت و توقیر اور آپ کے ذکرِ پیدائش کا آئینہ دار ہے۔ یہ شعر جب پہلی بار میری نگاہ سے گزرا تو میں نے یوں محسوس کیا کہ خلوص و عقیدت میں ڈوبا ہوا یہ نذرانۂ عقیدت، ساری کائنات کی سرخوشی کا مرقّع بن کر میرے سامنے آگیا ہے۔ مجھے مولانا کا یہ شعر، سادگی، صفائی، حُسن کاری، منظرکشی، واقعہ نگاری، تہذیبی متانت، جذبے کی سچائی اور احساس کی پاکیزگی کے لحاظ سے

نہایت بلند پایہ نظر آیا۔ ملاحظہ فرمائیے کیوں نہ اس ایک شعر پر نعتوں کے ہزاروں دیوان قربان کر دیئے جائیں۔ جی چاہتا ہے کہ اس شعر کو بار بار پڑھتے جائیں ؎

جس سہانی گھڑی چمکا طیبہ کا چاند
اُس دل افروز ساعت پہ لاکھوں سلام

میرے نزدیک حضرت مولانا احمد رضا بریلوی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر اُردو نعت گوئی کی تاریخ کا سب سے روشن ستارا ہے۔ انہوں نے اپنے اس ایک شعر میں، ایک طویل نعتیہ قصیدہ، نہایت بلاغت و اختصار کے ساتھ اس طرح کہہ دیا ہے کہ اس سے بہتر کا تصور بھی ناممکن نظر آتا ہے۔

مستانہ اور عاشقانہ فضا میں ڈوبے ہوئے اس شعر کو پڑھتے ہی انسان کا ذہن، محسنِ کائنات، فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکرِ پیدائش اور محبوبیت کی طرف جاتا ہے اور دل درود شریف کا ورد کرنے لگ جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی جب پہلی مرتبہ اس شعر کو پڑھا تو میری زبان پر حسبِ ذیل درود شریف جاری ہو گیا:۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ
وَعَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا اِبْرَاھِیْمَ اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْد

بڑی دیر تک میں اس درود شریف کا ورد کرتا رہا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں برکتوں والی منزل میں اُتر رہا ہوں، صدق کے مقام میں داخل ہو رہا ہوں اور صاحبِ جلال و اکرام نے کائنات کے مالک نے، اپنی انتہائی رحمت کے دروازے مجھ پر کھول دیئے ہیں۔ اسی عالمِ کیف میں بے ساختہ میری زبان پر ذیل کا "سلام" جاری ہو گیا اور میں آج تک اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ مولانا رضا بریلوی کے ایک سادہ اور دلکش شعر نے مجھ سے وہ "سلام" لکھوایا جو میری زندگی کا حاصل ہے۔ یا حی یا قیوم برحمتک استغیث۔

سلام

سبز گنبد کے مکیں، تجھ پر سلام — رحمۃٌ للعالمین! تجھ پر سلام
سربراہِ مُرسلاں، تجھ پر سلام — ہادیٔ ہر دو جہاں، تجھ پر سلام
عالمِ عشق و رضا، تجھ پر سلام — مظہرِ نورِ خدا، تجھ پر سلام
سیّد و بدرُ الدُّجیٰ تجھ پر سلام — سرور و شمس الضحیٰ تجھ پر سلام
مخزنِ جود و کرم! تجھ پر سلام — زینتِ لوح و قلم تجھ پر سلام
پیشوائے اہلِ دیں! تجھ پر سلام — اے شفیع المذنبیں تجھ پر سلام
رُوح و جانِ مدّعا، تجھ پر سلام — اے حبیبِ کبریا تجھ پر سلام
سرورِ دنیا و دیں، تجھ پر سلام — صادق الوعد و امیں، تجھ پر سلام
عدل کے نورِ مبیں، تجھ پر سلام — ساری دُنیا سے حسیں، تجھ پر سلام
مُحسنِ انسانیت، تجھ پر سلام — مشعلِ رُوحانیت، تجھ پر سلام

تجھ پہ اے ماہِ حرا لاکھوں سلام
تجھ پہ ختم الانبیاء لاکھوں سلام

فخرِ ابراہیم پر لاکھوں سلام — پیکرِ تسلیم پہ لاکھوں سلام
آمنہ کے لال پر لاکھوں سلام — صاحبِ اقبال پہ لاکھوں سلام
مصحفِ ایمان پہ لاکھوں سلام — صاحبِ قرآن پہ لاکھوں سلام
خُلق کی تنویر پہ لاکھوں سلام — فکر کی تطہیر پر لاکھوں سلام
طٰہٰ و یٰسین پر لاکھوں سلام — مرشدِ تزئین پر لاکھوں سلام
مغفرت کے تاج پر لاکھوں سلام — صاحبِ معراج پر لاکھوں سلام
مرکزِ وجدان پہ لاکھوں سلام — بے نظیر انسان پہ لاکھوں سلام
پرچمِ احسان پر لاکھوں سلام — فیض کے عنوان پہ لاکھوں سلام
مطلعِ انوار پر، لاکھوں سلام — اُسوۂ سرکار پر لاکھوں سلام

ہادیٔ اسلام پر لاکھوں سلام | مصطفےٰ کے نام پر لاکھوں سلام
نوُرِ تعلیمات پر لاکھوں سلام | طورِ الہامات پر لاکھوں سلام
معدنِ برکات پر لاکھوں سلام | خیر کی برسات پر لاکھوں سلام
بحرِ احساسات پر لاکھوں سلام | لوحِ مشہودات پر لاکھوں سلام
ذکر کے لمعات پر لاکھوں سلام | شکر کے سجدات پر لاکھوں سلام
انبیاء کے چاند پر لاکھوں سلام | اصفیاء کے چاند پر لاکھوں سلام
عَبدُہٗ کی شان پر لاکھوں سلام | عجز کی پہچان پر لاکھوں سلام

نکہتِ صلِّ علیٰ، لاکھوں سلام
ہے مظفرؔ کی نوا، لاکھوں سلام

میری دعا ہے کہ رضا بریلوی نے جس جذبِ محبّت سے یہ نعتیں کہی ہیں اور جس رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت میں سرشار ہو کر انھوں نے شعروں کے موتی پروئے ہیں، ان کے دربار میں یہ شرفِ قبولیت حاصل کریں۔ میں اپنی تمام تر گناہگاریوں اور سیہ کاریوں کے باوصف یہ سوچ رہا ہوں کہ ان کے ایک شعر سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی "سلام" لکھنے کی سعادت بخش کر میری نجات کا بہانہ پیدا کیا ہے۔

ع رحمتِ حق، بہانہ می جوید

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ

یَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّھِمِ

مولانا احمد رضا خان کی اُردو شاعری

از :- جناب ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان ایم اے، پی ایچ ڈی

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان علیہ الرحمۃ اپنے دَور کے بے مثل علماء میں شمار ہوتے ہیں ان کے فضل و کمال، ذہانت و فطانت، طباعی اور درّاکی کے سامنے بڑے بڑے علماء، فضلاء یونیورسٹیوں کے اساتذہ، محققین اور مستشرقین نظروں میں نہیں بچتے۔ مختصر یہ کہ وہ کون سا علم ہے جو انہیں نہیں آتا تھا۔ اور وہ کون سا فن ہے جس سے وہ واقف نہیں تھے؟ شعروادب میں بھی اُن کا لوہا ماننا پڑتا ہے اگر صرف محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال اور بیان و بدیع سے متعلق تمام الفاظ ان کی جملہ تصانیف سے یکجا کر لیے جائیں تو ایک ضخیم لُغت تیار ہو سکتی ہے۔

اعلیٰ حضرت چونکہ عالم متبحّر اور فاضل کامل و مکمل تھے اس لیے اُن کی شاعری میں بکثرت قرآنی آیات کے حوالے آتے ہیں۔ مثلاً :

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا ہے سایہ تجھ پر
بول بالا ہے تیرا، ذکر ہے اونچا تیرا

اَنْتَ فِيهِمْ نے عدو کو بھی لیا دامن میں
عیش جاوید مبارک تجھے شیدائی دوست

وہ خدا نے ہے مرتبہ تجھ کو دیا — نہ کسی کو ملے، نہ کسی کو ملا
کہ کلام مجید نے کھائی شہا — ترے شہر و کلام و بقا کی قسم

سَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى — حق نمودت چہ با سدا ریہا

لیلۃ القدر میں مطلع الفجر حق — مانگ کی استقامت پہ لاکھوں سلام
معنیٔ قد رأی مقصدِ ما طغیٰ — نرگسِ باغِ قدرت پہ لاکھوں سلام

قرآنی آیات کی طرح احادیثِ مبارکہ بھی بہت آتی ہیں۔ مثلاً:

ان کے قدم سے سلعۂ غالی ہوئی جناں — واللہ میرے گُل سے ہے جاہ و جلالِ گُل
نہ عرشِ ایمن نہ اِنِّی ذَاھِبٌ میں میہمانی ہے — نہ لطفِ اُدنُ یا احمد نصیب لن ترانی ہے
کھلے کیا رازِ محبوب و محب مستانِ غفلت کے — شرابِ قد رأی الحق زیبِ جامِ من رآنی ہے

اعلیٰ حضرت نے تلمیحات بھی بہت استعمال کی ہیں مثلاً ایک ہی غزل میں یہ تلمیحات ملاحظہ ہوں۔

بندہ ملنے کو قریب حضرت قادر گیا — لمعۂ باطن میں گمنے جلوۂ ظاہر گیا
تیری مرضی پا گیا سورج پھرا اُلٹے قدم — تیری انگلی اُٹھ گئی مہ کا کلیجا چر گیا

اعلیٰ حضرت کے تبحّر علمی کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ کوئی ایسی نعت لکھتے جو بے مثل ہوتی۔ چنانچہ ایک نعت انہوں نے صنعت ملمّع میں لکھی۔ دراصل ملمّع اس صنعت کو کہتے ہیں کہ ایک مصرع یا ایک شعر عربی کا اور دوسرا مصرع یا دوسرا شعر فارسی کا ہو اس میں زیادہ سے زیادہ بیس۲۰ اشعار ہوا کرتے ہیں اس کی دو۲ قسمیں ہیں۔

۱۔ ملمّع مکشوف یعنی جب ایک مصرع عربی میں اور ایک فارسی میں اور
۲۔ ملمّع محجوب یعنی جب ایک شعر عربی میں ہو اور دوسرا فارسی میں۔ لیکن اعلیٰ حضرت نے ایسے ملمّع میں اشعار لکھے ہیں جس میں عربی، فارسی، ہندی (بھاشا) اور اُردو چار۴ زبانوں کے الفاظ ہیں:

لَمْ یَاْتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ مثل تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہ دوسرا جانا
اَلْبَحْرُ عَلَا وَالْمَوْجُ طَغٰی من بے کس و طوفاں ہوشربا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا... جانا

ان کی ایک غزل محاسبۂ نفس کے لیے ہے اور ایسی مُرصّع ہے کہ جدید اُردو

شاعری بھی اس پر ناز کرے گی اس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

سُونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے

سونے والو، جاگتے رہیو، چوروں کی رکھوالی ہے

آنکھ سے کاجل صاف اُڑا لیں یاں وہ چور بلا کے ہیں

تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے

یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھے گا

ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کیسی متوالی ہے

پھر ایک قصیدہ مرصّعہ بھی ہے جس کے ہر پہلے مصرع کے آخر میں بالترتیب حروفِ تہجّی آتے ہیں۔ مطلع یہ ہے ؎

کعبے کے بدر الدجیٰ تم پہ کروڑوں درود | طیبہ کے شمس الضحیٰ تم پہ کروڑوں درود

اعلیٰ حضرت کے شعری محاسن میں زبان و بیان کی بکثرت خصوصیات ہیں۔ پورے مجموعۂ کلام میں تجنیسِ مماثل، تجنیسِ مستوفی، تجنیسِ زائد وغیرہ کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں کہ اعلیٰ حضرت الفاظ کی تکرار سے بات میں بات پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً ؎

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا | نہیں، سُنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

تو ہے سایہ نور کا، ہر عضو ٹکڑا نُور کا | سایہ کا سایہ نہ ہوتا ہے نہ سایہ نُور کا

جو گدا دیکھو لیے جاتا ہے توڑا نُور کا | نُور کی سرکار ہے کیا اس میں توڑا نُور کا

اس میں زم زم ہے کہ تھم تھم اس میں جم جم ہے کہ بیش

کثرتِ کوثر میں زم زم کی طرح کم کم نہیں

جنّت ہے ان کے جلوے سے جو پائے رنگ و بُو

اے گل ہمارے گل سے ہے گل کو سوالِ گل

اشتقاق شبہِ اشتقاق تجنیسِ مطرّف، تجنیس محرّف وغیرہ کی بھی بکثرت مثالیں ہیں ؎

یہ کتاب کُن میں آیا طرفہ آیہ نُور کا — غیر قائل کچھ نہ سمجھا کوئی معنی نُور کا

ابنِ زہرا سے ترے دل میں ہیں یہ زہر بھرے — بل بے او منکر بے پاک یہ زہرا تیرا

لفظ خاک کی رعایت سے کتنے مضامین تیار کئے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

ہم خاک ہیں اور خاک ہی ماوا ہے ہمارا — خاکی تو وہ آدم جدِ اعلیٰ ہے ہمارا

اللہ ہمیں خاک کرے اپنی طلب میں — یہ خاک تو سرکار سے تمغا ہے ہمارا

جس خاک پہ رکھتے تھے قدم سیّدِ عالم — اس خاک پہ قرباں دلِ شیدا ہے ہمارا

حُسنِ تعلیل کی بڑی نادر مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً

نہ ہو آقا کو سجدہ، آدم و یوسف کو سجدہ ہو

مگر سدِّ ذرائع داب ہے اپنی شریعت کا

مہر کس مُنہ سے جلوہ داری جاناں کرتا

سایہ کے نام سے بیزار ہے یکتائی دوست

لف و نشر کی عمدہ مثالیں بھی پائی جاتی ہیں۔ مثلاً ؎

دل بستہ، بے قرار، جگر چاک، اشکبار — غنچہ ہوں، گل ہوں، برقِ تپاں ہوں، سحاب ہوں

۱ ۲ ۳ ۴ — ۱ ۲ ۳ ۴

دندان و لب و زُلف و رُخِ شہ کے فدائی — ہیں دُرِّ عدن، لعلِ یمن، مشکِ ختن، پھول

۱ ۲ ۳ ۴ — ۱ ۲ ۳ ۴

آپ نے اس کثرت سے محاورات اور استعارات استعمال کئے ہیں کہ ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک لُغت تیار ہو سکتی ہے۔ قصیدے کے کچھ اشعار میں کتنے محاورات ہیں۔

دھارے چلتے ہیں عطا کے وہ ہے قطرہ تیرا

تارے کھلتے ہیں سخا کے وہ ہے ذرّہ تیرا

اغنیاء پلتے ہیں در سے وہ ہے باڑا تیرا

اصفیاء چلتے ہیں سر سے وہ ہے رستہ تیرا

اعلیٰ حضرت کا کلام سرمایۂ ایمان

از سید شان الحق حقی

۷۸۶
۹۲

شفیق گرامی جناب چشتی صاحب!

تسلیمات

میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کے کئی خطوط کے جواب دبائے بیٹھا رہا۔ اس سلسلے میں کچھ داخلی معذوریاں بھی تھیں۔ ایک خاصے ہنگامہ خیز دور سے گزرا ہوں۔ چاہتا تھا کہ مولانا کے کلام کو از سرِ نو پڑھ کر، کچھ ایسی باتیں آپ کو لکھوں کہ آپ کے مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں واقعی مفید ہوں۔ اس کی توفیق نہ ہو سکی۔ زیادہ تاخیر کی گنجائش نہیں، حسبِ توفیق چند کلمات بطورِ تعمیلِ ارشاد ارسالِ خدمت ہیں۔ اس کے ساتھ دلی معذرت قبول فرمائیں کہ اتنے دن آپ کو منتظر رکھا۔ جزاکم اللہ جزا

آپ کا نیاز مند ——— شان الحق حقی

عشقِ رسول مسلمان کے لیے سرمایۂ حیات ہے، میں اسے توشۂ آخرت نہیں کہوں گا، کیونکہ عشق کو اجر سے کیا کام، البتہ یہ سچ ہے کہ عشقِ رسول دنیا میں بہت سے ذی صلاحیت لوگوں کے لیے جوہرِ اخلاق کی حفاظت کا ذریعہ بھی ہوتا ہے اور یہ بے شک آخرت میں بھی عقیدۂ اسلامی کے مطابق اجر و ثواب کا ضامن ہے۔

حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ عاشقانِ رسول میں ممتاز

مقام رکھتے تھے۔ ان کا خلوص و محبّت میں ڈوبا ہوا نعتیہ کلام نہ صرف ان کے جذبۂ صادق کا مظہر ہے بلکہ بہت سے مومنین کے لیے بھی گدازِ قلب حاصل کرنے اور اپنی ارادت کو مولانا کی خوش مقالی کے سہارے ادا کرنے کا باعث ہوا اور ہوتا ہے۔ یہ خود مولانا کے لیے بھی بڑی سعادت ہے کہ اتنے عاشقانِ رسول ان کے دل سے نکلے ہوئے کلام کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر پڑھتے، سُنتے اور اس پر وجد کرتے ہیں۔ اس حیثیت سے اس کا ادبی پایہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے۔ بہترین ادبی تخلیقات وہی ہیں جو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے روحانی سرور اور اخلاقی بصیرت کا ذریعہ ہوں۔ میرے نزدیک مولانا کا نعتیہ کلام ادبی تنقید سے مبّرا ہے۔ اس پر کسی ادبی تنقید کی ضرورت نہیں۔ اس کی مقبولیّت اور دلپذیری ہی اُس کا سب سے بڑا ادبی کمال اور مولانا کے شاعرانہ مرتبہ پر دال ہے ؎

حُسنِ تاثیر کو صورت سے نہ معنی سے غرض
شعر وہ ہے کہ لگے جھوم کے گانے کوئی شخص

انھوں نے جو کچھ کہا ہے اپنے فطری جذبے سے کہا ہے، کوئی شاعرانہ ناموری مقصود نہ تھی۔ چنانچہ ان کے قدرشناس اور ارادت مند ان کو شاعر کی حیثیت سے کم، اہلِ دل اور اہلِ اللہ کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں۔

میں جناب محمد مرید احمد چشتی صاحب کے اس مقالے کا بڑے اشتیاق سے منتظر رہوں گا جو وہ مولانا کی سیرت و شخصیّت اور فضائل و کمالات پر تیار کر رہے ہیں۔ مَیں ان کے استقلال اور لگن کا دل سے معترف ہوں، کسی تحقیقی کام کے لیے یہی شرطِ اوّل ہے۔ وہ ایک مخلص اور محنتی انسان ہیں۔ ان کی یہ تالیف ایک بڑا علمی کارنامہ ہوگا۔

رحمۃ اللہ علیہ

جہادِ آزادی کا قائد احمد رضا خان (بریلی)

از جناب حافظ بشیر احمد غازی آبادی

بریلی ہندوستان میں صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ (اب اترپردیش) کا ایک مشہور شہر ہے۔ اس شہر کے محلہ جسولی میں ۱۴ر جون ۱۸۵۶ء کو مولانا شاہ احمد رضا قادری کی ولادت ہوئی۔ جس گھرانے میں آپ کی پیدائش ہوئی وہ بریلی کا ایک ممتاز علمی گھرانہ تھا۔ لیکن مولانا کے وجودِ گرامی سے نہ صرف اس خاندان کو بلکہ بریلی کو وہ شہرت و عزت حاصل ہوئی جس کی وضاحت اربابِ فہم و بصیرت کے نزدیک مسلّم ہے۔

یہ ایک تاریخی المیہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں جب مسلمانوں کی آٹھ سو سالہ حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہو گیا اور لال قلعہ پر انگریزی سامراج کا نشان یونین جیک لہرا دیا گیا تو بھارت کے ہندو نے اس خود ساختہ احساس کمتری کو مٹانے کے لیے جو طویل عرصہ تک راج پاٹ کی محرومی کی وجہ سے ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی، جابر انگریز کا سہارا لے کر مسلمانوں کی جائیداد و املاک پر خوب ہاتھ صاف کیا، انگریزوں نے مسلمانوں پر حصولِ معاش کے دروازے بند کر دیے اور سود در سود کے قوانین رائج کیے۔ ہنود کی ذاتی پریشانیوں اور مالی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا اور ۱۸۹۰ء تک مسلمانوں کی اسی فیصد آبادی ہڑپ کر گئے۔ یہ تھا وہ تنگ و تاریک ماحول جس میں حضرت فاضل بریلوی نے ہوش سنبھالا۔ مسلمانانِ ہند عجیب ذہنی کش مکش میں مبتلا تھے۔ مغربی تہذیب کا طوفان امنڈا چلا آ رہا تھا اور انگریز ان کے جذبۂ جہاد سے خائف تھا۔

اس نازک دور میں جن علمائے اسلام نے مسلمانوں کی سیاسی اور دینی راہنمائی

کا مقدس فرض انجام دیا، ان میں حضرت فاضل بریلوی بھی شامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ ملک و ملت کے ہر بہی خواہ کا طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔ اس دور میں بھی یہی ہوا۔ اکثر و بیشتر علماء نے فرنگی استبداد کو چیلنج کیا اور اعلائے کلمۃ اللہ کی تعزیر میں دار و رسن پر چڑھ کر جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔ کچھ نے غیر ملکی سامراج کو للکارنے کی پاداش میں کال کوٹھڑیوں میں سرائے موت کے قیدیوں کے لباس میں شب و روز بسر کئے اور کئی ایک اسلام اور مسلمانوں کی محبت کے جرم میں کالا پانی بھیج دیئے گئے۔

ان حالات میں مولانا شاہ احمد رضا نے مسلمانانِ ہند میں عشقِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پھونکی۔ ان کی رائے میں اینگلو ہندو سازش سے نجات پانے کا راستہ یہی تھا کہ مسلمان قلب و ذہن کی تمام تر توجہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر مرکوز کر دیں۔ تاکہ اسلام کے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود امتِ محمدیہ کی روحانیت اور للہیت باقی رہ سکے۔ ان کا اس عقیدہ پر پختہ ایمان تھا کہ فرزندانِ توحید کا اگر حقیقی تعلق گنبدِ خضریٰ سے قائم رہے تو تاجدارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل کمال، رحمت و جمال اور عظمت و جلال کے صدقہ میں مسلمانوں کا کوئی طاقت کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ فرماتے تھے کہ سفینۂ ملت کو حوادث سے محفوظ رکھنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنے دل میں محبوبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پیدا کرے اور خلوصِ قلب سے قرآنِ حکیم اور احادیثِ مقدسہ پر عمل کرے۔

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہر قائد کا ایک مشن ہوتا ہے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ذریعے اور راستے بھی مختلف ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب نے اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مدحت مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔ انگریزوں کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ مسلمان میرِ حجاز (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سالارِ کارواں سمجھنا بند کر دیں۔ اور ان کا

تعلق مدینۃ النبی صلّی اللہ علیہ وسلم سے کم ہو جائے! حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے انگریز کی اس چالاکی کو سمجھا اور نعرہ لگایا کہ ؎

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

بات دل سے نکلی تھی، اثر کر گئی، آج برِصغیر پاک و ہند میں ایک بھی مسلمان ایسا نہیں ملے گا جو اس نعرۂ رسالت سے ناواقف ہو! یہ دعویٰ بالکل حقائق پر مبنی ہے کہ عصرِ جدید میں ان جیسا عاشقِ شہنشاہِ کونین پیدا نہیں ہوا۔ جہاں تک علمی حیثیت کا تعلق ہے آپ کی مشہور تالیف فتاویٰ رضویہ اور قرآنِ حکیم کا ترجمہ آپ کے علم و فضل کا روشن اور واضح ثبوت ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ حضرت فاضلِ بریلوی نے نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں شریعت کی احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا، یہ سراسر غلط فہمی ہے جس کا حقائق سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ ہم اس غلط فہمی کی صحت کے لیے آپ کی ایک نعت نقل کرتے ہیں۔

فرماتے ہیں ؎

سرور کہوں کہ مالک و مولا کہوں تجھے
باغِ خلیل کا گُلِ زیبا کہوں تجھے

حرماں نصیب ہوں تجھے اُمید گہ کہوں
جانِ مراد و کانِ تمنا کہوں تجھے

مجرم ہوں اپنے عفو کا ساماں کروں شہا
یعنی شفیع روزِ جزا کا کہوں تجھے

اس مردہ دل کو مژدہ حیاتِ ابد کا دوں
تاب و توانِ جانِ مسیحا کہوں تجھے

کہہ لے گی سب کچھ انکے ثنا خواں کی خامشی
چپ ہو رہا ہے کہہ کے میں کیا کیا کہوں تجھے

لیکن رضاؔ نے ختمِ سخن اس پہ کر دیا
خالق کا بندہ، خلق کا آقا کہوں تجھے

"بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" کی کیسی فصیح و بلیغ تائید ہے۔ جتنی بار پڑھئے "خالق کا بندہ، خلق کا آقا کہوں تجھے"، دل ایمانی کیفیت سے سرشار ہوتا جائے گا۔ بے شک جس کے لیے یہ زمین و آسمان پیدا کئے گئے۔ جو خدا کا محبوب ہے۔ جسے خدا تعالیٰ نے معراج کی عظمت سے نوازا۔ جو شافعِ محشر ہے۔ وہ دُرِّ یتیم عبداللہ،

وہ آمنہ کا لال، وہ ساقیٔ کوثر، وہ خاتم الانبیاء اور خیر البشر، وہ شہنشاہِ کونین، وہ سردارِ کون و مکان، وہ تاجدارِ دو عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) جس کا سایہ نہ تھا۔ اس کا ثانی ہو ہی نہیں سکتا۔ بے شک وہ خالق کا بندہ ہے اور خلق کا آقا ہے۔ اس پہ لاکھوں درود اور سلام جس کے وجودِ گرامی سے انسانیت کو عظمت حاصل ہوئی۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ ۱۹۲۱ء میں حضرت فاضل بریلوی نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ جن لوگوں کو سیاست سے دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ ۱۹۲۱ء تک مسلمانوں کی کوئی خاص علیحدہ سیاسی تنظیم نہ تھی اور مسلمانوں کے بہت بڑے بڑے لیڈر اور مخلص رہنما جن میں ممتاز علمائے اسلام کے علاوہ رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی جوہر، سید الاحرار مولانا حسرت موہانی، خادمِ کعبہ مولانا شوکت علی اور ایسے ہی اکثر جلیل القدر اکابر اسلام خلافت اور اسی قسم کی دوسری تحریکوں میں برادرانِ وطن کو ساتھ لے کر انگریز سے جہاد کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ غیر مخلص تو ان مایہ ناز ہستیوں کو نہیں کہا جا سکتا۔ رائے سے اختلاف ہو سکتا ہے اور وہ ہوا۔ حضرت مولانا شاہ احمد رضا قدس سرہٗ نے اعلان کیا کہ مشرکین سے معاہدہ، موالات اور ان کی استعانت یہ سب باتیں شریعت کے خلاف ہیں۔ یعنی ہندوؤں سے سیاسی اتحاد مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہے۔ یہ ایسا زمانہ تھا جب انگریز سے نفرت ہندو مسلمانوں کے قلوب میں اپنے شباب پر تھی لہٰذا یہ آواز اس وقت اتنی مؤثر ثابت نہیں ہو سکی، جس کی مستحق تھی۔ اس زمانے میں سیاسی حالات نے کچھ ایسا رُخ اختیار کر لیا تھا کہ جو آواز بھی ہندو مسلم میں امتیاز کے لیے اُٹھائی جاتی تھی، اس کو عوام نہیں، اچھے اچھے خواص غیر ملکی جابر حکومت کی حمایت کی تائید قرار دیتے تھے۔ اور یہ باور کر لیا جاتا تھا کہ نکتہ چینی کرنے والا شخص ہندوستان سے انگریزوں کے نکالنے کے راستے میں سنگِ راہ ہے۔ یہ بدگمانی اس قدر عام تھی کہ جس کا آج تصور بھی ممکن نہیں ہے۔

بہرحال جوں جوں وقت گزرتا چلا گیا یہ حقیقت عیاں ہوتی چلی گئی کہ بھارتی ہنود ہرگز اشتراک کے مستحق نہ تھے۔ اور روزِ روشن کی طرح نمایاں حقیقت کو انہوں نے

بھی تسلیم کر لیا جن کے اشتراک سے ہندو لیڈروں کی آواز مؤثر ہوئی۔ مثال کے طور پر قائدِ اعظم محمد علی جناح جن کو ہندو مسلم اتحاد کا پیامبر کہا جاتا تھا اور بمبئی میں جناح ہال جن کی خدمات کے صلے میں تعمیر کرایا گیا اور حکیم الامت علامہ اقبال جنھوں نے

ع سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا

کہہ کر "حبِ وطن" کی ایک انوکھی مثال قائم کی تھی۔ بعد میں قائدِ اعظم نے یہ مطالبہ تسلیم کرایا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور پاکستان کے بانی کا اعزاز حاصل کیا۔ اور علامہ اقبال مفکرِ پاکستان ہوئے۔

خلاصہ یہ کہ مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بھی انہی بزرگوں میں سرِ فہرست ہیں جنھوں نے ہندو سے اشتراک کو مسلمانوں کے لیے مہلک قرار دیا اور ان لوگوں کی کھُلی مخالفت کی، جو ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے لگاتے تھے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ یہ اختلاف ہرگز ذاتی نہ تھا۔ بلکہ سرکارِ دو عالم (صلے اللہ علیہ وسلم) کی اس حدیث کے مطابق تھا کہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من احب للّٰہِ وابغض لِلّٰہِ واعطی لِلّٰہ ومَنَعَ لِلّٰہِ فقدِ استکمَلَ الایمان (بخاری ابوامامہ)

ترجمہ: حضور صلیّ اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس نے اللہ کے لیے دوستی کی اور اللہ کے لیے دشمنی کی اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے روک رکھا۔ اُس نے اپنے ایمان کو مکمل کیا۔

یعنی پورے مومن کی تعریف یہ ہے کہ نہ وہ کسی سے ذاتی دشمنی کرتا ہے، نہ کسی کو مطلب نکالنے کے لیے دوست بناتا ہے وہ تو حصولِ رضائے الٰہی کے لیے ہی دوستی کرتا ہے اور خوشنودیِ رب کی خاطر ہی دشمنی کرتا ہے اگر کسی کی مدد کرتا ہے تو اس کا اجر بھی اللہ ہی سے چاہتا ہے۔

(بشکریہ جنگ کراچی)

مولانا احمد رضا خان بریلوی کی شاعری

از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

شاعری، خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو، شاعر سے جذبے کی شدّت اور پاکیزگی کا مطالبہ کرتی ہے۔ جذبے کی شدّت اور پاکیزگی سے مراد یہ ہے کہ شاعر اپنے موضوع سے مخلص ہو، گہرا لگاؤ رکھتا ہو اور اپنی لگن میں سچا ہو۔ اس سچائی اور لگن کو غالبؔ نے "دل گرفتہ" کا نام دیا ہے۔ اقبالؔ نے خونِ جگر کہا ہے اور بعض نے شاعر کے خلوص سے تعبیر کیا ہے۔ جس نسبت سے شاعر کے جذبات سچے، ملتہب اور گہرے ہوں گے۔ اسی نسبت سے اس کی شاعری سچّی، مؤثر اور گہری ہوگی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جذباتی صداقت کے بغیر محض منطقی یا علمی صداقت کے زور پر اعلیٰ درجے کی شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ کسی شخص کا علمی تبحّر، اس کا تامّل و تفکّر اور مشاہدہ و مطالعہ ممکن ہے بلند پایہ تصنیف و تالیف کے لیے مددگار ثابت ہو لیکن تخلیقِ شعر میں معاون نہیں ہو سکتا۔ خاص طور پر نعتیہ شاعری علم و فکر کے ساتھ ساتھ شاعر کے جذباتِ محبّت کا ایسا ارتعاش و التہاب چاہتی ہے جو مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی طرح اس بات پر والہانہ یقین رکھتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کی ذاتِ گرامی کائنات میں بے مثال ہے۔ نہ ماضی میں اس کی مثال نظر آتی ہے نہ حال میں اور نہ مستقبل میں اس کی مثال کا امکان ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب تک کوئی شاعر پورے وثوق، مکمل یقین اور پوری شدّتِ جذبات کے ساتھ یہ عقیدہ نہ رکھتا ہو

لَمْ یَاْتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ، مثلِ تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سوہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا

اور جب تک اس عقیدے پر عامل نہ ہو اس وقت تک نہ تو کوئی شاعر صفِ اوّل کا نعت گو شاعر کہلایا جا سکتا ہے نہ اس کی نعتیہ شاعری دوسروں کو مسحور و متاثر کر سکتی ہے اور نہ اس میں وہ شگفتگی و دلآویزی پیدا ہو سکتی ہے جو مندرجہ بالا شعر میں نظر آتی ہے۔ اس شعر میں یا اس نعت کے دوسرے اشعار میں جو اثر آفرینی اور دل کشی ہے وہ صرف اس سبب سے نہیں کہ اس میں مولانا احمد رضا خان بریلوی نے غیر معمولی قادر الکلامی کا ثبوت دیا ہے اور ہر شعر میں عربی، فارسی، اُردو اور پوربی کی فنکارانہ پیوندکاری سے ادب کے قارئین کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔ زبان و بیان کے سلسلے میں اس نوع کی قادر الکلامی دوسرے شعراء کے یہاں بھی ملتی ہے بلکہ اُردو شاعری کی تاریخ میں الفاظ کی شعبدہ گری صنائعِ لفظی میں کمال دکھانے والے شاعر بہت سے ہیں۔ لیکن صاحب نقد و نظر خوب واقف ہیں کہ محض کمالاتِ لفظی کی بنا پر انہیں بڑا شاعر تسلیم نہیں کیا گیا۔ میرؔ و سوداؔ، آتشؔ و ناسخؔ، ذوقؔ و غالبؔ، امیرؔ و داغؔ اور میر حسنؔ و دیا شنکر نسیمؔ کے نام ہماری تاریخ میں ساتھ ساتھ لئے جاتے ہیں ان تقابلی مطالعات پر درجنوں مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ طلبہ سے لے کر اساتذہ تک ان کی شاعرانہ خصوصیات کا موازنہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن کوئی صاحب ذوق اور انصاف پسند ناقد سوداؔ کو میرؔ پر، ناسخؔ کو آتشؔ پر، ذوقؔ کو غالبؔ پر، امیرؔ کو داغؔ پر اور نسیمؔ کو میر حسنؔ پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ حالانکہ زبان دانی اور لفظی صناعی کے جتنے کرتب سوداؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، امیرؔ اور نسیمؔ کے یہاں دکھائے گئے ہیں۔ میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، داغؔ اور میر حسنؔ کے یہاں نظر نہیں آتے۔ یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ شاعری کا حقیقی تعلق الفاظ و تراکیب سے نہیں۔ جذبات و محسوسات کی سچائی اور گہرائی سے ہے۔ چنانچہ مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی مذکورہ بالا نعت میں بھی جو دل نشینی و دل آویزی

اور لطافت و پاکیزگی ہے اور اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے بے پناہ محبّت کا صاف و شفّاف چشمہ اس کی تحت میں بہہ رہا ہے۔ مستی اور والہانہ پن کا ایک آبشار ہے جس کی طراوت، خنکی اور مٹھاس سے اہلِ دل سیراب ہو رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور یہ نعت محض لفظی صنّاعی کا ایک نمونہ ہوتی تو ہرگز زبان زد خلائق نہ ہوتی۔ اس کی مقبولیّت حلقۂ خواص سے نکل کر عوام تک نہ پہنچتی اور اس کے اشعار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے سوا کوئی اور لطف نہ لے سکتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کوئی شخص اس کے الفاظ کو پوری طرح سمجھتا ہو یا نہ سمجھتا ہو اس میں جذبات کی ایسی شدّت، ایسی صداقت اور ایسی گہرائی ہے کہ سننے اور پڑھنے والوں کے دل خود بخود اس طرف کھنچتے ہیں اور جب کبھی کسی محفل یا جلسے میں یہ نعت خاص لحن سے پڑھی جاتی ہے، سامعین خواہ ان کی علمی و ادبی سطح کچھ بھی ہو وجد میں آجاتے ہیں۔ جھوم جھوم اُٹھتے ہیں اور خود کو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ دل کشی و اثر پذیری کا جادو اس نعت سے حضرت احمد رضا بریلوی کی جذباتی صداقت نے جگایا ہے ورنہ سچ بات یہ ہے کہ انہیں مختلف زبانوں کی پیوند کاری اور الفاظ و تراکیب کا شعبدہ دکھانا مقصود نہ تھا۔ ایک فطری اور خلاّق شاعر کی حیثیت سے وہ پوری طرح محسوس کرتے تھے اور ایک باشعور ناقد کی طرح خوب جانتے تھے کہ اعلیٰ درجے کی شاعری الفاظ سے نہیں بلکہ دروں خانہ کے ہنگاموں یعنی شدید جذباتی تلاطم اور تموّج سے وجود میں آتی ہے۔ بات یہ ہے کہ شاعری ایک طرح کا شعوری عمل ہو کر بھی سراسر شعوری عمل نہیں ہے۔ شعر کہے نہیں جاتے، بنائے نہیں جاتے، شعر کے لیے الفاظ جوڑے نہیں جاتے، قافیے تلاش نہیں کئے جاتے، استعارات و کنایات اور تراکیب و محاورات دانستہ تراشے نہیں جاتے بلکہ شعر اپنے پورے وجود کے ساتھ خود بخود ذہنِ شاعر پر نازل ہوتا ہے۔ دُنیا کے ہر بڑے اور حقیقی شاعر نے شعر گوئی کے سلسلے میں یہی کہا ہے اور حضرت رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری بھی اس خاص معیار پر پوری اُترتی ہے۔

ہر چند کہ جس نعت خاص کا ذکر اس جگہ کیا گیا وہ احباب کی فرمائش پر کہی گئی ہے اور جیسا کہ اس نعت کے مقطع میں ہے ؎

بس خامۂ خام نوائے رضاؔ نہ یہ طرز مری نہ یہ رنگ مرا
ارشاد احبّا ناطق تھا ناچار اس راہ پڑا جانا

مولانا احمد رضا خان بریلوی نے خود واضح کر دیا ہے نہ تو ان کا یہ رنگِ سخن تھا اور نہ اس طرزِ شاعری سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت تھی۔ صرف احباب کے حکم کی تعمیل میں انہوں نے ایسا کیا اور اپنی غیر معمولی قادر الکلامی کا لوہا منوایا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کی نعتیہ شاعری بنیادی طور پر فلسفیانہ موشگافیوں یا علم وفن کے بھول بھلیوں کی شاعری نہیں بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات سے گہری وابستگی اور شدید جذباتی لگاؤ کی شاعری ہے۔ ان کی نعتیہ شاعری پر معصومیت، شیفتگی، سادگی اور عاشقانہ سرمستی کی جو چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور یہ چاندنی قاری کے درونِ خانہ میں جس قسم کا مدّو جزر پیش کرتی ہے وہ بے سبب نہیں ہے۔ جذبات اپنے اظہار وابلاغ میں کسی خاص قسم کی لغات تراکیب اور استعارات کا سہارا نہیں لیتے بلکہ فطری انداز میں روزمرّہ کی زبان میں انتہائی سادگی سے خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں۔ حقیقی جذبہ، خواہ اس کا تعلق محبت سے ہو یا نفرت سے، خوف سے ہو یا جستجو سے، غم سے متعلق ہو یا خوشی سے، مصنوعی سہاروں کا محتاج نہیں ہوتا۔ اپنے نمود واظہار کی راہ خود پیدا کر لیتا ہے بلکہ بعض اوقات تو جذبے کے اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آدمی کے چہرے بشرے، رفتار، حرکات وسکنات اور نشست وبرخاست سے جذبات خود بخود نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس لیے گہرے اور سچے جذبات کی عشقیہ شاعری خواہ اس کا تعلق مجاز سے ہو یا حقیقت سے، اپنی تفہیم وترسیل سے کسی لغت یا شرح کی محتاج نہیں ہوتی بلکہ خود بخود عام وخواص ہر قسم کے قاری اور سامع کے ذہن وقلب میں اُتر جاتی ہے۔ مجازی سطح پر اُردو شاعری کی تاریخ میں میر تقی میرؔ کی عشقیہ شاعری اس کی ایک واضح مثال

ہے۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور نعت گوئی کے حوالے سے یہی صورت مولانا احمد رضا خان بریلوی کی شاعری کی ہے۔ جس طرح ان کے جسم کا رُواں رُواں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے سرشار ہے، اسی طرح ان کی نعتیہ شاعری کا ایک ایک لفظ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں ڈوبا ہوا ہے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گہرے جذباتی لگاؤ کا مظہر ہے۔ اس لیے حضرت رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری جتنی زیادہ سادہ ہے، اتنی ہی زیادہ پُرکار ہے اور اپنے قاری اور سامع کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی خود عاشقانِ رسول میں سے تھے۔ انہوں نے اچھے شعر کے متعلق حکم لگایا ہے کہ ؎

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
دل میں سُنتے ہی جو اُتر جائیں

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی نعتیہ شاعری اس معیار پر پوری اُترتی ہے کہ جو شخص ان کے اشعار سُنتا ہے سر دُھنتا ہے اور جو ایسا نہیں کرتا وہ اپنے ذوقِ سخن کا مذاق اڑواتا ہے۔

عاشقانہ جذبات کے اظہار میں سادگی اور پاکیزگی کا جو رچاؤ شروع سے آخر تک حضرت رضا بریلوی کے مجموعہ نعت حدائقِ بخشش میں نظر آتا ہے، وہ اُردو کے دوسرے نعت گو شعراء کے یہاں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ ان کے یہاں غزل کے پیرائے میں لمبی لمبی نعتیں ملتی ہیں اور بعض نعتوں میں بڑی مشکل زمینوں اور ردیفوں میں طبع آزمائی کی گئی ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا تیز دھارا سنگلاخ زمینوں کو چیرتا ہوا اس طرح گزر گیا ہے کہ شادابی و زرخیزی کے جو آثار مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی کی ان نعتوں میں پیدا ہو گئے ہیں وہ دوسروں کے ہاں نرم اور ہموار زمینوں میں بھی نظر نہیں آتے۔ میری مراد ایسی نعتوں سے ہے جن میں بعض کے مطلعے اس انداز کے ہیں کہ ؎

سرتا بقدم ہے تنِ سلطانِ زمن پھول
لب پھول، دہن پھول، ذقن پھول، بدن پھول

عارضِ شمس و قمر سے بھی ہیں انور ایڑیاں
عرش کی آنکھوں کے تارے ہیں وہ خوشتر ایڑیاں

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

یادِ وطن ستم کیا دشتِ حرم سے لائی کیوں
بیٹھے بٹھائے بدنصیب سر پہ بلا اُٹھائی کیوں

ہے لبِ عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

ان زمینوں میں اچھے شعر کہنا وہ بھی نعت میں جس میں قدم اٹھانا بقول عرفی تلوار کی دھار پر چلنا ہے ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جسے توفیقِ الٰہی میسر ہو اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سرشاری و سرمستی کے ساتھ زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت بھی رکھتا ہو۔ برصغیر پاک و ہند کے علمائے دین میں بڑے بڑے صاحبِ علم و دانش اور علوم دینی و دنیوی کے فاضل گزرے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک معتبر و متبحر عالم و فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ صفِ اوّل کا شاعر بھی ہو یا جس نے نعت گوئی میں کوئی ممتاز مقام پیدا کیا ہو اس اعتبار سے مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت بالکل منفرد اور یکتا ہے۔ وہ برِصغیر کے ایک ایسے جیّد عالم ہیں جن کا حلقہ اثر دوسرے علماء کے مقابلے میں سب سے بڑا ہے اور ایک ایسے نعت گو شاعر ہیں جن کی نعتیں نہ صرف یہ کہ سب سے زیادہ مقبول ہیں بلکہ ان کی شاعری اس پایہ کی ہے کہ ان کا نام صرف اُردو کے ممتاز ترین شاعروں کے نام کے ساتھ لیا جانا چاہیئے۔

جہاں تک خالص نعتیہ شاعری کا تعلّق ہے اُردو میں جو قبولِ عام مولانا احمد رضا

خان صاحب بریلوی کی شاعری کو ملا کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ ان کے ہمعصروں میں محسنؔ کاکوروی کا نام یقیناً ایسا ہے جن کا معیارِ نعت گوئی کم و بیش وہی ہے جو رضاؔ بریلوی کی نعتوں کا ہے۔ لیکن محسنؔ کاکوروی کے مجموعۂ نعت میں سے صرف ایک قصیدہ لامیہ اور ایک مثنوی ابرِ کرم ہی کو مقبولیت حاصل ہو سکی۔ ان نظموں سے بھی صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہی متعارف ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں زبان و بیان کے سلسلے میں علامات و استعارات کا جو اہتمام اور معیار پیشِ نظر رکھا گیا ہے اس سے خاص خاص لوگ ہی لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس حضرت رضاؔ بریلوی کی نعتیں اپنی مخصوص سادگی و پرکاری کے سبب عام و خاص میں یکساں مقبول ہیں۔ ہمارے ہاں ان کی نعتیں مخصوص محفلوں سے لے کر سیرت النبی کے عام جلسوں تک بڑے ذوق و شوق سے پڑھی اور سنی جاتی ہیں شاید ہی کوئی ایسا باذوق مسلمان ہوگا جسے حضرت رضاؔ بریلوی کے مندرجہ نعتوں کے دو چار شعر نہ یاد ہوں ؎

واہ کیا جود و کرم ہے شہِ بطحا تیرا
نہیں سنتا ہی نہیں مانگنے والا تیرا

لَمْ یَاْتِ نَظِیْرُکَ فِیْ نَظَرٍ مثلِ تو نہ شد پیدا جانا
جگ راج کو تاج تورے سر سو ہے تجھ کو شہِ دوسرا جانا

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

حاجیو! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے، کعبے کا کعبہ دیکھو

چمک تجھ سے پاتے ہیں سب پانے والے
مرا دل بھی چمکا دے چمکانے والے

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

نعتیہ غزلوں سے قطع نظر مولانا احمد رضا خاں صاحب کے سلام جس کا مطلع ہے ؎

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزم رسالت پہ لاکھوں سلام

کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اکبر وارثی میرٹھی کا سلام ؎

یا نبی سلام علیک | یا رسول سلام علیک
یا حبیب سلام علیک | صلوٰۃ اللہ علیک

بھی حد درجہ شہرت رکھتا ہے۔ عورت، مرد، بچے، جوان سبھی اسے بلند آواز پڑھنا پسند کرتے ہیں لیکن اس کے بعد اگر کسی سلام کو قبولِ عام کا درجہ ملا ہے تو وہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کا سلام ہے۔ حفیظ جالندھری کے شاہنامے کا ایک ٹکڑا جس میں ولادتِ نبوی کا ذکر ہے اور ماہر القادری کی نظم "حدیثِ قدسی" جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجا گیا ہے، کو بھی خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بہت دنوں تک وہ ہر محفل اور ہر جلسے میں پڑھے گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ان کی مقبولیت کم ہوتی گئی۔ اب وہ کسی محفل میں شاذ ہی سننے میں آتے ہیں۔ اس کے برعکس مولانا احمد رضا خاں صاحب کا سلام اگرچہ ڈیڑھ سو سے زائد اشعار پر مشتمل ہے اور حفیظ جالندھری اور ماہر القادری کے سلاموں سے قدیم تر اور طویل تر ہے، پھر بھی آج تک بڑے اہتمام اور کثرت سے پڑھا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسکی مقبولیت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب ممتاز ترین نعت گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترین نعت گو شاعر بھی ہیں۔

مولانا احمد رضا خان بریلوی

از گوہر ملسیانی

۷۸۶

۱۶- نومبر ۱۹۷۷ء

محترمی مکرمی چشتی صاحب

السلام علیکم و رحمۃ اللہ — مزاج گرامی۔

سب سے پہلے تو اپنی مصروفیات اور علالت کی وجہ سے آپ کے مکتوب شریف اور آپ کے ارشاد کی تکمیل جلد نہ کر سکنے پر معذرت خواہ ہوں۔ حسب ارشاد مولانا رضا بریلوی کی نعت پر چند سطور تحریر کر رہا ہوں۔ رضا جیسے جیّد عالم و شاعر کے لیے اختصار نویسی ایک مشکل کام ہے۔ بہر حال آپ کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں اور اپنے تاثرات ارسال کر رہا ہوں۔ وصول ہونے پر مطلع فرمائیے، ممنون ہوں گا۔

احباب کی خدمت میں سلام مسنون۔ والسلام

احقر —— طفیل گوہر ملسیانی

حضرت رضا بریلوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں وہ متبحر عالم اور صاحب حال بزرگ تھے۔ ان کے نعتیہ کلام میں ان کی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت و شیفتگی کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ ذکر سرورِ کائنات پر وجد کی کیفیت محسوس کرنے

والے صاحبِ کیف انسان تھے۔ اُن کے نعتیہ کلام میں وجد آفرینی، والہانہ کیف و سرور اور عشقِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا سوز و گداز ملتا ہے۔ فلسفہ، منطق، حکمت اور علمِ ہیئت سے شغف تھا یہی وجہ ہے کہ اُن کی فکر مدحت کے مضامین کے انتخاب میں ایک خاص امتیاز کی حامل رہی ہے ؎

زمین و زماں تمہارے لیے، مکین و مکاں تمہارے لیے

چنین و چناں تمہارے لیے، بنے دو جہاں تمہارے لیے

محبِ صادق ہونے کی وجہ سے ان کے دل میں عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آگ شعلہ زن تھی جو اُن کے کلام میں سوز و گداز کے جذبات ابھارتی ہے۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جذبۂ عشق کی تڑپ اُن کے دل کو ہر وقت بے قرار رکھتی تھی۔ ان کے کلام میں یہ عشقیہ رنگ لعل و یاقوت کی طرح دمکتا ہے ؎

ٹپکتا رنگِ جنوں عشقِ شہ میں ہر گل سے

رگِ بہار کو نشتر رسیدہ ہونا تھا

رضا کی نعتوں میں عالمانہ رنگ ہے۔ وہ زبان و بیان کی نکتہ آفرینیوں اور باریک بینیوں سے واقف تھے ان کا کلام فصاحت و بلاغت کا مرقع ہے ؎

بڑھایہ سلسلہ رحمت کا دورِ زلف والا میں

تسلسل کالے کوسوں رہ گیا عصیاں کی ظلمت کا

وہ دینی علوم کے جامع ہونے کے علاوہ ایک حساس طبیعت سخن ور بھی تھے۔ ان کے قصیدہ سلامیہ کے اشعار کس شخص کی زبان پر نہ ہوں گے؟ وہ کون سا صاحبِ ذوق ہے جس نے انہیں سُن کر کیف و سرور محسوس نہ کیا ہو گا؟ ؎

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام　　شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

رضا کی نعت میں محاکات کے اتنے پُرکیف انداز ملتے ہیں کہ کسی دیگر نعت گو کے ہاں یہ پہلو کم ہی نظر آتا ہے۔ ان کے ہاں یہ رنگ اپنی پوری آن بان کے ساتھ ملتا ہے اور وہ اس مشکل مرحلے سے بآسانی گزر جاتے ہیں ؎

اُٹھی جو گردِ رہِ منور، وہ نور برسا کہ راستے بھر
گھرے تھے بادل، بھرے تھے جل تھل، امنڈ کے جنگل اُبل رہے تھے

ان کے اشعار میں صنائع بدائع اس شان سے در آتے ہیں کہ وہ اشعار بلیغ و جمیل بن جاتے ہیں۔ زبان اور طرزِ ادا کا لطف، الفاظ اور تراکیب کا دروبست آپ کے کلام میں دھیمی دھیمی موسیقی اور میٹھا میٹھا ترنم پیدا کرتا ہے ؎

ہراک دیوار و در پر مہر نے کی ہے جبیں سائی
نگارِ مسجدِ اقدس میں کب سونے کا پانی ہے

القصہ مولانا رضا بریلوی کا اندازِ بیان سب سے نرالا اور سادگی و پُرکاری کا نمونہ ہے۔ ان کے جذبۂ محبت میں خلوص و صداقت ہے۔

مجاہدِ ملّت اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی

ایک نابغۂ روزگار شخصیّت

از سیّد فیضی

اسلام آباد : ۱۹ر جولائی ۱۹۷۸ء

مکرمی محمد مرید احمد چشتی صاحب

سلام مسنون !

جناب سید فیضی کے نام آپ کا مکتوب موصول ہوا۔ سید فیضی صاحب نے آپ کی خواہش کے مطابق حضرت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی کی شخصیت پر مضمون تحریر کر دیا ہے۔ چونکہ سید صاحب دفتر کے بعض ضروری امور میں مصروف تھے اس لیے میں ہی آپ کو جواب دے رہا ہوں۔ مضمون موصول ہونے پر مطلع فرمائیں۔

والسّلام

آپ کا مخلص : محمد نواز رضا

آج سے سوا سو برس پہلے روہیلکھنڈ کے غیور و جسور خاندان کے ایک معزز فرد جناب مولانا خان نقی علی خان رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس کی چمکتی دمکتی پیشانی دیکھ کر لوگوں نے کہا کہ یہ بچہ بڑا ہو کر عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت بنے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت مولانا نقی علی خاں نے اپنے اس شہزادے کو جو آگے چل کر اعلیٰ حضرت شاہ احمد رضا خان بریلوی کے نام سے مشہور ہوا، نہایت اعلیٰ پیمانے پر علوم دینی کی تعلیم دی۔ ابھی تیرہ سال پورے

ہوئے تھے کہ تمام علوم میں مہارت حاصل کرلی۔ اور اس صغرسنی میں مسند افتاء پر متمکن ہوکر فتویٰ دینے لگے۔

کہتے ہیں مسند افتاء پر بیٹھنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایک مفتی کو جس حزم و احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے وہ اہلِ علم ہی جانتے ہیں۔ پھر ایک صغرسن بچے سے تو ہر آن تحریر فتویٰ میں غلطی کا امکان ہوسکتا ہے۔ لیکن آپ ذرا ان کے فتاویٰ کو پڑھ کر دیکھیئے، ان میں استفتاؤں کو ایسے خوش اسلوب پیراؤں میں جواب کا جامہ پہنایا گیا ہے کہ بڑے بڑے اہلِ علم و پختہ کارانِ دانش ان کے تبحرِ علمی کے قائل نظر آتے ہیں۔ علمائے عرب نے بھی آپ کی فقیہی و مفتیانہ صلاحیتوں کی بے حد تعریف و توصیف کی ہے۔

آپ کی ذات گرامی کے متعلق یہ معلوم کرکے کہ بیک وقت چھپن علوم میں آپ یدِ طولیٰ رکھتے تھے، انسان ورطۂ حیرت میں گم ہوجاتا ہے۔ آپ کو رب العزت نے ایسی طبع رسا دی تھی کہ مشکل سے مشکل مسائل کو آنِ واحد میں حل کر دیتے تھے۔ ریاضی میں آپ امام العصر تھے۔ اس سے متعلق کوئی مسئلہ آپ سے پوچھا جاتا تو آپ اشاروں ہی اشاروں میں اس کا تسلی بخش جواب دے دیا کرتے تھے۔ اس پر لوگوں کے استعجاب کی کوئی حد نہ رہتی۔

بارھویں صدی ہجری میں نجدیوں کے امام و پیشوا محمد بن عبدالوہاب نجدی کے خیالات کا جب برِصغیر پاک و ہند میں پرچار ہوا تو بہت سے لوگ اس کے خیالات و عقائد سے متاثر ہوئے اور انہوں نے ایسی کتابیں تصنیف کرنا شروع کر دیں جن سے مسلمانوں کے عام عقائد کی توہین ہوتی تھی۔

اعلیٰ حضرت نے ان گستاخانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منہ بند کرنے کے لیے ان کے عقائد باطلہ کی پوری شدت کے ساتھ تکذیب کی اور اپنی دلآویز شاعری کے ذریعے انہیں مقامِ مصطفےٰ سے آشنا کراتے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اعلیٰ حضرت کے سینے میں محبت آشنا دل تھا اور ان کی محبت کا مرکز حضرت محبوبِ خدا

سرور انبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عاشق مصطفےٰ نے زندگی بھر محبّت کے چراغ جلائے، اُجڑی محفلوں کو گلزار بنایا۔ اسلام کی کشت ویران کو اپنی محبّت و عشق کے ابرِنیساں سے سیراب کیا۔ خرمنِ گستاخان رسول پر صاعقہ بن کر گرے اور ان کے حاصل کشت کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کی ذاتِ گرامی بریلی کے مدرسہ عالیہ سے تعلیم پا کر ایسے باطل عقائد رکھنے والے لوگوں کے مقابل نہ آتی تو آج ہر جگہ صلوٰۃ وسلام کے نقارے نہ بجتے۔ مساجد میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کا نام لینا گناہ ہوتا۔ آپ کی ذات کا ہی تصدق ہے کہ آج ہر مسجد میں میلاد پڑھتے ہوئے مصطفےٰ جانِ رحمت اور شمعِ بزمِ ہدایت کے حضور درود و سلام کے نذرانے پیش کئے جاتے ہیں ؎

مصطفےٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

اعلیٰ حضرت اور اُنکے رُفقاء کی سیاسی خدمات

از شوکت صدیقی

(۱)

مولانا احمد رضا خان صاحب جون ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۱ء میں ان کا وصال ہوا۔ وہ نسباً پٹھان، مسلکاً حنفی، مشرباً قادری اور مولداً بریلوی تھے۔ ان کے بارے میں وہابیوں کا یہ الزام کہ وہ انگریزوں کے پروردہ یا انگریز پرست تھے، نہایت گمراہ کن اور شر انگیز ہے۔ وہ انگریزوں اور ان کی حکومت کے اس قدر کٹر دشمن تھے کہ لفافہ پر ہمیشہ الٹا ٹکٹ لگاتے تھے۔ اور برملا کہتے تھے کہ "میں نے جارج پنجم کا سر نیچا کر دیا"۔ انہوں نے زندگی بھر انگریزوں کی حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا۔ مشہور ہے کہ مولانا احمد رضا خان نے کبھی عدالت میں حاضری نہ دی۔ ایک بار انہیں ایک مقدمہ کے سلسلے میں عدالت میں طلب بھی کیا گیا مگر انہوں نے توہینِ عدالت کے باوجود حاضری نہ دی اور یہ کہہ کر نہ دی کہ "میں انگریز کی حکومت ہی کو جب تسلیم نہیں کرتا تو اس کے عدل وانصاف اور عدالت کو کیسے تسلیم کر لوں"۔ کہتے ہیں کہ انہیں گرفتار کرکے حاضر عدالت ہونے کے احکامات جاری کئے گئے۔ بات اتنی بڑھی کہ معاملہ پولیس سے گزر کر فوج تک پہنچا، مگر اُن کے جانثار ہزاروں کی تعداد میں سر سے کفن باندھ کر ان کے گھر کے سامنے کھڑے ہو گئے آخر عدالت کو اپنا حکم واپس لینا پڑا۔

(۲)

مولانا شاہ احمد رضا خان قادری اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ ان کا سب سے بڑا علمی کارنامہ قرآن کریم کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۱۱ء میں "کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن"

کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر انہوں نے تصنیف اور تالیف کا جو کام کیا ان کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ وہ دوبار حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور وہابیوں کی تمام سازشوں اور مخالفتوں کے باوجود شریف مکہ اور علمائے حجاز کی نظروں میں ہمیشہ نہایت عزت و توقیر سے دیکھے گئے۔

(۳)

درست ہے کہ مولانا احمد رضا خان نے علمائے اہلِ حدیث اور علمائے دیوبند کی طرح براہ راست سیاست میں حصہ نہ لیا۔ تبلیغ اور اشاعتِ اسلام کے کام نے انہیں سیاست کی جانب متوجہ ہونے کا موقع ہی نہیں دیا۔ مولانا احمد رضا خان پر وہابیوں کی جانب سے یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ شرک و بدعت کو فروغ دیتے تھے اور قبر پرستی اور اوہام پرستی کی حمایت کرتے تھے۔ مگر مولانا احمد رضا خان کی تعلیمات اور ان کے عقائد کو ان کی تصانیف کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ بے بنیاد الزام نظر آتا ہے۔

(ہفت روزہ "الفتح"، (کراچی) شمارہ ۱۴-۲۱ مئی ۱۹۷۶ء، ص ۱۷)

(۴)

مولانا احمد رضا خان نے بھی اپنی تعلیمات سے یہی فرض انجام دیا مگر انہوں نے وہابیوں کی انتہاپسندی کے مقابلے میں اعتدال سے کام لیا اور وہابیوں کے مقابلہ میں برِ صغیر کے معروضی حالات کو سمجھنے میں زیادہ سوجھ بوجھ اور بالغ نظری سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ صدیاں گزر جانے کے باوجود پاکستان اور ہندوستان میں وہابی ہمیشہ اقلیت میں اور اہلِ سنّت و جماعت بھاری اکثریت میں نظر آتے ہیں۔ عام سُنّی مسلمان خواہ وہ بریلوی مسلک سے براہِ راست وابستہ ہو یا نہ ہو مگر ایک مسلمان کی حیثیت سے وہ اپنی مذہبی اور سماجی زندگی میں مولانا احمد رضا خان

کا پیرو نظر آتا ہے۔

(۵)

بریلویوں کے بارے ایک اور قابلِ ذکر بات کہنے کو دل چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ وہابیوں کے تمام گروہوں نے "تحریکِ پاکستان" کی مذہبی بنیادوں پر شدید مخالفت کی مگر قیامِ پاکستان کے بعد خصوصیت کے ساتھ جماعتِ اسلامی اور دیوبندی رہنما جو مخالفت میں پیش پیش تھے، ہجرت کر کے اسی پاکستان میں آئے جسے وہ "کافرستان" کہتے نہ تھکتے تھے۔ لیکن بریلویوں کے راہنما مولانا احمد رضا خان کے فرزند اور ان کے جانشین مولانا مصطفےٰ رضا خان نے ہمیشہ تحریکِ پاکستان کی کھل کر حمایت کی۔ انہوں نے اپریل ۱۹۴۶ء میں "تحریکِ پاکستان" کی حمایت و تائید میں منعقد ہونے والی آل انڈیا سنّی کانفرنس میں نہایت سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد مولانا مصطفےٰ رضا خان نے بریلویوں کے شدید اصرار کے باوجود ہجرت نہ کی۔ اور بریلی کے "دارالعلوم منظرِ اسلام" کے ذریعہ اشاعت و تبلیغ اسلام کے کام میں سرگرم عمل ہیں۔ وہابی علماء اس بات پر بھی اعتراض کرنے سے نہ چوکے اور اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ دلچسپ الزام لگایا کہ مولانا مصطفےٰ رضا خان نے جائیداد اور املاک کے باعث ہجرت نہ کی ———

(ہفت روزہ "الفتح" (کراچی) شمارہ مذکور ص ۱۴)

(۶)

"بریلوی" مسلمانوں کا کوئی فرقہ نہیں بلکہ ایک مکتبہ فکر ہے جس کی بنیاد عشقِ رسول ہے ان کا سلسلہ حضرت اویس قرنی سے ملتا ہے جنہوں نے یہ سُن کر کہ جنگِ احد میں رسول اللہ کا دندان مبارک شہید ہو گیا، اپنے تمام دانت

بے قرار ہو کر توڑ دیئے تھے۔ وہابیوں کے ساتھ بریلویوں کے تضاد اور اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ وہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فلسفہ کو خدائے وحدہٗ لاشریک کی ذات میں شرکت قرار دے کر شرک و بدعت بلکہ تکفیر قرار دیتے ہیں۔ برصغیر کے وہ تمام مسلمان، جو اہلِ سنت کہلاتے ہیں، شاہ احمد رضا خان کے مسلک سے براہِ راست تعلق نہ رکھنے کے باوجود اپنے رہن سہن، طور طریق اور مذہبی عقائد کے اظہار میں شاہ احمد رضا خان کی تعلیمات کی تقلید یا اتباع کرتے نظر آتے ہیں ——— ایسے لوگ تھوڑے بھی نہیں۔ برصغیر کی نوّے فی صدی آبادی پر مشتمل ہیں۔ جمہوریت اس دور کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس جمہوریت کا تقاضا ہے کہ جب فیصلہ کا وقت آئے تو اکثریت ہی کی بات تسلیم کرنی چاہیئے اسلام نے بھی فیصلہ کے لیے اجماع کے طریقے کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا کسی مسئلہ پر بریلویوں سے ہمدردی رکھنا اور ان کی بات پر کان دھرنا قطعی فطری امر ہے ......

(۷)

مولانا احمد رضا خان پر "تحریکِ پاکستان" کی مخالفت کرنا اور قائدِ اعظم کے خلاف کفر کا فتوٰی دینا بہت بڑا جھوٹ ہے یہ بددیانتی اور کذب و افترا کا مظاہرہ ہے۔ مفتی احمد رضا خان کا ۱۹۲۱ء میں وصال ہوا۔ اس وقت تک "تحریکِ پاکستان" تو ایک طرف رہی۔ لفظ "پاکستان" تک سننے میں نہ آیا تھا۔ "مسلم لیگ" اس وقت ایک بے جان اور مردہ سیاسی جماعت تھی۔ قائدِ اعظم مسلمانوں کے ایک عظیم رہنما کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے نہ آئے تھے۔ اس وقت وہ صرف مسٹر جناح تھے۔ یہ دور تحریکِ ہجرت، تحریکِ خلافت اور ترکِ موالات اور تحریکِ عدمِ تعاون کا دور تھا۔ اس وقت مسلمانوں کی سیاست پر مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور ڈاکٹر انصاری چھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف ان کا طوطی بولتا تھا۔ یہ تاریخی حقائق ہیں اور ایسے ہی واضح اور عیاں ہیں جیسے دن، دن ہوتا ہے اور رات،

رات ہوتی ہے۔ ان حالات میں مسلم لیگ، قائدِ اعظم یا تحریکِ پاکستان کی مخالفت کا سرے سے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ——

مولانا احمد رضا خان نہ کبھی انگریزوں کی حکومت سے وابستہ رہے نہ ان کی حمایت میں کبھی فتویٰ دیا، نہ کبھی اس بات کا کسی طور اظہار کیا۔ کم از کم میری نظر سے ان کی ایسی کوئی تحریر یا تقریر نہیں گزری۔ اگر ایسی کوئی بات سامنے آتی تو اس کا ضرور ذکر کرتا اس لیے کہ نہ میرا ان کے مسلک سے تعلق ہے نہ ان کے خانوادے سے، للٰہذا شاہ احمد رضا خان کو علمائے سو کے زمرے میں شامل کرنا سراسر بہتان اور تہمت ہے ....

(۸)

بریلویوں پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ محرمات و منکراتِ شرعیہ کی ترویج کرتے ہیں مثلاً مرنے والے کی فاتحہ کے نام پر طرح طرح کے مرغن کھانے پکواتے ہیں۔ قبروں کے آگے مردوں اور عورتوں سے سجدے کرواتے ہیں مگر امامِ اہلسنت مولانا احمد رضا خان کی تصانیف جو میرے مطالعہ میں آئی ہیں، ان سے ان الزامات کی تردید ہوتی ہے ——

(۹)

یہ معمولی نہیں، بہت بڑا فرق ہے۔ مولانا مودودی کسی دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل عالم نہ ہونے کے باوجود "تفہیم القرآن" لکھتے ہیں جس کا ہر طرف شہرہ ہوتا ہے۔ زبردست دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے مگر مولانا احمد رضا خان نے ۱۹۱۱ء میں قرآن کریم کا اردو میں نہایت اعلیٰ ترجمہ کیا ان کے خلیفہ مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے "خزائن العرفان" کے نام سے اس پر تفسیری حواشی لکھے۔ یہ دونوں ہی نہایت بلند پایہ کتابیں ہیں۔ مگر لوگ ان کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ یہی حال شاہ احمد رضا خان کی دوسری تصانیف کا ہے۔ ان کی تعداد لگ بھگ ایک ہزار

ہے جو اسلامی علوم کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہے مگر وہ بازار میں نہیں ملتیں۔ اہلسنّت کو کبھی اتنا سرمایہ ہی میسر نہیں ہوا کہ انہیں دوبارہ شائع کر سکیں۔ للہذا احمد رضا خان صاحب کے بارے میں وہابیوں نے، خصوصیت کے ساتھ جماعت اسلامی والوں نے جو گمراہ کن پروپیگنڈہ پھیلا رکھا ہے، لوگ اسی کو مان لیتے ہیں۔

شاہ احمد رضا خان کو ان کی تصانیف اور تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ ایک فاضل اجل اور جلیل القدر عالم اور مفتی کی حیثیت سے ستارۂ نور کی مانند نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مرتبہ بلند، بلکہ بہت بلند ہے۔ افسوس کہ ان کی تعلیمات پر کام نہ ہوا۔ اہلِ سنّت کی تنگدستی اور تہی دامنی نے ان کی تعلیمات کو اپنے جمال و جلال اور صحیح خدوخال کے ساتھ آنے کا موقع نہ دیا، بڑا ظلم ہوا۔

(ہفت روزہ الفتح (کراچی) شمارہ ۲۸ مئی - ۴ جون ۱۹۷۶ء، ص ۱۸-۱۹)

مولانا احمد رضا خاں کا نعتیہ کلام

از جناب جلیل قدوائی

مجھے اقرار ہے کہ میرے موضوع کا یہ بالکل صحیح صحیح عنوان نہیں ہے۔ مولانا کے کلام کے ساتھ نعتیہ کی تخصیص اس لیے غلط ہوگی کہ جہاں تک میرا علم ہے اُن کا سارا کلام نعت و منقبت وغیرہ ہی میں ہے۔ عام عاشقانہ یا بیانیہ ان کا کوئی کلام نہیں ہے۔ مگر چونکہ مولانا کی نعت گوئی پر اظہارِ خیال مقصود ہے اس لیے نعتیہ کا لفظ لانا بھی کچھ ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔ پھر مولانا نے فارسی اور عربی زبانوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر ان زبانوں پر مجھے کما حقہ، دسترس نہیں اور اس مضمون میں صرف اُن کے اُردو کلام کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں مگر زیر نظر عنوان سے یہ بات صاف صاف نہیں ظاہر ہوتی کہ اظہار رائے صرف اُردو کلام پر ہے۔ ان کوتاہیوں کے لیے میں ناظرین سے معذرت خواہ ہوں۔ لیکن اگر میں عنوان کچھ اس طرح کا قائم کردں جیسے "مولانا احمد رضا خان کا اُردو کلام" تو بھی اس سے میری دقت حل نہیں ہوتی اس لیے کہ اس سے یہ پتہ تو چل جاتا ہے کہ اس مضمون میں مولانا کے غیر اُردو کلام سے بحث نہیں کی گئی ہے مگر حتمی طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولانا کا نعتیہ کے علاوہ کوئی اور کلام ہی نہیں ہے۔ اب میری اور آپ کی بھلائی شاید اس میں نظر آتی ہے کہ بہ حالات موجودہ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے موجودہ عنوان ہی کو بہترین تسلیم کر لیا جائے۔

نومبر ۱۹۵۸ء میں اپنے مرحوم دوست منظر صدیقی[۱] کے اصرار پر "بزم سیماب"

---

[۱] مولانا سیماب اکبر آبادی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ خود اپنی بھی شاعرانہ حیثیت

بقیہ حاشیہ ص ۲۱۶ پر

کی طرف سے کراچی میں منعقدہ جشنِ یوم میلاد النبی کے نعتیہ مشاعرے میں مَیں نے خطبۂ صدارت پڑھا تھا۔ اس میں مولانا رضاؔ کا ایک مطلع نقل کیا تھا ؎

لحد میں عشق رخ شہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سُنی تھی، چراغ لے کے چلے

میں وہ خطبہ اور اس میں مولانا کے اس مطلع کی شمولیت بھول چکا تھا۔ مگر چند دن ہوئے مرید احمد چشتی صاحب نے اپنے ایک خط میں اخبار "جنگ" کے حوالہ سے مجھے اس کی یاد دلائی اور مولانا کی شاعری پر مجھ سے کچھ لکھنے کا اصرار کیا۔ سچ یہ ہے کہ مولانا کا کلام اِدھر اُدھر سے میری نظر سے ضرور گذرا تھا۔ مگر میں نے اسے بالاستیعاب نہیں پڑھا تھا اور اس مختصر سے مطالعہ کی بنیاد پر کوئی "مقالہ" لکھنا میرے بس کی بات نہ تھی مگر "مرید" نے مجھ "پیر" کو "اُڑانے" کا تہیہ کر رکھا تھا بمصداق

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۸) رکھتے تھے۔ تقسیم سے قبل تو نہیں۔ مگر قیامِ پاکستان کے بعد مولانائے مرحوم سے برائے نام مگر منظر سے میرے بہت قریبی اور مخلصانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ میری حکومتِ پاکستان کی ملازمت کے دوران نیز بعد میں میرے انجمن ترقی اُردو سے متعلق ہو جانے پر بھی شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا جاتا ہو جس میں دو ایک بار دیر دیر تک مجھ سے دفتر میں آکر ملاقات نہ کرتے ہوں۔ مدتوں پہلے جب میں مشاعروں میں شریک ہوتا تھا، اُن سے زیادہ اخلاص اور اصرار کے ساتھ مجھے مشاعروں میں کوئی اور نہیں لے گیا اور حق یہ ہے کہ انکے زیرِ اہتمام مشاعرے نفاست، خوش مذاقی اور خاطر داری کی جان ہوتے تھے۔ کمزور اور بیمار رہتے تھے اور جلد ہی ان کی صحت نے جواب دے دیا۔ علالت کے دوران نیز صحت کی حالت میں اُن کے بھیجے ہوئے میرے پاس بکثرت خطوط موجود ہیں۔ شاید مالی حیثیت سے بھی متردد رہتے تھے بمصداق راقم ؎ واہ کیا ظرف ہے عشاق کا اللہ اللہ کثرتِ ضربِ حوادث سے بھی دل چور نہیں! ایک بار بھی کوئی حرفِ مطلب زبان پر نہیں لائے۔ "بزمِ سیماب" کے لیے اُن کا دم بسا غنیمت تھا۔ انکے بعد اس نے بھی دم توڑ دیا۔ ع کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے

"پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند" چنانچہ انہوں نے مجھے مضمون لکھنے کے لیے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مطبوعہ و غیر مطبوعہ دونوں طرح کا مسالا فراہم کر دیا اور اب مجھے نہ صرف اپنی محرومی پر افسوس ہوا کہ مولانا کا کلام اس سے قبل مفصل کیوں نہیں پڑھا بلکہ مضمون نہ لکھنے کا بھی کوئی عذر باقی نہ رہا۔

اوپر میں نے مولانا کے جس مطلع کا ذکر کیا ہے اُن کا کلام بالاستیعاب پڑھنے کے بعد ایسے بہتیرے نشتر آنکھوں میں کھُبے اور دل میں پیوست ہوئے۔ ایک مقام پر نظر سے گزرا کہ مرزا داغ نے جب مولانا کا یہ مطلع سنا ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں

تو بہت تعریف کی اور فرمایا "مولوی ہو کر ایسے اچھے شعر کہتا ہے"۔ خیر، یہ مطلع تو استاد کے خاص اپنے مذاق کا تھا اور اُنہیں پسند آنا ہی تھا لیکن اگر مولانا کی نعت میں غزل کی عام شان دیکھنا ہو، جو میں سمجھتا ہوں مولانا کے کلام کا امتیازی اور مخصوص وصف ہے تو اس کی ان کے کلام میں کمی نہیں۔ میری طرح استاد نے بھی مولانا کا کلام بالاستیعاب نہیں دیکھا تھا ورنہ اس میں انہیں عشق و معرفت کے ساتھ بیان کی شستگی و روانی اور زبان کی شگفتگی و برجستگی کے بہت سے اور بھی قابلِ قدر نمونے ملتے آپ ملاحظہ فرمائیں۔ نعت جیسی مستثنیٰ صنف میں جہاں فرطِ نیازمندی و جوشِ عقیدت نیز احترامِ رسالت و پابندیٔ شریعت کے پیشِ نظر، جس کی بناء پر ایک شاعر نے تنبیہ کی ہے ؏

باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

کلام کی شاعرانہ خوبیوں پر ہمہ وقت نظر رکھنا عموماً مشکل ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف ہی میں نہیں بلکہ اخلاق و موعظت کے مضامین میں بھی جو اِلاّ ماشاء اللہ، شاعرانہ اعتبار سے خشک اور بے جان سمجھے جاتے ہیں، مولانا نے ان اوصاف کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے ؎

اے شافعِ امم، شہِ ذی جاہ، لے خبر
لِلّٰہ لے خبر مری، لِلّٰہ لے خبر

مجرم کو بارگاہِ عدالت میں لائے ہیں
تکتا ہے بے کسی میں تری راہ، لے خبر

اہلِ عمل کو اُن کے عمل کام آئیں گے
میرا ہے کون تیرے سوا، آہ، لے خبر

مانا کہ سخت مجرم و ناکارہ ہے رضا
تیرا ہی تو ہے بندۂ درگاہ، لے خبر

دیر سے آپ میں آنا نہیں ملتا ہے ہمیں
کیا ہی خود رفتہ کیا جلوۂ جاناں ہم کو

جس تبسم نے گلستاں پہ گرائی بجلی
پھر دکھا دے وہ ادائے گُلِ خنداں ہم کو

کاش آویزۂ قندیلِ مدینہ ہو وہ دل
جس کی سوزش نے کیا رشکِ چراغاں ہم کو

خاک ہو جائیں درِ پاک پہ حسرت مٹ جائے
یا الٰہی! نہ پھرا بے سر و ساماں، ہم کو

جب سے آنکھوں میں سمائی ہے مدینہ کی بہار
نظر آتے ہیں خزاں دیدہ گلستاں ہم کو

گر لبِ پاک سے اقرارِ شفاعت ہو جائے
یوں نہ بے چین رکھے جوششِ عصیاں ہم کو

نیرِ حشر نے اک آگ لگا رکھی ہے
تیز ہے دھوپ، ملے سایۂ داماں ہم کو

چونکہ میں ایک ایک دو دو متفرق اشعار پیش کر کے کسی شاعر کے اندازِ سخن اور اس کے کلام کے حسن و قبح پر کوئی دلیل قائم کرنا محکم طریق کار نہیں مانتا، اگرچہ شاعر کے متفرق اچھے اشعار کو اُن کی ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے دادِ تحسین کا بالکل غیر مستحق بھی نہیں سمجھتا۔ اس لیے میں نے مندرجہ بالا غزلیات کے معتد بہ تعداد میں منتخب اشعار ناظرین کی نذر کئے ہیں اور یہ غزل جیسی مبینہ بے ترتیب و غیر ہم آہنگ صنفِ سخن نہیں۔ خود مولانا کے کلام کا اعجاز نہیں تو کیا ہے کہ پھر بھی نہ صرف غزل کی روایتی شان قائم رہتی ہے بلکہ اس کا تسلسل نہیں ٹوٹتا اور ایک مخصوص فضا قائم رہتی ہے۔ کچھ اور اشعار دیکھئے۔ چھوٹی بحر کے ہیں اور نشتر کا حکم رکھتے ہیں ؎

راہ پُر خار ہے، کیا ہونا ہے
پاؤں افگار ہے، کیا ہونا ہے

تن کی اب کون خبر لے، ہے ہے!
دل کا آزار ہے، کیا ہونا ہے

جان ہلکان ہوئی جاتی ہے
بار سا بار ہے، کیا ہونا ہے

روشنی کی ہمیں عادت اور گھر ۔۔۔ تیرہ و تار ہے، کیا ہونا ہے
دور جانا ہے، رہا دن تھوڑا ۔۔۔ راہ دشوار ہے، کیا ہونا ہے

اس سلسلے میں یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں ؎

کیوں نہ گلشن مری خوشبوئے دہن سے مہکے ۔۔۔ باغِ عالم میں میں بلبل ہوں ثنا خواں کس کا؟
آفتِ جانِ عنادل ہے ترا حسن اے گل ۔۔۔ رنگ اڑایا ہے یہ اے جانِ گلستاں کس کا؟
شب اعمال سیہ، صبح کرم سے بدلی ۔۔۔ نور افشاں ہوا یہ چہرۂ تاباں کس کا؟

یا نبی! جس کی اماں چاہے رضائے خستہ
تیرے دامن کے سوا اور ہے داماں کس کا؟

اور یہ غیر مطبوعہ شعر تو بالکل اصغر گونڈوی کا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کے دور سے اتنے پہلے کا شعر اور انداز بیان کی یہ طرزگی ؎

کسی وحشی کی خاک اُڑ کر حرم میں آ گئی شاید
بگولوں سے ہے اُٹھتا شورِ مستانہ سلاسل کا!

اسی طرح مولانا کے حسب ذیل مقطع ؎

اُن کے آگے دعویٔ ہستی رضاؔ؟ ۔۔۔ کیا بکے جاتا ہے یہ ہر بار ہم!

پر بھی انقیاد و طاعت سے بھرپور اصغر صاحب کا یہ مطلع یاد آتا ہے ؎

مرا وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے ۔۔۔ کہ ریشہ ریشہ میں ساری ہے اک جبینِ سجود

یا اصغر صاحب ہی کا یہ مقطع ؎

اصغر حریم عشق میں ہستی ہی جرم ہے ۔۔۔ رکھنا کبھی نہ پاؤں یہاں سر لیے ہوئے

اس ضمن میں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی نعتیہ غزل گوئی میں کہیں کہیں بالکل غیر متوقع طور پر اور یقیناً کسی اہتمام و التزام کے بغیر متعدد اساتذۂ سخن کے مخصوص رنگ کی جھلک نظر آ جاتی ہے اور یہ دیکھتے ہوئے کہ جیسا میں آگے چل کر واضح کر دوں گا، موصوف شعر و شاعری کو اپنے لیے کچھ موجب فخر و مباہات یا "ذریعۂ عزت"[1]

---

[1] غالب: ع۔ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

خیال نہ کرتے تھے اسے بھی اُن کا ایک قابل ذکر بلکہ وہبی وصف شمار کرنا چاہیئے۔
اوپر کی ایک غزل ”دور پُر خار ہے، کیا ہونا ہے، افکار ہے، کیا ہونا ہے“ میں ؎
دور جانا ہے، رہا دن تھوڑا

یا اس سے زیادہ اُن کے ایک مطلع ؎

کس بلا کی مے سے ہیں سرشار ہم دن ڈھلا، ہوتے نہیں ہشیار ہم

پر میرؔ کا شعر یاد آتا ہے ؎

صبح گزری، شام ہونے آئی میرؔ تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

یا ان اشعار سے جو جدید شاعری کے زمرے میں آتے ہیں، نظیرؔ اکبر آبادی اور
آرزو لکھنوی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اگرچہ سچ پوچھئے تو یہ اپنی معنویت کے اعتبار سے
ان اساتذہ کے کلام سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہیں۔ یعنی نعتیہ کلام کے ساتھ ساتھ
محاسبۂ نفس ا ؎

سونا جنگل، رات اندھیری، چھائی بدلی کالی ہے
سونے والو جاگتے رہیو چوروں کی رکھوالی ہے

بادل گرجے، بجلی تڑپے، دھک سے کلیجہ ہو جائے
بن میں گھٹا کی بھیانک صورت کیسی کالی کالی ہے

ساتھی کہہ کے پکاروں ساتھی ہو تو جواب آئے
پھر جھنجھلا کر سر دے پٹکوں چل رے مولا والی ہے

تم تو چاند عرب کے ہو پیارے تم تو عجم کے سورج ہو
دیکھو مجھ بیکس پر سب نے کیسی آفت ڈالی ہے

دُنیا کو تو کیا جانے یہ بس کی گانٹھ ہے حرافہ
صورت دیکھو ظالم کی تو کیسی بھولی بھالی ہے

اس پر یاسؔ یگانہ کا مشہور شعر یاد آتا ہے اگرچہ اُن کا شعر محض عاشقانہ ہے اور
مولانا کا معنوی وسعت میں اپنے اندر دنیائیں سمیٹے ہوئے ہے ؎

چتونوں سے کھلتا ہے کچھ سراغ باطن کا — چال سے تو ظالم کے سادگی برستی ہے

مولانا کے اسی غزل کے کچھ اور اشعار ؎

شہد دکھائے زہر پلائے، قاتل ڈائن، شوہر کُش
اس مُردار پہ کیا للچایا، دنیا دیکھی بھالی ہے

وہ تو نہایت سستا سودا بیچ رہے ہیں جنّت کا
ہم مفلس کیا مول چکائیں اپنا ہاتھ ہی خالی ہے

مولا تیرے عفو و کرم ہوں میرے گواہ صفائی کے
ورنہ رضا سے چور پہ تیری ڈگری تو اقبالی ہے

مولانا کی کئی غزلوں کو اُن کے مختلف اوصاف کی بنا پر لوگوں نے شہ کار کا درجہ دیا ہے۔ خصوصاً اُن کی خسرو کے رنگ کی غزل کو جو صنعت ملمع میں ہے اور جس کا بعض اہلِ رائے نے فیضی، قاآنی اور انشا کی غزلوں سے مقابلہ کیا ہے یعنی عربی، فارسی، ہندی اور اُردو کی جامع غزل اور اس شعر کی حامل ؎

البحر علا والموجُ طغیٰ، من بے کس و طوفاں ہوش رُبا
منجدھار میں ہوں بگڑی ہے ہوا، موری نیا پار لگا جانا

لیکن میرے ناقص خیال میں اُن کے اس رنگ کے بعض اشعار میں کما حقہٗ ہمواری مفقود ہے اور میری منتخبہ مندرجہ بالا غزل نہ صرف اپنے منفرد اندازِ بیان بلکہ اعلیٰ معنویت و گیرائی کے لحاظ سے بھی مولانا کے سارے کلام پر بھاری ہے اور بفرضِ محال ان کا پہلا شہ کار نہ ہو تو دوسرا ضرور ہے۔

خود مولانا کی اپنی شاعری کے بارے میں کیا رائے تھی؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ ان کے ایک غیر مطبوعہ قطعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں ہرگز کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔ دراصل وہ ایک عالم متبحّر اور فاضل اجل تھے، دانا و بینا، قرآن پاک کے مترجم و مفسر، دینی و فقہی امور میں استاد کامل، جن کی بعض علمی اختلافات کے باوجود علامہ شبلی، مولانا سلیمان ندوی اور علامہ اقبال جیسے بزرگوں

نے تعریف کی ۔ مگر وہ ایک سرمست و سرشار عاشق رسول بھی تھے ۔ جگر کا مطلع یاد آگیا۔

مست و سرشار و غزل خواں می روم
از سر جاں سوے جاناں می روم

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ اُن کے جوشِ عقیدت نے انہیں شاعر بنا دیا۔ اسے انہوں نے اپنے قطعہ میں یوں بیان کیا ہے

رہا نہ شوق کبھی مجھ کو سیر دیواں سے ۔۔۔ ہمیشہ صحبت ارباب شعر سے ہوں نفور
نہ اپنے کاموں سے تضییع وقت کی فرصت ۔۔۔ نہ اپنی وضع کے قابل کہ اس میں ہوں مشہور
رہی وبال سے اسکے مجھے سبک دوشی ۔۔۔ کہ ویسے ہی ہے گراں سر پہ بار جرم و قصور

. . . .

مگر جو ہاتف غیبی مجھے بتاتا ہے ۔۔۔ زبان تک اسے لاتا ہوں میں بمدح حضور

لہٰذا مولانا کے کلام پر نظر ڈالتے ہوئے انکے اس نقطۂ نظر کو ضرور سامنے رکھنا چاہیئے بلکہ ان محدودات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے قابل تحسین کلام پر انہیں اور زیادہ داد دینی چاہیئے ۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ اُنہوں نے کبھی اپنی استادی کا دعوٰی نہیں کیا بلکہ جو قدر و مقبولیت ان کے کلام کو حاصل رہی اسے وہ ”ہاتفِ غیبی“ کا فیض بتاتے ہیں جو ان کے عشقِ رسول پر جوشِ عقیدت کا نتیجہ ہے اور بس ۔

مولانا کے کلام میں قرآنِ پاک اور احادیث کے بکثرت حوالے ملتے ہیں اور محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال، اقوال، صنائع بدائع، رعایات وغیرہ بھی بہت ہیں ۔ بے شک خالص ادبی معیار سے اعلیٰ درجہ کی شاعری میں ان چیزوں کی گنجائش محدود ہے اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان وجوہ سے کہیں کہیں ان کے کلام میں ثقالت ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے مگر یہ عیب تو آپ کو ہر زبان کے بڑے سے بڑے شاعر کے ہاں بلکہ قدمائے دور میں بھی ملے گا ، نہ ہر شاعر کے سارے کلام میں ایک ہی اعلیٰ سطح کی ہمواری ملے گی ۔ مکمل ہمواری ظاہر و باطن دونوں دُنیاؤں میں مفقود بلکہ مصلحت تکوینی کے خلاف ہے ۔ مولانا کوئی پیشہ ور یا مشاعروں کے شاعر نہیں تھے اور اس

قسم کے شاعر بھی متذکرہ کلیہ سے مستثنیٰ کب ہوتے یا ہو سکتے ہیں۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مولانا کی سرمستی وسرشاری بلاشبہ انہیں "نعرۂ منصوری" کا جواز بخشتی ہے۔ اصغر نے جب یہ کہا کہ ؎

دونوں عالم تری نیرنگ ادائی کے نثار
اب کوئی چیز یہاں جیب محبت میں نہیں

تو انہوں نے عشق کی خاطر، عشق کے سوا دنیا کی ہر چیز سے اپنی مکمل بے تعلقی، بے خبری، گم شدگی، بلکہ بے اعتنائی کا اظہار کیا اور یہ جو کہا کہ ع

جوشش عشق میں ہر چیز اُڑی جاتی ہے!

تو اس امر کا اعلان کیا کہ ایک طوفانی جذبۂ پرستش کے آگے ماسوائے عشق کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ بلکہ عشق کے آگے ہر چیز ہیچ ہے۔ یہ انہوں نے ایک عظیم حقیقت پیش کی اور میں کہوں گا کہ اگر عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سیل رواں بلکہ سیلاب تند و تیز کے آگے مولانا کی شاعری میں فن کے بہتیرے لوازم و اصول خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ تو ہمیں اس امر پہ ملال کیوں ہو؟ عشق رسول کا بازار تو گرم رہا، عقیدت رسول کے شغل و شغف کا کاروبار تو جاری رہا۔

ل

مولانا احمد رضا خان صاحب رضا اور محاوروں کا استعمال

از جناب سید نور محمد قادری

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ بے مثل مصنف، کامیاب مترجم، بلند پایہ شاعر اور صاحبِ طرز ادیب تھے۔ آپ کے مجموعہ ہائے نظم و نثر میں ایسے ٹکڑے جا بجا بکھرے پڑے ہیں جو فصاحت و بلاغت اور شگفتگی و سلاست کا بہترین مرقع ہیں۔ روزمرہ اور محاورہ پر آپ کو بے پناہ عبور حاصل ہے۔ آپ نے نظم و نثر میں جہاں بھی انہیں استعمال کیا ہے، ایک ماہرِ فن ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اگرچہ ادھر چند سالوں سے آپ کے فن اور شخصیت پر کئی بہترین مقالے سامنے آچکے ہیں لیکن آپ کی ادبی حیثیت کی طرف ابھی تک کما حقہٗ توجہ نہیں دی گئی۔ حالانکہ آپ کی زندگی کا یہ پہلو بھی کم تابناک نہیں۔

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب اپنے مقالہ "اُردو شاعری اور تصوف" میں فرماتے ہیں۔

"اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ) کا ذکر بھی کردیا جائے جن سے ہمارے ادبا نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے۔ حالانکہ یہ غالباً واحد عالمِ دین ہیں جنہوں نے نظم و نثر میں اُردو کے بے شمار محاورات استعمال کئے ہیں اور اپنی علمیت سے اُردو شاعری میں چار چاند لگا دئے ہیں۔"

(ماہنامہ "فکر و نظر"، اسلام آباد جنوری ۱۹۷۶ء ص ۵۶۸)

ڈاکٹر صاحب نے بالکل سچ کہا ہے اگر واقعی دقتِ نظر سے مولانا بریلوی کی

تصانیف نظم و نثر کا مطالعہ کیا جائے تو ایسے سینکڑوں شہ پارے ملیں گے جہاں مولانا نے اُردو روزمرہ اور محاورہ کو بڑی چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔

اب ہم ذیل میں اُن کے شعری مجموعہ "حدائقِ بخشش" سے چند مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین پر واضح ہو سکے کہ اس فن پر بھی مولانا کو کتنا عبور حاصل ہے۔

لیکن کیا یہ بہتر نہیں کہ مثالیں پیش کرنے سے پہلے ہم دیکھ لیں کہ محاورہ ہے کیا۔ پروفیسر محمد طاہر فاروقی مرحوم لکھتے ہیں۔

"محاورہ یہ ہے کہ الفاظ کو ان کے حقیقی معنوں سے ہٹا کر مجازی معنوں میں بولا جائے مثلاً آتارنا کے حقیقی معنے ہیں اوپر سے نیچے لانا جیسے گھوڑے سے سوار کو اتارنا، کھونٹی سے کپڑا اتارنا، کوٹھے پر سے پلنگ اتارنا لیکن نقشہ اتارنا، نقل اتارنا، دل سے اُتارنا میں اُتارنا اپنے حقیقی معنوں میں نہیں ہے۔ اس لئے ان کو محاورہ کہا جائے گا۔ یا مثلاً کھانا کے حقیقی معنی ہیں کسی چیز کو دانتوں سے دبا کر یا بغیر چبائے حلق سے اتارنا جیسے روٹی کھانا دوا کھانا لیکن غم کھانا، قسم کھانا، دھوکا کھانا، ٹھوکر کھانا میں کھانا اپنے حقیقی معنوں میں نہیں ہے اس لیے یہ محاورے ہیں۔"

(نثر نگاری کا فن تالیف طاہر فاروقی مطبوعہ پشاور ۱۹۶۷ء ص ۲۰۰، ۲۰۱)

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ محاورہ کے الفاظ میں ایک تو کسی قسم کی کمی بیشی جائز نہیں دوسرے ان کا صحیح اور برمحل استعمال ہی کلام میں حسن اور دل کشی پیدا کر سکتا ہے۔ اب مولانا کے کلام سے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

آپ میں آنا =

دیر سے آپ میں آنا نہیں ملتا ہے ہمیں — کیا ہی خود رفتہ کیا جلوۂ جاناں ہم کو

(حدائقِ بخشش حصہ اوّل)

ارمان نکالنا =

ملتزم سے تو گلے لگ کے نکالے ارماں — ادب و شوق کا یاں باہم اُلجھنا دیکھو

ایضاً

آب آمد تیمّم برخاست =

آب آمد وہ کہے اور میں تیمّم برخاست ‏ ‏ مشتِ خاک اپنی ہو اور نور کا اہلا تیرا

(ایضاً)

اختر شماری =

اشک شب بھر انتظارِ عفو امت میں بہیں ‏ ‏ میں فدا چاند اور یوں اختر شماری واہ واہ

(ایضاً)

آئینہ دکھانا =

دیکھنے والوں نے کچھ دیکھا نہ بھالا نور کا ‏ ‏ من رآنی کیا یہ آئینہ دکھایا نور کا

(حدائقِ بخشش حصّہ دوم)

آنکھوں تلے اندھیرا =

چھایا آنکھوں تلے اندھیرا ‏ ‏ اے شمع جمالِ مصطفائی (ایضاً)

بات بڑھانا =

طیبہ نہ سہی افضل مکہ ہی بڑا زاہد ‏ ‏ ہم عشق کے بندے ہیں کیوں بات بڑھائی ہے

(حدائقِ بخشش حصّہ اوّل)

بول بالا ہونا =

تاج والے دیکھ کر تیرا عمامہ نور کا ‏ ‏ سر جھکاتے ہیں الٰہی بول بالا نور کا

(حدائقِ بخشش حصّہ دوم)

پر جلنا =

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں

کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

(حدائقِ بخشش حصّہ اول)

ٹوپی تھامنا =

کر چکی رفعتِ کعبہ پہ نظر پروازیں ‏ ‏ ٹوپی اب تھام کے خاکِ درِ والا دیکھو

(ایضاً)

ٹکسال باہر =

چرخ پر چڑھتے ہی چاندی میں سیاہی آگئی　　کر چکی ہیں بدر کو ٹکسال باہر ایڑیاں
(ایضاً)

چھاؤنی چھانا =

دیکھ کے حضرت غنی پھیل پڑے فقیر بھی　　چھائی ہے اب تو چھاؤنی حشر ہی آ نہ جائے کیوں
(ایضاً)

چہرہ بحال کرنا =

الٰہی سن لے رضا جیتے جی کہ مولیٰ نے　　سگانِ کوچہ میں چہرہ مرا بحال کیا (ایضاً)

چاندنی چھٹکنا =

چاندنی چھٹکی ہے اُن کے نور کی　　آؤ دیکھیں سیرِ طورو نارِ ھم (ایضاً)

خون رلانا =

رحم فرمائیے یا شاہ کہ اب تاب نہیں　　تابکے خون رلائے غمِ ہجراں ہم کو (ایضاً)

خاک ہو جانا =

خاک ہو جائیں درِ خاک پہ حسرت مٹ جائے　　یا الٰہی نہ پھرا بے سروساماں ہم کو
(ایضاً)

خاک میں ملنا =

ہم خاک میں مل چکے ہیں کب کے　　نکلا نہ غبار تیرے جی سے (ایضاً)

خاک اڑانا =

ہم خاک اڑائیں گے جو وہ خاک نہ پائی　　آباد رضا جس پہ مدینہ ہے ہمارا
(ایضاً ص ۸)

دن پھرنا

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں　　تیرے دن اے بہار پھرتے ہیں
(ایضاً)

دم میں دم آنا =

جس طرف اُٹھ گئی دم میں دم آ گیا   اُس نگاہِ عنایت پہ لاکھوں سلام
(حدائقِ بخشش حصہ اوّل)

رشتہ بپا =

طیرِ حرم ہیں یہ کہیں رشتہ بپا نہ ہوں   یوں دیکھیے کہ تارِ نظر کو خبر نہ ہو
(ایضاً)

سہرا گانا =

ڈالیاں جھومتی ہیں رقصِ خوشی جوش پہ ہے
بلبلیں جھومتی ہیں گاتی ہیں سہرا تیرا   (ایضاً)

سکّہ بٹھانا =

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلّم   جس سمت آ گئے ہو سکّے بٹھا دیے ہیں
(ایضاً)

کاجل چرانا =

آنکھ سے کاجل صاف چرا لیں یاں وہ چور بلا کے ہیں
تیری گٹھری تاکی ہے اور تو نے نیند نکالی ہے
(ایضاً)

کوہِ غم ٹوٹ پڑنا =

منزل نئی، عزیز جدا، لوگ ناشناس
ٹوٹا ہے کوہِ غم، میں پرِ کاہ اے خبر   (ایضاً)

کلمہ پڑھنا =

باغِ طیبہ میں سہانا پھول پھولا نور کا
مست بُو ہیں بلبلیں پڑھتی ہیں کلمہ نور کا
(حدائقِ بخشش حصہ دوم)

گُل کھلانا =

براق کے نقشِ سُم کے صدقے وہ گُل کھلائے کہ سارے رستے
مہکتے گلبن لہکتے گلشن ہرے بھرے لہلہا رہے تھے
(حدائقِ بخشش حصہ اوّل)

منہ پڑنا =

پھر منہ نہ پڑے کبھی خزاں کا دے دے ایسی بہار آقا
(ایضاً)

نظروں سے گرنا =

مولا دہائی نظروں سے گر کر جلا غلام
اشکِ مژہ رسیدہ چشمِ کباب ہوں (ایضاً)

نظر چُرانا =

کس کی نگاہ کی حیا پھرتی ہے میری آنکھ میں
نرگسِ مستِ ناز نے مجھ سے نظر چرائی کیوں (ایضاً)

ہوا بگڑنا =

خدارا ناخدا آدے سہارا ہوا بگڑی بھنور حائل ہے یا غوث
(حدائقِ بخشش حصہ دوم)

سیّد نور محمد قادری
چک ع ۱۵ شمالی۔
ڈاکخانہ چک ع ۵ ضلع گجرات
۳۰ / مئی ۱۹۸۰ء

مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ

از پروفیسر ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق

مولانا احمد رضا خان بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء) بڑے زبردست عالم اور غیر معمولی ذہانت کے مالک تھے۔ تقریباً نصف صدی تک جس قدر انہوں نے غیر مقلدین کے خلاف لکھا ہے یا لکھوایا ہے شاید دنیائے اسلام میں کسی ایک خاص دبستانِ خیال کے خلاف کبھی اتنا نہیں لکھا گیا۔ جناب اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو اہانت آمیز فقرے کہیں کہیں نظر آتے ہیں، ان کی توجیہہ بھی کر لی جائے تب بھی ان کی برائی سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے کے مکتب خیال کے خلاف مولانا احمد رضا خان اور ان کے متوسلین نے بڑی سختی سے لکھا۔ بہر حال جن لوگوں نے مولانا کو دیکھا ہے وہ اگرچہ ان کے عقائد سے مطابقت بھی نہیں رکھتے تھے، تب بھی ان کی قوتِ حافظہ، طریقِ استدلال اور اجتہاد کے قائل تھے۔ اور یہ بالکل حقیقت ہے کہ ہندوستان میں ان جیسے دل و دماغ کے علماء کم پیدا ہوئے ہیں۔

نعتیہ کلام میں مولانا کے دیوان حدائقِ بخشش کے تین حصے ہیں اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ دیوان شروع سے آخر تک ایسی محبت اور عقیدت سے بھرا ہوا ہے کہ ایک دیندار اگر اسے اپنے لیے ذریعہ نجات سمجھے تو کوئی بعید نہیں ہے۔ اس میں قصیدے، مثنویاں، خمسے، مسدس، قطعات اور رباعیات وغیرہ مختلف اصنافِ سخن ہیں۔ عربی اور فارسی کلام بھی ہے لیکن کم ہے۔ البتہ قطعاتِ

تاریخ ان زبانوں میں زیادہ ہیں۔ اور مسلسل کئی کئی شعر تاریخی ہیں جن کا مولانا کو بہت شوق تھا۔ اور انہیں خاص ملکہ بھی حاصل تھا۔ نعت کے علاوہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم، حضرت عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے قادری سلسلے کے بعض بزرگوں کی منقبت بھی ہے اور بعض مقامات پر بڑی سنگلاخ زمینیں ہیں۔ مثلاً تنویر پشتِ آئینہ۔ تنظیر پشتِ آئینہ۔ نازروئے آئینہ۔ ساز روئے آئینہ۔ لیکن عام طور پر مولانا کے یہاں آسان زمینوں میں مشکل مضامین پائے جاتے ہیں مثلاً ؎

مہر ہے مشعلہ افروز شبستاں کس کا
ماہ ہے پرتوۂ شمسۂ ایواں کس کا
سنبل آشفتہ ہے کس گل کے غمِ گیسو میں
دیدۂ نرگس بیمار ہے حیراں کس کا
تو نیاز سبق شمسیہ ہے شمسِ منیر
نور آموز ہے یارب یہ دبستاں کس کا
دار ہے آئینہ مری حیرت کا
جلوہ گر دل میں ہے عکس رخِ تاباں کس کا
ہمہ تن چشم کی صورت ہے بدن سے پیدا
منتظر ہے یہ الٰہی دل نیراں کس کا

(حدائقِ بخشش حصہ سوم مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں صفحہ ۳)

ایک اور زمین دیکھئے کہ آسان ہونے کے باوجود مشکل مضامین سے پُر ہے۔ لیکن شاعرانہ کمالات اپنی پوری دل کشی اور لطافت کے ساتھ موجود ہیں ؎

گلے سے باہر آ سکتا نہیں شور و فغاں دل کا
الٰہی چاک ہو جائے گریباں اس کے بسمل کا

شبِ اسرا قمر حیرت زدہ پھرتا رہا شب بھر
بھلایا ڈھنگ ان کی چال نے سیرِ منازل کا

بڑھا اس درجہ رُعب حسن والا لیلۃ الاسریٰ
سمٹ کر بن گیا چرخ ایک پایہ ان کے محمل کا

حجاب نور تک پہنچا کے آنکھیں ہو گئیں خیرہ
فغاں کرتا ہوا لوٹ آیا قاصد نالۂ دل کا

کسی وحشی کی خاک اڑ کر حرم میں آ گئی شاید
بگولوں سے ہے اٹھتا شور مستانہ سلاسل کا

نہیں کچھ خاص شہرستانِ امکاں بہرہ یاب ان سے
کہ سایہ دشتِ بطلان میں ہے تاج سر مماثل کا

(حدائق بخشش حصہ سوم صفحہ ۴)

لیکن مولانا کا تبحر جگہ جگہ نمایاں ہے اور محاورات بھی بکثرت ہیں۔ باڑا بٹنا۔ توڑا ہونا۔ توڑا لینا۔ کلمہ پڑھنا۔ صدقہ لینا۔ سونا چڑھنا۔ سہرا ماتھے پہ رہنا۔ بخت جاگنا۔ ستارا چمکنا۔ دن دونا ہونا۔ بول بالا ہونا۔ لہرا بجنا۔ کلیجا ٹھنڈا ہونا۔ مچلکہ لکھ دینا۔ لو لگانا۔ ذرا سامنہ نکل آنا۔ چھینٹا دینا۔ آنکھیں مانگنا۔ ماتھے ٹیکا ہونا۔ آئینہ اندھا کرنا۔ گرمی کا جھلکا لانا۔ دل کے کنول کھلنا۔ انہی قدموں پھرنا۔ اشاروں پہ چلنا۔ بے حکم پر مارنا دو ورقہ لکھنا وغیرہ وغیرہ بکثرت محاورات صرف ایک قصیدے میں ملتے ہیں اور مولانا کے تبحر کی وجہ سے ایسے قصیدے کسی قدر تشریح کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔

وہ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

بارھویں کے چاند کا مجرا ہے سجدہ نور کا
بارہ برجوں سے جھکا ایک اک ستارہ نور کا

ان کے قصرِ قدر سے خلد ایک کمرہ نور کا
سدرہ پائیں باغ میں ننھا سا پودا نور کا

عرش بھی فردوس بھی اس شاہ والا نور کا
یہ مثمن برج وہ مشکوئے اعلیٰ نور کا

بینیِ پُر نور پر رخشاں ہے بکہ نور کا
ہے لواء الحمد پر اڑتا پھریرا نور کا

مصحفِ عارض پہ ہے خطِ شفیعہ نور کا
لو سیہ کارو مبارک ہو قبالہ نور کا

شمع دل، مشکوٰۃ تن، سینہ زجاجہ نور کا
تیری صورت کے لیے آیا ہے سورہ نور کا

بزم وحدت میں مزا ہوگا دوبالا نور کا
ملنے شمع طور سے جاتا ہے اکّہ نور کا

وصف رخ میں گاتی ہیں حوریں ترانہ نور کا
قدرتی بینوں میں کیا بجتا ہے لہرا نور کا

یہ کتاب کن میں آیا طرفہ آیہ نور کا
غیر قائل کچھ نہ سمجھا کوئی معنیٰ نور کا

دیکھنے والوں نے کچھ دیکھا نہ بھالا نور کا
مَن رَأی کیسا یہ آئینہ دکھایا نور کا

پڑتی ہے نوری بھرن امڈا ہے دریا نور کا
سر جھکا اے کشتِ کفر آتا ہے اہلا نور کا

(حدائقِ بخشش حصہ دوم صفحہ ۳، ۴)

یہ ۵۹ شعروں کا قصیدہ اسی شان کے ساتھ ہے۔ قصیدہ اگرچہ
آسانی کے ساتھ سمجھ میں بھی آ جائے تو یہ دوسرا قصیدہ بغیر شرح کے یقیناً مشکل

ہے علمِ ہیئت و نجوم کی اصطلاحات کے ساتھ اس طرح لکھتے ہیں ؎

خالقِ افلاک نے طرفہ کھلائے چمن — اک گُلِ سوسن میں، ہیں لاکھوں گُلِ یاسمن
(فلک) (کواکب)

موتیے بیلے کے پھول زیبِ گریبانِ شام — جوہی چنبیلی کے گُل زینتِ جیبِ یمن
(شمال) (کواکب) (جنوب)

دامنِ البرز کی کلیوں میں پھولے ہیں پھول — کوڑے کی چوٹی میں ہے حاصلِ چندیں چمن
(بروج) (منطقۃ البروج)

طرفہ کھلے چار باغ ایک نمونے کے تین — تینوں میں چار اخیشج چاروں کی تازہ پھبن
تختۂ نسرین میں ہے گیندے کا صرف ایک پھول — ایک گُل نیلوفر چار گُل ناردن
(فلک) (عطارد) (زحل) (مریخ۔ قلب الاسد۔ قلب العقرب
عین الثور)

ناردن ناروش ناظم بالاحصار — سردر اقلیم ترک افسر لشکر شکن
(خفچاقیان)

یہ صنم تند خو آگ نہ ہو تو کہوں — پانی کے اک کیڑے سے کرنہ لیا بانکپن
(سرطان)

(حدائقِ بخشش حصہ سوم صفحہ ۳۳ - ۳۴)

یہ ۵۵ شعروں کی تمہید بڑی دل کش ہے۔ ادر استعارات کے پردوں میں علمِ ہیئت و نجوم کی متعدد اصطلاحات بڑی خوبی کے ساتھ سمو دی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کے وہ قصیدے جو اسی قسم کی اصطلاحات سے بھرے پڑے ہیں، اپنے اندر کوئی دل کشی نہیں رکھتے۔ مولانا کا یہ پورا قصیدہ ایسے دل کش استعاروں سے پُر ہے کہ اس کی مثال پوری اردو شاعری میں نظر نہیں آتی اور بغیر شرح کے ان کا سمجھنا بہت مشکل ہے۔ انہوں نے ایک جگہ صحیح فرمایا ہے ؎

ملکِ سخن کی شاہی تم کو رضاؔ مسلّم — جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

مذکورہ بالا قصیدے کی تمہید کے بعد لکھتے ہیں ؎

مدحتِ غائب ہوئی شوق کی آتش فروز
گُل کی حضوری میں ہو بلبلِ جاں نغمہ زن

جانِ دو عالم نثار وہ ہے مرا تاجدار
جس کو کہیں جانِ دین جانِ من ایمانِ من

مدحِ حسیناں نہ کر وصفِ امیراں نہ کر
خُلق انہیں کی حسین، خُلق انہیں کا حسن

(ایضاً صفحہ ۴۶)

اوّل تو اس قصیدے کی بحر بھی بہت مترنّم ہے پھر مولانا کا اندازِ بیان حسن بیان، استعارات، تلمیحات وغیرہ مختلف محاسن اور علمی اوصاف اس کثرت سے موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ خشک علوم و فنون کے سمندر کا غوّاص اس قدر شگفتگی کس طرح پیدا کر سکتا ہے ؎

پائے منور اگر بحر میں دھو لیجئے
نعلِ مبارک اگر شب پہ ہو پرتو فگن

گوشِ سمک پھیر دے فرقِ چشمِ غزال
پشتِ سمک ہول ہے گوہرِ تاجِ عدن

جلوے نرے ایک چھینٹ شب پہ اگر ڈال دیں
چشمۂ کافور تک مشک کا جائے لبن

دن کہے اس سے، نگار اک نظر ادھر
مہر کہے میں نثار نیم جھلک جانِ من

کشتۂ حسرت ہو شمس دن کو وصیت کرے
دامنِ شب کا مجھے دیجیو چٹّا کفن

تلوے ترے سیب کو دیں اگر اک بوند سیت
بڑھ کے لالی کی آب خلد کا سینچے چمن

عطر کی موجیں اٹھیں نور کے دھارے چلیں
ڈھونڈتی باغ عدن عدن سے آئے دُلہن

پانی ہو سارا گلاب بلبلے بلبل بنیں
گائیں ملہاروں میں نعت نور کی برسے پھبن

لطف تو یہی ہے کہ تشبیہات و استعارات اور صنائعِ لفظی و معنوی کی کثرت کے باوجود اس قصیدے میں ترنم کے علاوہ بڑی گھلاوٹ[۱] ہے۔ بعض رعایتوں

---

[۱] مولانا کا ایک طویل قصیدہ "فضائلِ فاروق"، کے تاریخی نام سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، کی منقبت ہے اور انہی اوصاف کا حامل ہے۔

کو ان اشعار میں بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

تیرے قلمرو کا چک، دورِ سماک و سمک
حکم رواں کی سڑک وسعِ زمین و زمن
بست کی انگشت میں خاتم پنجاہ ہے
کن کے ہیں صاحب نگیں تیرے زبان و دہن
تیرا الف قامت آج چاہے اگر بائے قلب
نون کا اُلٹے حساب قاف کا بدلے چلن
غین کی زنگت بنے سرمہ عین عشا
عین کے چھینٹ ہوں صاد نون کو ترے کرن
خواب گہ شام میں جائے شمالی براُت
جھپکا جبیں کا ابھی اُلٹے یمانی دُلہن

(ایضاً صفحہ ۴۹)

بعض استعارات اور تلمیحات اور بھی دیکھئے کہ کس لطافت سے ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

ثور سے عذرا میں جب شمس نے تحویل کی
(مدینہ) (ہجرت)
دلو سے نکلے نجوم چاند کا چھوٹا گہن
شوہر عذرا ہوا ابن عروس عرب
(مدینہ طیبہ) (اسلام) (مکہ معظمہ)
لیلیٰ و سلمیٰ ہوئیں شمع قدم کی لگن
(کعبہ) (مدینہ)
عرش پہ تیرا خطاب سید گردوں قباب
فرش میں نام جناب احمد بطحا وطن

خاتم پیغمبراں - قاسم نارد جناں
ناظم کون و مکاں حاکم برماد من
(ایضاً صفحہ ۴۹)

غرض کہ ۱۵۵، اشعار اسی شان کے ہیں اور آخر میں دعائیہ بھی تلمیحات اور رعایات سے پُر ہے - مثلاً ؎

کچھ ترے پروانے کو نام کی پروا نہ ہو
لاکھ جلیں ساتوں شمع بارہ کنول نو لگن

میرے خطِ کف سے ہو پرزے کمند بلا
کاٹ بندھے دھار سے پہنچے کر چھلی ڈگن

رحمتك الكافيه نعمتك الوافيه
العافيه من تورسان الفتن
(ایضاً صفحہ ۵۱)

اور مولانا نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ ؎

خشک سہی زرع شرع شعر تو شاداب ہیں
سرد سہی شمع دین تھالے بنے ہیں لگن
(ایضاً صفحہ ۵۱)

ایک قصیدہ بہاریہ تمہید میں ایسا دلکش ہے کہ مولانا کے کمالِ فن کا معترف ہونا پڑتا ہے - لکھتے ہیں کہ ؎

اودی اودی بدلیاں گھرنے لگیں
ننھی ننھی بوندیاں برسا چلیں

ندیاں پھر آنکھیں دکھلانے لگیں
چھوٹی چھوٹی جھیلیں پھر لہرا چلیں

جھومتی آئیں نسیمیں نرم نرم — پتلی پتلی ڈالیاں لچکا چلیں
دل کھلے کانوں میں رس پڑنے لگے — خوشنوا چڑیاں ترانے گا چلیں
تانوں کی بینوں میں پھر لہرا بجا — گیسوؤں کی ناگنیں لہرا چلیں
باغ دل میں وجد کے جھولے پڑے — آرزوئیں پھر ملاریں گا چلیں
سُرخ سبز اُودی سنہری بدلیاں — دن ڈھلے کیا چنریاں رنگوا چلیں
پھر نظر میں گد گدی ہونے لگی — دھانی دھانی بوٹیاں پھڑکا چلیں

(ایضاً صفحہ ۴۰، ۴۱)

جذبات نگاری اور عقیدت مندی تو ہر شاعر کی نعت میں کسی نہ کسی حد تک پائی جاتی ہے لیکن مولانا کی نعت میں یہ چیز زیادہ نمایاں ہے اور یہ تو ہٹ کے ردّ عمل کے طور پر ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مصطفٰے خیر الوریٰ ہو — سرورِ ہر دوسرا ہو
اپنے اچھوں کا تصدّق — ہم بدوں کو بھی نبا ہو
کس کے پھر ہو کر رہیں ہم — گر تمہیں ہم کو نہ چاہو
بد ہنسیں تم ان کی خاطر — رات بھر روؤ کرا ہو
ہم وہی ناشستہ رو ہیں — تم وہی بحرِ عطا ہو
ہم وہی بے شرم بد ہیں — تم وہی کانِ حیا ہو
ہم وہی قابل سزا کے — تم وہی رحم خدا ہو
چرخ بدلے دہر بدلے — تم بدلنے سے ورا ہو
یہ بھی مولیٰ عرض کر دوں — بھول اگر جاؤ تو کیا ہو
وہ ہو جو تم پر گراں ہے — وہ ہو جو ہرگز نہ چاہو
وہ ہو جس کا نام لیتے — دشمنوں کا دل بُرا ہو

(حدائقِ بخشش حصہ دوم صفحہ ۳۶)

ایک پُر کیف غزل یہ ہے ؎

ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں

جب آگئی ہیں جوشِ رحمت پہ ان کی آنکھیں
جلتے بجھا دیئے ہیں روتے ہنسا دیئے ہیں

اِک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کتنا
تم نے تو چلتے پھرتے مُردے جِلا دیئے ہیں

ان کے نثار کوئی کیسے ہی رنج میں ہو
جب یاد آگئے ہیں سب غم بھلا دیئے ہیں

اللہ کیا جہنّم اب بھی نہ سرد ہوگا
رو رو کے مصطفےٰ نے دریا بہا دیئے ہیں

میرے کریم سے گر قطرہ کسی نے مانگا
دریا بہا دیئے ہیں دُربے بہا دیئے ہیں

مُلکِ سخن کی شاہی تم کو رضا مُسلّم
جس سمت آگئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

مولانا کے تبحّر، علمیّت، عقیدت، ذکاوت اور کمالِ فن کے شواہد جگہ جگہ موجود ہیں۔ ان کے متعلق اوصاف دیکھنے ہوں تو صرف یہ قصیدہ کافی ہے

زمین و زماں تمہارے لیئے، مکین و مکاں تمہارے لیئے
چنین و چناں تمہارے لیئے، بنے دو جہاں تمہارے لئے

دہن میں زباں تمہارے لئے، بدن میں ہے جاں تمہارے لئے
ہم آئے یہاں تمہارے لئے، اٹھیں بھی وہاں تمہارے لئے

نہ روحِ امیں نہ عرشِ بریں نہ لوحِ مبیں کوئی بھی کہیں
خبر ہی نہیں جو رمزیں کھلیں ازل کی نہاں تمہارے لئے

جناں میں چمن چمن میں سمن سمن میں پھبن پھبن میں دُلہن
سزائے محن پہ ایسے منن یہ امن و اماں تمہارے لئے

(حدائقِ بخشش حصہ دوم صفحہ ۴۰، ۴۱)

یہی وجہ ہے کہ عوام اور خواص میں ہر جگہ مولانا کو مقبولیت حاصل ہے اور بعض نعتیہ قصیدے یا غزلیں ملک کے طول و عرض[1] میں ہر جگہ مشہور ہیں۔

مثلاً ؎

(۱) صبح طیبہ میں ہوئی بٹتا ہے باڑا نور کا
صدقہ لینے نور کا آیا ہے تارا نور کا

---

(۲) حاجیو آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو
کعبہ تو دیکھ چکے، کعبے کا کعبہ دیکھو

---

(۳) سب سے اعلیٰ و اولیٰ ہمارا نبی
سب سے بالا و والا ہمارا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

(۴) ان کی مہک نے دل کے غنچے کھلا دیئے ہیں
جس راہ چل گئے ہیں کوچے بسا دیئے ہیں

---

(۵) یہ کمالِ حسنِ حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دُور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

---

[1] مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا صاحب کا نعتیہ کلام بھی بہت مشہور و مقبول ہے۔

(۶) جب کہ پیدا شہِ انس و جاں ہو گیا
دُور کعبے سے لوثِ بُتاں ہو گیا

---

(۷) مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمعِ بزمِ ہدایت پہ لاکھوں سلام

(اُردو میں نعتیہ شاعری از پروفیسر ڈاکٹر سیّد رفیع الدین اشفاق
مطبوعہ اُردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۸۰/۳۹۱)

امام اہلسنّت اعلیٰحضرت احمد رضا خان بریلوی

ایک جامع کمالات شخصیّت

(از علامہ نور احمد قادری)

امام اہلسنّت اعلیٰحضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی قدس سرّہ العزیز نہ صرف تاریخ برِصغیر کی بلکہ تاریخ عالمِ اسلام کی اِن عدیم النظیر اور جامع کمالات شخصیّتوں میں سے ہیں، جنہوں نے رضائے الٰہی کے حصول کے لیے عشقِ رسول میں فنا ہو کر دین و ملّت کی سربلندی کی خاطر اپنی ساری متاعِ حیات صرف کر دی اور وقت کے بڑے سے بڑے طوفان میں بھی پرچمِ عظمتِ دین کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ اور وقت کے پُر آشوب ماحول کے باوجود دین و ملّت کے قدیم سے متوارث علمی امتیاز اور وقار کو آنچ نہ آنے دی اور ہر محاذ پر باطل کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور زوال میں آئی ہوئی ملّت اسلامیہ کو اُبھارنے اور پستی سے نکال کر بلند کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ احیائے علم کا مژدہ سنایا بلکہ خود بہ نفسِ نفیس وقفِ خدمت ہو کر ملّت اسلامیہ کی تعلیم و تربیت کا احیا کیا۔ اعلیٰحضرت کا زمانہ تاریخی اعتبار سے اس وقت شروع ہوا جب مسلمانانِ برِصغیر کی آخری سلطنت یعنی "سلطنتِ مغلیہ" زوال کی آخری منزل میں تھی اور بہادر شاہ ظفر اس کا آخری شہنشاہ تھا۔ مسلمانانِ برِصغیر کی پہلی جنگ آزادی جس کو انگریزی سامراج "۱۸۵۷ء کا غدر" کہہ کر پکارتا تھا، آپ کے بچپن میں لڑی گئی تھی۔ آپ مسلم ریاست رامپور کے قریب یوپی کے مشہور شہر بریلی میں پیدا ہوئے۔ جو آپ کے خانوادۂ بزرگان دین کی بدولت عہد شاہ جہانی

سے علوم و معارف اسلامیہ کا مرکز مشہور تھا۔ بزرگان دین کے اسی خانوادہ میں آپ (۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۸۵۶ء) پیدا ہوئے آپ کا یہ خاندان حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نامور تلامذہ کا گھرانہ تھا۔

اعلیٰ حضرت کے والد بزرگوار جو تاج العلماء کے لقب سے مشہور تھے۔ یعنی حضرت مولانا شاہ نقی علی خاں اور ان کے والد محترم حضرت مولانا شاہ رضا علی خاں جو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (سال وصال ۱۷۶۲ء) اور اُن کے فرزند اکبر حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (سال وصال ۱۸۲۳) کے ہم عصروں میں سے تھے۔ علوم و فنون اسلامیہ میں اپنے وقت کے علمائے ہند میں اکابر اساتذہ کا درجہ رکھتے تھے۔ اور دینی اور سائنسی علوم میں تبحر کمال کے ساتھ ساتھ علم روحانیت میں بھی ممتاز اور اکابر علماء مانے جاتے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی طریقت میں "سلسلہ نقشبندیہ" کے اور اعلیٰحضرت کے یہ اسلاف گرامی مع خود اعلیٰ حضرت کے "سلسلۂ عالیہ قادریہ" کے صاحب حال اور با کرامت اولیاء اللہ تھے۔ جس طرح بیشتر علوم کی تحصیل میں تربیت حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے خود اپنے فاضلِ زمانہ والد حضرت شاہ عبدالرحیم سے حاصل کی تھی۔ اسی طرح بیشتر علوم کی تحصیل میں تربیت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان بریلوی نے خود اپنے والد بزرگوار تاج العلماء حضرت مولانا شاہ نقی علی خان بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کی۔

حق تعالیٰ سبحانہٗ نے آپ کو دین و ملت کی بہت بڑی خدمت انجام دینے کے لیے پیدا کیا تھا۔ اس لیے وہ بڑی بڑی اور اعلیٰ صفات بھی آپ میں شروع ہی سے ودیعت فرما دی تھیں۔ جو اس مقدس خدمتِ جلیلہ کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ یعنی بے پناہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ، تورع تشرّع اتباعِ سنّت کا زبردست اہتمام، اولیاء اللہ سے والہانہ محبت و عقیدت درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ فطانت و ذکاوت، زبردست قوّتِ حافظہ، سچائی، راست بازی، حق گوئی و بے باکی، امانت و دیانت کسبِ کمال کی لگن اور ملتِ اسلامیہ کی سربلندی کی

دُھن، ایثار و خلوص، دینِ حق کے معاملہ میں کسی کی رُو رعایت نہ کرنا، دین کو پھیلانا اور پیغامِ حق سنانا وغیرہ آپ عہدِ طفولیت ہی سے بہ فیضِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام صفات کا مجسّم تھے۔ ذہن و ذکاوت اور فہم و فراست بھی آپ نے اس کمال درجہ کی پائی تھی کہ ایک بار کسی کتاب کو پڑھ لیتے، وہ ازبر ہوجاتی۔ دوسری بار پڑھنے کے بعد وہ آپ کی لوحِ ذہن پر ہمیشہ کے لیے ایسی مرتسم ہوجاتی کہ پھر کبھی نہ بھولتے اور ہر وقت اس کے حوالہ جات صفحہ وار دینے کے قابل ہوجاتے۔ ساڑھے تین سال کی عمر سے آپ نے قرآنِ کریم سے تعلیم کا آغاز کیا اور پھر نو سال کی عمر میں تفسیر، حدیث، علم الرجال، فقہ اور عربی ادب، منطق اور فلسفۂ اسلام کے اسرار و رموز پہ کافی دستگاہ حاصل کرلی۔ جب توسنِ عمر زندگی کی دسویں منزل میں پہنچا تو اپنے والد ماجد سے اجازت لے کر اپنے مکان ہی میں جو بہت بڑا تھا، ۱۸۶۶ء میں علومِ دینیہ کی اعلیٰ تعلیم کا باقاعدہ سابق مدرسہ دلّی کی طرح مدرسہ قائم کیا۔ جو ۱۸۵۷ء کے سانحۂ قومی کے بعد مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ دینی تعلیم کا سب سے پہلا عام مدرسہ تھا۔ اور یہ زمانہ تھا کہ جب ابھی سرسیّد کی درسگاہ علی گڑھ اور مدرسہ دیوبند وغیرہ قائم نہیں ہوئے تھے۔ مدرسہ دیوبند اعلیٰ حضرت کے اس مدرسہ کے تین سال بعد ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا۔ سرسیّد کا علی گڑھ کالج ۱۸۷۵ء میں معرضِ وجود میں آیا اور علاّمہ شبلی کا مدرسہ ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں قائم ہوا۔ اعلیٰ حضرت کا "دار العلوم بریلی" اس وقت تک کافی ترقی کرچکا تھا اور علماء کی ایک تعداد تیار ہوچکی تھی۔ آپ نے وقت کے اور دیگر اکابر علماء سے بھی مختلف علوم میں کسبِ علم کیا۔ علم نجوم کی مشہور اور مشکل ترین کتاب "چغمینی" کی تکمیل رام پور کے مشہور عالم مولانا بحر العلوم سے کی۔ اور علم ریاضی (میتھمیٹکس) علمِ فلکیات (ٹرگنامیٹری) میں بھی کمال حاصل کیا اور علم تکسیر، جو شیخ کبیر ابنِ عربی کا علم ہے، اس کی تکمیل اس وقت کے بڑے عالم اور صاحبِ کرامت ولی اللہ حضرت شاہ ابو الحسن نوری سے کی۔ اور اس مشکل ترین علم میں کسبِ کمال

کو اس درجہ تک پہنچایا کہ خود آپ کے بزرگ اُستاد حضرت شاہ ابوالحسن نُوری آپ کو ہندوستان کا شیخ کبیر کہا کرتے۔ وہ علم حدیث، تفسیر، فقہ، تصوّف، منطق اور عربی ادب وغیرہ میں آپ کے کمال علمی کے پہلے ہی قائل تھے۔ آپ کو اعلیٰ حضرت کا خطاب بھی انہی کا دیا ہوا ہے۔ وہ آپ کے بے پناہ جذبہ عشق رسول اور زہد و ریاضت، تقویٰ و پرہیزگاری اور مواعظ سے اس قدر متاثر تھے کہ اگرچہ وہ آپ کے استاد تھے اور بہت بڑے پیرِ طریقت بھی تھے مگر بپاس ادب وہ آپ کو "اعلیٰ حضرت" کے لقب سے ملقب فرماتے اور اپنے جیّد تلامذہ کرام سے بھی بتاکید کہتے کہ ان کی شان میں کبھی بے ادبی نہ کرنا ورنہ روحانی فیض سے محروم ہو جاؤ گے یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صاحب نسبت لوگوں میں سے ہیں۔ اور جب بھی انہیں مخاطب کرو، "اعلیٰ حضرت"، کہہ کر مخاطب کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق کی بدولت ان کو بڑی نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ صاحب نعمت ہیں۔ بے مثل زمانہ ہیں۔ یہ غوث پاک کے بھی خاصانِ خاص میں ہیں ملّتِ اسلامیہ کی خاص دینی خدمت ان کو تفویض کی گئی ہے۔ دارالعلوم کی تعمیر کرانے ہی کے سال یعنی ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ حضرت نے دوسرا حج ادا کیا۔ یہ سلطنت عثمانیہ ترکیہ کا آخری زمانہ تھا قسطنطنیہ (استنبول) کا شیخ الاسلام بھی اس سال حج کو آیا ہوا تھا۔ آپ کے فتووں اور ترکی کے بعض طلباء کے ذریعہ آپ سے غائبانہ طور پر کماحقہٗ واقف تھا۔ جب مسجد نبوی شریف میں جہاں مدینہ منورہ کے سب سے بڑے محدّث علامہ شیخ ضیاءالدین نے جو آپ کے شاگردانِ رشید میں سے تھے۔ اور انہیں آپ سے خرقۂ خلافت بھی حاصل تھا، مدینہ منورہ میں درس حدیث پر ترکوں کی طرف سے مامور تھے۔ بزبان عربی "معجزات نبویہ" پر آپ کا وعظ کرایا تو ترکی کا شیخ الاسلام بھی شریک جلسہ تھا۔ وہ عربی زبان میں آپ کی فصیح و بلیغ اور ایمان افروز تقریر سُن کر وجد میں آگیا۔ آپ نے حضور پاک کے فضائل و کمالات قرآن کریم اور حدیث کی روشنی میں

ایسے ایسے باریک عارفانہ نکات بیان کیے کہ اس نے بعد ختم جلسہ اپنی طرف سے آپ کو سند لکھ کر پیش کی اور آپ کو اہلِ سنّت کا امام تسلیم کیا، حجازِ مقدس کے عظیم علماء پہلے ہی یہ تسلیم کر چکے تھے۔ اور اپنی اسناد آپ کو مرحمت کر چکے تھے پھر آپ مدینہ منورّہ سے روضۂ غوثِ پاک پر حاضری دینے کے لیے بغداد شریف گئے۔ وہاں بھی آپ کے عالمانہ اور روحانی کمالات کی بڑی دھوم مچی ہوئی تھی۔ سفر کے دوران جب پہلا جمعہ پڑھا تو آپ نے "خانقاہِ عالیہ غوثیہ" میں بزبانِ عربی غوثِ اعظم کے فضائل پر صوفیانہ انداز میں وعظ فرمایا۔ ہزارہا سامعین میں عراق کے بڑے بڑے علماء شریک تھے۔ آپ کا ایمان افروز وعظ سُن کر بے شمار لوگ آپ سے سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت ہوئے۔

غرض آپ نے اس دوسرے حج سے لوٹ کر آنے کے بعد بھی اپنا مشن جاری رکھا۔ اب آپ وقت کے بڑے بڑے مایۂ ناز علمائے ربانی ملتِ اسلامیہ میں تیار کر چکے تھے۔ آپ نے اشاعتِ دین اور علوم دین کے اس مقدس مشن کو صرف درس و تدریس اور تصنیف و تالیف ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ مواعظِ حسنہ اور دشمنانِ دین کے ساتھ مناظرے اور مباہلے کرنے پر بھی بدرجہ اتم مصروف رکھا اور اس طرح گمراہ عقائد کو پھیلنے سے روکا۔ بہت سے قادیانیوں سے توبہ کرائی، بڑے بڑے پادریوں کو مناظروں میں شکست فاش دی، عیسائی مسلمانوں کے آریہ سماجیوں سے مباہلے اور مناظرے کر کے ان کے شُدھی کے زور کو توڑا۔ آپ نے "مناظرہ" کے فن کی بھی بہت بڑے پیمانہ پر تربیت دی اور وقت کے بے مثل مناظرہ کرنے والے علماء تیار کئے ان میں صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مولانا حشمت علی رحمہم اللہ ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ اعلیٰ حضرت نے اپنے ان شاگرد علماء کو بہت بڑے پیمانہ پر مناظرہ کی تربیت دی تھی۔

دینی علوم کے علاوہ آپ نے وقت کے بڑے بڑے اہلِ سائنس کو بھی

علوم سائنسیہ میں گائیڈ کیا اور ان کی رہبری فرمائی۔ مشہور ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی وائس چانسلر سر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد جو علم ریاضی کی سائنس میں دنیا بھر کے سب سے بڑے سائنس دان تھے اور یہ مسلمہ امر ہے محض تعلی نہیں، ساری دنیا آپ کو مانتی تھی۔ اعلیٰ حضرت کے وصال سے چند ماہ قبل کا یہ واقعہ ہے، سر ضیاء الدین احمد علم ریاضی کے ایک مسئلہ میں عرصہ سے اس کے حل کے لیے پریشان تھے حتیٰ کہ انہوں نے اس کے لیے سفر یورپ کا بھی عزم کر لیا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ وہ ہر اپنے معاملے میں مولانا سلیمان اشرف (دینیات کے اُستاد) سے ضرور مشورہ کرتے۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی انہوں نے عزم سفر یورپ کے سلسلہ میں مشورہ کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ میری رائے تو یہ ہے کہ یورپ جانے سے پہلے ایک چکر بریلی شریف کا لگا لیں۔ اعلیٰ حضرت سے بھی اس مسئلہ کے باب میں استصواب کریں ہو سکتا ہے کہ آپ کا مسئلہ وہ حل کر دیں اس لیے کہ علم ریاضی کے بھی وہ ایسے ہی باکمال ہیں، آپ تعارف کے لیے میرا خط لے جائیں اگر آپ کا مسئلہ یہیں حل ہو جائے تو پھر یورپ کے اتنے لمبے سفر کی کیا ضرورت ہے اور آپ اعلیٰ حضرت کی زیارت سے بھی مشرف ہو جائیں گے۔ اولیائے کاملین کی زیارت سے فائدہ ہی پہنچتا ہے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی اور وہ ان کا تعارفی خط لے کر بریلی چل دیئے۔ ادھر بریلی شریف میں کیا گزرا سننے کی بات ہے۔ اعلیٰ حضرت کا دستور تھا کہ فجر کی نماز کے بعد اوراد و وظائف سے فارغ ہو کر اپنے کتب خانہ میں آجاتے اور وہیں پھر کافی دیر تک قیام فرماتے۔ آپ نے آتے ہی اپنے خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبد الرحمٰن قادری بجے پوری سے جو میرے استاد محترم تھے اور جو ان دنوں اعلیٰ حضرت ہی کی خدمت میں رہتے تھے، فرمایا آج تو کوئی بڑا شخص مشاہیر وقت میں سے میرے پاس آنے والا ہے انہوں نے نام پوچھا تو آپ نے فرمایا وہ عنقریب آئے گا تو آپ خود ہی دیکھ لیں گے کہ وہ کون ہے؟

تھوڑی دیر میں ڈاکٹر سر ضیاء الدین آپہنچے اور انہوں نے مولانا سلیمان اشرف کا رقعہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ اس میں تفصیلات درج تھیں۔ رقعہ پڑھنے کے بعد اعلیٰ حضرت نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے کچھ انہوں نے بیان کیا اور پھر عرض کیا کہ میں اصل میں اس کو بھولے ہوئے ہوں۔ اعلیٰ حضرت نے کاغذ لیا کہ قلم سے اس پر اس مسئلہ کی شکل ریاضی بنائی اور پھر ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ دیکھئے! یہ تو مسئلہ نہیں ہے آپ کا؟ ہاں، وہ کہتے تھے، بالکل یہی ہے، اور ان کا مسئلہ حل ہو گیا، وہ پھر اعلیٰ حضرت کے اتنے عقیدت مند ہوئے کہ کہنے لگے آج مجھے یقین آیا ہے علم لدنی بھی فی الحقیقت بہت بڑا علم ہے۔

غرض اعلیٰ حضرت کی مقدس ہستی کے گوناگوں پہلو ہیں۔ یہاں صرف بخوفِ طوالت ایک پہلو پر مختصر سی روشنی ڈالی گئی ہے یعنی "آپ کی احیائے علمِ دین کی تحریک"، جس نے ایک مجددانہ شان کے ساتھ ۲۵ ر صفر ۱۳۴۰ھ مطابق ۱۹۲۱ء تک جو آپ کے وصال شریف کا دن ہے، اس جہانِ ناپائیدار میں خدمتِ دین اور خدمتِ اہلِ دین کا حق بدرجہ اتم ادا کر دیا۔ اور اُمتِ مسلمہ کو یہ درس دیا کہ ایک سچے مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں فنا ہو کر کمالات کے بامِ عروج پر پہنچ جائے اور ملتِ اسلام کو سربلند کر دے اور دنیا پر ثابت کر دے کہ مسلمان جس کو سب سے پہلا آسمانی حکم قرآنِ کریم کے ذریعہ "اقراء" (یعنی پڑھ) کا ملا ہے وہ ایسا پڑھے کہ پھر سارے زمانے کو پڑھا دے اور اپنی شخصیت کو کمالاتِ علمی کا سراپا بنا دے۔ سچے عاشقِ دین کی یہی شان ہے۔ مسلمان عظمت و کمال کے لیے پیدا ہوا ہے۔ دینِ اسلام عظمت و کمال کا سرچشمہ اور عزت و وقار کا گنجینہ ہے۔ جس کسی نے بھی صدقِ دل کے ساتھ دینِ حق کو اپنی روح میں سمو لیا۔ وہ ہمیشہ کے لیے لافانی ہو گیا۔

(بشکریہ "نوائے وقت" ملی ایڈیشن، ۱۰ ر جنوری ۱۹۸۰ء)

امام احمد رضا

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کی نعتیہ شاعری :

علم و فضل، سیاسی بیداری، سیرت و کردار

حکیم عمر خیام نیشاپوری فلاسفر تھے۔ منجم اور ریاضی دان مگر آج دنیا ان کو ان کی شاعری یعنی رباعیات عمر خیام سے ہی یاد کرتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح اعلیحضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی اگرچہ ہمہ صفت موصوف تھے مگر ان کی نعتیہ شاعری نے انہیں حیات جاودانی بخشی اور یہ ثمرہ ہے حبّ شہِ لولاک کا۔ موصوف کے زمانہ میں اکثریت اُن شعرائے کرام کی تھی جن کی شاعری کا محور عشق مجازی تھا۔

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کا اُردو شاعری اور بالخصوص مسلم شعرا پر احسان ہے کہ انہوں نے ایک نیا اسلوب بیان اختیار کیا۔ اور اپنی شاعری کا موضوع نعتِ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم منتخب کیا۔ دنیا بھر کے طول و عرض میں ان کی شاعری کی گونج ہے اور قریہ بہ قریہ کُو بہ کُو آپ کا سلام بحضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ اسلام کے سینوں پر مثبت ہے۔ بچے، بوڑھے اور جوان والہانہ انداز میں جھوم جھوم کر صبح و شام الاپ رہے ہیں ؎

مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام

انہوں نے اپنے اِسی فن کی بدولت عشق محمدی کا سکہ مسلمانوں کے دلوں پر بٹھا دیا ہے۔ یہ کارنامہ کیا کچھ کم ہے۔ میں تو اِس گذارش میں حق بجانب ہوں کہ

یہ ان کا کمال ہے کہ انہوں نے عالم اسلام کے دل سرکار دو جہاں کی طرف مبذول کر دئیے۔

قدر زر۔ زرگر بداند۔ قدر جوہر جوہری۔ آئیے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی نعت گوئی کے بارے میں عصرِ حاضرہ کے مشاہیر۔ صاحبِ علم وفن۔ علمائے کرام اور نامور شعرا کے تاثرات ملاحظہ فرمائیں۔ مشتے از خروارے۔

پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب ایم۔اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

(مؤلف عاشقِ رسول)

حضرت امام احمد رضا صاحب بریلوی نے عشقِ رسول کا ساز چھیڑا ہے۔ محبت کا نغمہ الاپا ہے اپنے مخصوص رنگ میں۔ منفرد انداز میں۔ نرالی اُمنگ سے۔ انہوں نے عشقِ رسول کے تذکرے سے عشقِ مصطفےٰ کی جوت جگائی ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ اس عشق کا چرچا کہاں کہاں ہوتا ہے۔

کوثر نیازی

بریلی میں ایک شخص پیدا ہوا جو نعت گوئی کا امام تھا اور احمد رضا خان بریلوی جس کا نام تھا۔ عشقِ رسول ان کی نعتوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام سوز و گداز کی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

علمائے دین میں نعت نگار کی حیثیت سے سب سے ممتاز نام مولانا احمد رضا خان بریلوی کا ہے وہ صرف نعت وسلام اور منقبت ہی کہتے تھے۔ اور بڑی درد مندی اور دل سوزی کے ساتھ کہتے تھے۔ سادہ و بے تکلف زبان اور برجستہ بیان ان کے کلام کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

نیاز فتح پوری

شعر و ادب میرا خاص موضوع ہے۔ میں نے مولانا بریلوی کا نعتیہ کلام بالاستیعاب پڑھا ہے۔ ان کے کلام کا پہلا تاثر جو پڑھنے والوں پر قائم ہوتا ہے، وہ مولانا کی بے پناہ وابستگیٔ رسولِ عربی کا ہے۔ ان کے کلام سے ان کے بے کراں علم کے اظہار کے ساتھ افکار کی بلندی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

پروفیسر افتخار اعظمی

احمد رضا خان صاحب بریلوی کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی۔ اس لیے آپ کا نعتیہ کلام شدتِ احساس کے ساتھ خلوصِ جذبات کا آئینہ دار ہے۔

ماہر القادری

مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ دینی علوم کے جامع تھے۔ دینی علم و فضل کے ساتھ شیوا بیان شاعر بھی تھے۔ ان کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ مجازی راہِ سخن سے ہٹ کر صرف نعتِ رسول کو اپنے افکار کا موضوع بنایا۔ مولانا کی دینی و ملی خدمات بھی اظہر من الشمس ہیں۔ مولانا دینی علوم کے جامع تھے۔ ایک عظیم عالم دین۔ مفسر۔ محدث اور فقیہہ تھے۔ مگر ان کی زندگی کا حاصل ان کی شاعری کا محور صرف حُبِ رسول تھا۔ یعنی نعت سرکارِ دو عالم۔

مولانا موصوف نے صرف ۱۴ سال کی عمر میں علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد دینی علوم کی سند حاصل کر لی۔ اور اپنی زندگی درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ اور ارشاد و توصیفِ سرکارِ کائنات کے بیان کے لیے وقف کر دی۔ وہ ایک جلیل القدر عالمِ دین تھے۔ آپ نے اپنے والد محترم نقی علی خان صاحب سے تحصیل علم کے بعد

حضرت مولانا ابو الحسین نوری مارہروی علامہ عبد العلی رامپوری اور مرزا غلام قادر بیگ وغیرہ سے استفادہ فرمایا۔

آپ کے والدِ ماجد نے افتاء کی ساری ذمہ داریاں آپ کو تفویض فرمادیں۔

۱۲۹۴ھ میں آپ اپنے والدِ بزرگوار کی ہمراہی میں حضرت شاہ آلِ رسول مارہروی سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہوئے۔

۱۲۹۶ھ میں پہلی بار زیارتِ حرمین شریفین کی سعادت حاصل کی اور واپسی پر عرض کیا۔

حاجیو! آؤ شہنشاہ کا روضہ دیکھو

کعبہ تو دیکھ چکے، کعبہ کا کعبہ دیکھو

شیخ حسین بن صالح نے صحاح ستہ کی سند اور سلسلہ قادریہ کی اجازت اپنے دستخطِ خاص سے عنایت فرمائی۔ ۱۳۲۳ھ میں آپ نے دوبارہ حج بیت اللہ شریف کا شرف حاصل کیا اس ساعتِ سعید کے موقع پر جو نظم رقم فرمائی اس کا مطلع تھا۔ ؎ شکرِ خدا کہ آج گھڑی اس سفر کی ہے

جس پر نثار جان فلاح وظفر کی ہے

سفرِ حجاز میں علمائے حجاز نے آپ کی بڑی قدر و منزلت فرمائی۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ علامہ سید اسماعیل المکی نے تو یہاں تک نوازا کہ وہ اگر اس کے حق میں یہ کہا جائے کہ "اس صدی کا مجدد ہے تو بلا شبہ حق و صحیح ہے"۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے جو آپ کے معاصرین میں تھے، آپ کو قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ ایک موقع پر علامہ مرحوم و مغفور نے فرمایا "ہندوستان کے دورِ آخر میں مولانا احمد رضا خان بریلوی جیسا طباع اور ذہین فقیہ پیدا نہیں ہوا۔"

آپ کی کثیر التصانیف ایک اندازے کے مطابق ۲۵۰ مختلف علوم و فنون پر ایک ہزار کے قریب ہیں۔ اپنی گراں مایہ تصانیف کے علاوہ آپ نے تقریباً ۸۰ کتابوں کے حواشی بھی رقم فرمائے۔ آپ کا ایک شاہکار فتاوٰی رضویہ ہے اور دوسرا علمی شاہکار

کلام پاک کا ترجمہ ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ کلام پاک کے ترجمہ کے بارے میں جناب ملک شیر محمد خان صاحب اعوان مؤلف محاسن کنز الایمان فرماتے ہیں۔ اعلیحضرت فاضل بریلوی کا ترجمہ کلام پاک علمی لغوی اور اعتقادی لحاظ سے باقی تراجم پر فوقیت رکھتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے ترجمہ میں کتنے ادبی اوصاف موجود ہیں اور انہوں نے اپنے کوثر و تسنیم سے دھلے ہوئے قلم سے کتنا پاکیزہ ترجمہ قرآن اُردو کے حوالہ کر کے اُردو کے احساس تہی مائیگی کو ختم کر دیا ہے۔

نعتیہ مجموعے آپ کے موجود ہیں اور زبان زد خاص و عام ہیں۔ اس ضمن میں ابو الطاہر فدا حسین فدا مدیر اعلیٰ مہر ماہ لاہور رقمطراز ہیں " امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا مفتی احمد رضا خان بریلوی قدس سرہٗ اس صدی کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ اور متنوع علوم و فنون پر مجتہدانہ کمال رکھتے تھے۔ ایک ہزار کے لگ بھگ چھوٹی بڑی تصانیف ان کی علمی یادگار ہیں۔ علمائے عرب و عجم نے آپ کو وقت کا مجدد تسلیم کیا۔ غرض کہ ایسے جامع کمالات تھے کہ گذشتہ تین صدیوں میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے اور یہی عشق ان کے فکرِ سلیم کا نگہبان و راہ نما تھا۔

مولانا دو قومی نظریہ کے اولین علمبرداروں میں سے تھے۔ جس موڑ پر حضرت علامہ سر اقبال اور حضرت قائدِ اعظم بعد میں آئے۔ حضرت فاضل بریلوی تحریک موالات کی مخالفت کر کے اِس سے قبل ہی دو قومی نظریہ کے زبردست حامی تھے۔ یہ ترکِ موالات کی تحریک مہاتما گاندھی جی کی تھی اور ۱۸۷۷ء میں گاندھی جی کے ایما پر ہی رو نما ہوئی۔ یہ حکومت سے عدم تعاون کی تحریک تھی جس کا مقصد صرف کانگریس کے مطالبات منوانا تھا۔ یعنی بندوق مسلمانوں کے شانہ پہ رکھ کر چلائی تھی۔ وہی گاندھی جی جن کی ہر بات نوکیلی، دو رُخی اور دو غلی ہوتی تھی۔ مثلاً دوران فسادات ہندو مسلم، بر بنائے تقسیم ہندو پاک مہاتما جی نے فرمایا " اپنے بھائی کو مت مارو"۔ بظاہر یہ الفاظ ہمدردانہ معلوم ہوتے ہیں مگر در پردہ گاندھی جی اپنے چیلوں اور پیروکاروں کو اشاروں کنایوں سے سمجھا

رہے ہیں کہ مسلمان بھی پہلے ہندو تھے جو کسی وجہ سے مسلمان ہو گئے یا مسلمان بنا دیئے گئے۔ یہ سب کے سب عرب سے تو نہیں آئے۔ اس لیے تم انہیں پھر سے شدھ کر لو، بجائے جان سے مارنے کے۔

ایک بار ریاست جموں کشمیر میں وارد ہوتے وقت یوں گوہر فشاں ہوئے "میں وہاں اس لیے نہیں جا رہا کہ مہاراجہ صاحب کو منع کر دوں کہ وہ پاکستان میں شمولیت نہ کرے۔ میں یونہی نجی قسم کے دورہ کے لیے جا رہا ہوں"۔ گویا آپ دریائے توی کے درشن کرنے جا رہے تھے۔ دراصل وہ صرف اس مقصد اور اس غرض و غایت سے جا رہے تھے اور اپنے مشن میں کامیاب رہے۔ یہ گاندھی جی کا کارنامہ ہے کہ جموں کشمیر کا سوال آج بھی سوالیہ نشان ہے۔

بالآخر پاکستان دو قومی نظریہ کے تحت ہی معرض وجود میں آیا۔ فاضل بریلوی نے اس تحریک ترک موالات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور بر وقت مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کا بیڑا اٹھایا۔ اس معرکہ میں حضرت مولانا احمد رضا خان سرِ فہرست تھے۔

حضرت مولانا سید نور محمد قادری صاحب مؤلف "اعلیٰ حضرت بریلوی کی سیاسی بصیرت" یوں گوہر فشاں ہیں۔

"اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا بریلوی نے عدم تعاون کے حامیوں اور گاندھی کے افعال و اقوال کی ایک ایک کر کے المحجۃ المؤتمنہ میں تردید فرمائی ہے۔ اور آفتاب کی طرح روشن کر دیا ہے کہ کوئی بھی غیر مسلم چاہے وہ ہندو ہو یا عیسائی، مجوسی ہو یا یہودی، اسلام اور مسلمین کے مقابلے میں الکفر ملت واحدۃ کا مصداق ہے"۔

تحریک موالات پر فاضل مؤلف پروفیسر جناب محمد مسعود احمد صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے فاضلانہ تحقیقی اور علمی مقالہ کمال خوبی اور نیک نیتی سے لکھ کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور ایک اہم کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ اس محب رسول نعت گوئے سرکارِ دو عالم، آفتاب شریعت و ماہتاب طریقت کی ولادت باسعادت ۱۰ شوال المکرم ۱۲۷۲ھ بمطابق ۱۴ جون ۱۸۵۶ء ہوا۔ بمقام بریلی (محلہ) میل کھنڈر پر

اور تاریخ وصال ۲۵ صفر المظفر ۱۳۴۰ھ بمطابق ۱۹۲۱ء بعد از نمازِ جمعہ ہے۔ آپ نے وصال سے قبل ہی الہامی طور پر اس آیتِ کریمہ سے مادہ تاریخ وفات نکالا تھا۔

" ویطاف علیھم بِاٰنِیَۃٍ من فِضَّۃٍ واکواب "

؎ خدا اُن کو کس پیار سے دیکھتا ہے
جو آنکھیں ہیں محوِ لقائے محمد

انجمؔ وزیر آبادی
(حاجی۔ نقشبندی۔ جماعتی)

شاہِ اتقیاء

قتیلِ حسنِ تصویرِ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تم ہو
شہیدِ عشقِ شاہِ دیں، شہِ احمد رضا تم ہو

بہارِ حسنِ فطرت، عشق کی رنگین فضا تم ہو
فدایانِ رسالت کے دلوں کا مدعا تم ہو

گہے عشقِ حقیقت آفریں کی ابتدا تم ہو
گہے سرمستیٔ الفت کی حضرت انتہا تم ہو

کہا ہے رحمۃ للعالمیں صلی اللہ علیہ وسلم خود جسکو یزداں نے
شہا! اُس "جانِ رحمت" پر دل و جاں سے فدا تم ہو

دکھائی راہِ توحید و رسالت اک زمانے کو
ہر اک گمراہ و گم گشتہ کے بیشک رہنما تم ہو

فقیہِ بے بدل اور مفتیٔ دینِ نبی اللہ!
سراپائے طریقت صاحبِ فقر و غنا تم ہو

شہابِ ثاقبِ چرخِ معارف کی تجلی اک
خدا شاہد کہ خضرِ راہِ دینِ مجتبےٰ تم ہو

نگاہِ ساقیٔ کوثر کے حسنِ کیف آور سے
شناسائے رسالت، رمز آگاہِ خدا تم ہو

نظر آتا ہر اک شے میں جسے تھا نورِ مصطفوی
وہ گرویدہ و شیدائے شہِ ارض و سما تم ہو

ہیں جسکے زہد و تقویٰ کے فلک والے بھی سب قائل
وہ فخرِ دین و ملت ہو وہ شاہِ اتقیاء تم ہو

علومِ دین و عرفانِ حسن رضی اللہ عنہ سینے میں ہے مخفی
ریاضِ قادریت کے گُلِ رنگیں قبا تم ہو

جہادِ حق و باطل میں ہوئی فتحِ مبیں حاصل — پئے اعدائے ملّت بُرّشِ تیغِ خدا تم ہو

تمہارا مرقدِ ذی شاں تجلّی زارِ ایمن ہے — رہِ ظلمات میں اک مشعلِ نورِ ہُدیٰ لے تم ہو

کہیں جامیؔ و قدسیؔ بھی فداؔ سے مرحبا جس پر
وہ حسّانِ زمانہ رضی اللہ عنہ، شاعرِ خیرالوریٰ صلی اللہ علیہ وسلم تم ہو

ابوالطاہر فداؔ حسین فداؔ

قطعۂ تاریخ طباعت

نتیجۂ فکر ابوالطاہر فدا حسین فدا مدیر اعلیٰ مہر و ماہ ۔ لاہور

حضرت مرید احمد ذی علم کی یہ کاوش
اک مردِ باخدا کا نقشِ رہِ وفا ہے

وصفِ کمال اس کا ہو کیا بیاں کسی سے
واللہ یہ مُرقع جامِ جہاں نما ہے

تھی احتیاج اِس کی اس دورِ پُرفتن میں
ہر لفظ اسکا بیشک شمعِ رہِ ہُدیٰ ہے

ہے یہ خراجِ تحسیں اُس کے حضور ہمدم
جو بندۂ خدا بھی اور عبدِ مصطفیٰ ہے

قُدسی پُکار اُٹھے برجستہ یوں فدا سے
سالِ طباعت اس کا کہہ "گلشنِ رضا" ہے

۱۴۰۱ھ

عہدیداران

مرکزی مجلسِ رضا

سرپرست : سید محمد حسن شاہ صاحب گیلانی مدظلہ

صدر : حکیم محمد موسیٰ امرتسری

نائب صدر : میاں محمد زبیر احمد قادری ضیائی

جنرل سیکرٹری : میاں رحمت علی نقشبندی مجددی

سیکرٹری : ظہور الدین خان

ناظمِ دفتر : قاضی صلاح الدین قادری ضیائی

خازن : الحاج محمد مقبول احمد قادری ضیائی

رضا یو

مرکزی مجلس رضا لاہور، اعلیحضـ

شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی قد

کے تعارف کیلئے کتب و رسائل شائع کر

(عرس مبارک) کے موقع پر جلسہ یوم رضا کا انع

علماء، فضلا اور دانشور حضرات چودھویں صد

تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں

بالمقابل ریلوے اسٹیشن لاہور منعقد ہو

ازیں علاوہ مرکزی مجلس رضا لاہور

ہاتے یوم رضا منعقد کرنے کی ہر سال اپیل

اکثر مقامات پر یوم رضا منایا جانے لگا

ہیں لہذا علماء کرام اور اہل سنت کی انجمنو

پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا کریں

الداعی حکیم محمد موسیٰ امرتسری

سامرِ

رت امام اہل سنت مجدد ملت

س سرہ کی علمی دینی اور ملی خدمات جلیلہ

نے کے ساتھ ساتھ ہر سال آپ کے یوم وصال

قاد کرتی ہے جس میں ملک کے نامور

ری کے مجدد کی عظیم علمی خدمات اور بے مثال

ں۔ یہ روح پرور تقریب جامع مسجد نوری

ق ہے۔

کی طرف سے ملک کے گوشے گوشے میں جلسہ

ی کی جاتی ہے اس تحریک سے ملک کے

ہے مگر ہم اس میں مزید وسعت کے خواہاں

ں سے اپیل ہے کہ وہ یوم رضا کو وسیع

ا صلائے عام مرکزی مجلس رضا لاہور

فاضل بریلوی اور دیگر اکابرِ اہلِ سُنّت
گراں قدر خدمات سرانجام دے رہی
آپ بھی مجلس کے
کے ممبر بنیں ۔
مجلس کے

مرکزی مجلس رضا لاہور، اعلیٰحضرت امام اہل سنت مجدد ملت شاہ احمد رضا خاں قادری بریلوی قدس سرہ کی علمی دینی اور ملی خدمات جلیلہ کے تعارف کیلئے کتب و رسائل شائع کرنے کے ساتھ ساتھ ہر سال آپ کے یوم وصال (عرس مبارک) کے موقع پر جلسہ یوم رضا کا انعقاد کرتی ہے جس میں ملک کے نامور علماء، فضلا اور دانشور حضرات چودھویں صدی کے مجدد کی عظیم علمی خدمات اور بے مثال تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ روح پرور تقریب جامع مسجد نوری بالمقابل ریلوے اسٹیشن لاہور منعقد ہوتی ہے۔

ازیں علاوہ مرکزی مجلس رضا لاہور کی طرف سے ملک کے گوشے گوشے میں جلسہ ہائے یوم رضا منعقد کرنے کی ہر سال اپیل کی جاتی ہے اس تحریک سے ملک کے اکثر مقامات پر یوم رضا منایا جانے لگا ہے مگر ہم اس میں مزید وسعت کے خواہاں ہیں لہٰذا علماء کرام اور اہل سنت کی انجمنوں سے اپیل ہے کہ وہ یوم رضا کو وسیع پیمانے پر منانے کا اہتمام کیا کریں۔

الداعی حکیم محمد موسیٰ امرتسری صدر مرکزی مجلس رضا لاہور

دعوت
مرکزی مجلس رضا لاہور (رجسٹرڈ) مجددِ ملت امام اہلِ سُنّت اعلیٰ حضرت
فاضل بریلوی اور دیگر اکابر اہلِ سُنّت کے مشن کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں جو
گراں قدر خدمات سرانجام دے رہی ہے آپ اُس سے بخوبی متعارف ہیں۔
آپ بھی مجلس کے وسیع تر پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے مجلس
کے ممبر بنیں۔
فارم رُکنیّت
مجلس کے دفتر سے طلب فرمائیں۔